BROWN
BOOK ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222973
UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—901—26-3-70—5,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٨٢٣٩١ Accession No. ١٦١٣٠ U16130.

Author [illegible]

Title [illegible]

This book should be returned on or before the date last marked below.

آخری سلام

کرسٹفر اشروڈ

مترجمہ

محمد حسن عسکری

مکتبہ جدید ۔ لاہور

جملہ دائمی حقوق بحق مکتبہ جدید محفوظ

۱۶۱۳۰

قیمت چار روپے آٹھ آنے

بار اوّل   اپریل ۴۸ء

اتحاد پریس لاہور میں باہتمام رشید احمد چودھری چھپکر مکتبہ جدید لاہور سے
شائع ہوئی

برلن کا روزنامچہ

موسمِ خزاں ۱۹۳۰ء

میری کھڑکی سے سڑک نظر آتی ہے ـــــ گہری، چوڑی چکلی، گمبھیر مکانوں کے آگے بھاری بھاری چھجّے ہیں، سامنے کا پلستر میلا ہو چکا ہے، اُوپر کی طرف بیل بوٹے اور خاندانوں کے امتیازی نشانات بنے ہوئے ہیں۔ چھجّوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں میں دکانیں ہیں جہاں دن بھر چراغ جلتے ہیں۔ سارا محلّہ اسی قسم کا ہے: گلی در گلی مکان چلے گئے ہیں، اور مکان بھی کچھ ایسی وضع کے ہیں جیسے بھونڈی بھونڈی زبردست تجوریاں جن میں دیوالیہ متوسط طبقے کی میلی کچیلی قیمتی چیزیں اور پرانے سامان کی دکانوں سے خریدا ہوا فرنیچر ٹھسا ٹھس بھرا ہوا ہے۔

میں ایک کیمرا ہوں جس کا منہ کھلا ہوا ہے۔ میں بالکل مفعولی حالت میں ہوں، چیزوں کا عکس اتار رہا ہوں، سوچ نہیں رہا ہوں۔ سامنے والی کھڑکی میں ایک آدمی حجامت بنا رہا

ہے، ایک عورت جاپانی کمونو پہنے ہوئے بال دھو رہی ہے ۔ میں ان دونوں کا عکس اُتار رہا ہوں۔ کسی دن ان سب تصویروں کو دھو کر احتیاط سے کاغذ پر چھاپا جائے گا۔

رات کو آٹھ بجے مکانوں کے دروازوں میں تالے پڑ جائیں گے ۔ بچے کھانا کھا رہے ہیں دکانیں بند ہو چکی ہیں۔ نکڑ والے چھوٹے سے ہوٹل میں رات والی گھنٹی کے اوپر بجلی کا نشان روشن ہو گیا ہے، وہاں گھنٹے کے حساب سے کمرہ کرائے پر لیا جا سکتا ہے ۔ اور جلدی ہی سڑک پر سیٹیاں بجنے لگیں گی ۔ نوجوان اپنی محبوباؤں کو بُلا رہے ہیں ۔ نیچے سڑک پر سردی میں کھڑے ہو کر وہ گرم گرم کمروں کی روشن کھڑکیوں کی طرف سیٹی بجاتے ہیں جہاں رات کو سونے کے لیے بستر بچھ چکے ہیں ۔ یہ لوگ اندر پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کی سیٹیاں گہری اور کھوکھلی سی سڑک پر یہاں سے وہاں تک گونج جاتی ہیں، اور بڑی شہوت ناک، پراسرار اور افسردہ معلوم ہوتی ہیں ۔ ان سیٹیوں کی وجہ سے شام کو میرا یہاں ٹھیرنے کو جی نہیں چاہتا، اکیلا ہوں، گھر سے دُور ہوں ۔ بعض اوقات میں دل میں ٹھان لیتا ہوں کہ ان سیٹیوں کی آواز نہیں سنوں گا، کوئی کتاب اٹھا لیتا ہوں پڑھنے کی کوشش کرنے لگتا ہوں ۔ لیکن ذرا سی دیر میں کوئی نہ کوئی آواز ضرور سنائی دے جاتی ہے جو دل کے پار اُترتی چلی جاتی ہے، جس میں ایسی تاکید، ایسی حسرتناک افسانیت ہوتی ہے کہ آخر مجھے اُٹھنا پڑتا ہے، اور میں کھڑکی کی درزوں میں سے جھانک کے دیکھتا ہوں کہ یہ آواز کہیں مجھے تو نہیں پکار رہی ـــــ حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ بات ممکن نہیں۔

جب چولھا روشن ہوتا ہے اور کھڑکی بند ہوتی ہے تو اس کمرے میں بڑی غیر معمولی

گویا ان کی ماں بن گئی تھی، وہ بڑے بے فکرے تھے، جب کبھی انہیں کوئی پریشانی ہوتی تو سیدھے میرے پاس آتے اور کہتے "مسٹر ویڈرشن، دیکھئے میرے اوپر بگڑیئے گا نہیں ..... کل رات ہم تاش کھیل رہے تھے، میں مہینے بھر کا سارا خرچا ہار گیا، والدہ سے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی ....." پھر وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے، میں خوب سمجھتی تھی کہ اس شریر لڑکے کا مطلب کیا ہے، لیکن مجھ سے اتنی سنگدلی نہیں برتی جاتی تھی کہ انکار کر دوں، چنانچہ میں بیٹھ کے اُن کی والدہ کو ایک خط لکھتی اور التجا کرتی کہ بس ایک دفعہ اور معاف کر دیجئے، اور انہیں تھوڑا سا روپیہ اور بھیج دیجئے، وہ ہمیشہ بھیج دیتی تھیں ..... بات یہ ہے کہ آخر کو تو میں عورت ہوں، حالانکہ میرے کبھی بچے نہیں ہوئے لیکن میں جانتی ہوں کہ ماں کے جذبات سے کیسے اپیل کی جائے .....

آپ مسکرا کس بات پر رہے ہیں، ہر آسی وڈوا خیر، خیر! غلطیاں تو ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں!"

"اور یہ وہ جگہ ہے جہاں ہر ریٹ ماسٹر ہمیشہ دیوار کے کاغذ پر اپنی کافی اُلٹ دیا کرتے تھے۔ وہ اپنی منگیتر کے ساتھ وہاں صوفے پر بیٹھا کرتے تھے، میں اُن سے کہا کرتی تھی "ہر ریٹ ماسٹر، ذرا مہربانی فرما کے اپنی کافی میز پر بیٹھ کے پیجیئے، معاف کیجیے گا دوسری بات کے لئے تو بعد میں بھی بہت وقت ہے ....."، لیکن نہیں، وہ ہمیشہ وہیں صوفے پر بیٹھتے تھے، اور پھر یہ لازمی تھا کہ جہاں اُن کے جذبات میں ذرا گرمی آئی اور کافی کی پیالیاں اُلٹیں ..... بڑے خوبصورت آدمی تھے، اُن کی والدہ صاحبہ اور ہمشیرہ کبھی کبھی ہم سے ملنے آیا کرتی تھیں، انہیں برلن آنے کا بڑا شوق تھا، وہ مجھ سے کہا کرتی تھیں "فراڈ لین شرڈر، آپ کو پتہ نہیں کہ آپ کتنی خوش قسمت ہیں کہ یہاں رہتی ہیں اور سب چیزیں آپ کی نظروں کے سامنے سے گزرتی ہیں، ہم تو دیہاتی لوگ ہیں، ہمیں آپ کے اوپر رشک آتا

ہے! ذرا سنائیے آج کل دربار کی کیا خبریں ہیں!" اصل میں یہ تو اُن کا مذاق تھا، ہالبرنٹ کے قریب ہارنس کے علاقے میں اُن کا بڑا خوبصورت اور چھوٹا سا مکان تھا، وہ مجھے اُس کی تصویریں دکھایا کرتی تھیں، بالکل خوابوں کا سا محل تھا!"

"وہ قالین پہ آپ نے روشنائی کے دھبے دیکھے نا؟ اس جگہ ہر پروفیسر کورخ اپنا اپنا فاؤنٹین پین جھٹکا کرتے تھے، میں نے اُن سے سینکڑوں دفعہ کہا لیکن آخر تھک کے فرش پہ اُن کی کرسی کے چاروں طرف بلاٹنگ پیپر کے تختے بچھانے پڑے، وہ کچھ عجیب کھوئے کھوئے سے رہتے تھے...... بڑے نفیس آدمی تھے! اور بڑے سیدھے سادے، مجھے تو بہت پسند تھے۔ اگر میں ان کی قمیص درست کر دیتی یا جرابوں میں رفو کر دیتی تو وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر میرا شکریہ ادا کرتے، انہیں کچھ ہنسی مذاق لینے بھی تھا، بعض دفعہ جب وہ مجھے آتے ہوئے سُن لیتے تو بتی بجھا دیتے اور دروازے کے پیچھے چھپ جاتے، اور پھر مجھے ڈرانے کے لئے شیر کی طرح دھاڑتے، بالکل بچوں کی طرح......"

فراؤ لین شرنڈر گھنٹوں اسی طرح باتیں کر سکتی ہیں اور کبھی ایک بات کو نہیں دُہرائیں، ان کی باتیں تھوڑی دیر تک سننے کے بعد مجھ پہ ایک عجیب اضمحلال اور غنودگی سی طاری ہو جاتی ہے، میں بے انتہا غمگین ہو جاتا ہوں، اب وہ سارے کہاں گئے، وہ کہاں ہیں؟ دس سال میں خود میں کہاں ہوں گا؟ یقیناً یہاں نہیں ہوں گا، اس دور دراز دن تک پہنچنے کے لئے مجھے کتنے سمندروں اور سرحدوں کو پار کرنا ہوگا، کتنے فاصلے پیدل، گھوڑے کی پیٹھ پہ، کار، سائیکل، ہوائی جہاز، اسٹیمر، ریل گاڑی، لفٹ، حرکت کرنے والے زینے اور ٹریم کے ذریعے طے کرنے ہوں گے؟ اس زبردست سفر کے لئے

مجھے کتنا روپیہ درکار ہوگا؟ راستے میں بتدریج اور عاجز ہو کر کتنا کھانا کھاؤں گا؟ کتنے جوتے پہن کے پھاڑوں گا؟ کتنے ہزار سگریٹیں پیوں گا؟ چائے کی کتنی پیالیاں اور شراب کے کتنے گلاس خالی کروں گا؟ کیسا خوفناک اور بے مزا مستقبل ہے! اور پھر —— مرنا ..... یکایک میری انتڑیوں میں خوف کی وجہ سے ایک مبہم سا کرب پیدا ہو جاتا ہے اور میں معافی مانگ کر بیت الخلا جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔

جب انہیں معلوم ہوا کہ میں ایک زمانے میں طب کا طالب علم رہ چکا ہوں تو انہوں نے مجھے محرمِ راز بنا لیا اور بتایا کہ اپنے سینے کی جسامت سے وہ بہت پریشان ہیں انہیں اختلاجِ قلب کی شکایت ہے، اور یقین ہے کہ دل پر جو زور پڑتا ہے اُس کی وجہ سے یہ بات پیدا ہوئی ہے، وہ سوچتی ہیں کہ آپریشن کرائیں یا نہ کرائیں، اُن کے بعض ملاقاتی تو آپریشن کرانے کا مشورہ دیتے ہیں، اور بعض لوگ اس کے خلاف ہیں:

"اُفوہ، بڑا بوجھ ہے، اسے ساتھ ساتھ لئے پھرنے میں بڑا زور پڑتا ہے! ذرا سوچیے تو —— ہر اسی وقت، پہلے میں ایسی ہی دُبلی پتلی تھی جیسے آپ ہیں!"

"فراؤلین شریڈر، میرا خیال ہے کہ آپ پر بہت سے لوگ جان دیتے ہونگے؟"

ہاں، جان دینے والے تو درجنوں تھے، لیکن دوست صرف ایک تھا وہ شادی شدہ آدمی تھا لیکن اپنی بیوی سے الگ رہتا تھا کیونکہ وہ اُسے طلاق نہیں دیتی تھی۔

"ہم گیارہ برس ساتھ رہے۔ پھر نمونیا سے اُس کی موت ہوگئی، کبھی کبھی جب سردی ہوتی ہے تو رات کو میری آنکھ کھل جاتی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ وہ میرے پاس ہوتا، اکیلے سونے سے آدمی اچھی طرح گرم نہیں ہوتا۔"

اس مکان میں چار کرائے دار اور ہیں۔ میرے بالکل برابر آگے والے بڑے کمرے میں فراؤلین کوسٹ رہتی ہے۔ مقابل والے کمرے میں جہاں سے صحن نظر آتا ہے فراؤ لین میم ہے۔ بیٹھنے والے کمرے کے اُدھر پیچھے کی طرف بوبی رہتا ہے۔ بوبی کے کمرے کے پیچھے غسل خانے کی چھت پر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جس میں سیڑھی کے ذریعے پہنچتے ہیں اور جسے فراؤلین شریڈر کسی پُراسرار وجہ سے "سویڈن والا اشہ نشین" کہتی ہیں۔ یہ کوٹھڑی انہوں نے بیس مارک ماہانہ پر ایک تجارتی ایجنٹ کو دے رکھی ہے جو سارا دن باہر رہتا ہے اور رات کو بھی بہت دیر میں آتا ہے۔ کبھی کبھی اتوار کی صبح کو وہ مجھے باورچی خانے میں پتلون اور واسکٹ پہنے اِدھر سے اُدھر پہلو بدلتے ہوئے اور زنانہ انداز سے دیاسلائی کی ڈبیا ڈھونڈتے ہوئے مل جاتا ہے۔

بوبی شہر کے مغربی حصّے میں ایک شراب خانے ٹروئیکا میں ملازم ہے اور شرابیں ملانے کا کام کرتا ہے۔ مجھے اُس کا اصلی نام معلوم نہیں، اُس نے یہ نام اس وجہ سے اختیار کر لیا ہے کہ آج کل برلن کے مشتبہ حلقوں میں انگریزی ناموں کا بڑا فیشن ہے۔ وہ ہے تو نوجوان، مگر بالکل زرد ہے اور کچھ پریشان سا معلوم ہوتا ہے، وہ کپڑے بہت ٹھاٹ دار پہنتا ہے اور اُس کے بال سیاہ، باریک اور چمکدار ہیں، کوئی تیسرے پہر کے قریب سو کے اٹھتا ہے اور سر پہ بالوں کی جالی لگائے قمیص پہنے سارے مکان میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا پھرتا ہے۔

فراؤلین شریڈر اور بوبی کے درمیان بڑی بے تکلفی ہے۔ وہ انہیں گدگداتا ہے اُن کے چوتڑوں کو تھپتھپاتا ہے، اور وہ اُس کے سر پہ فرائنگ پین یا جھاڑو مارتی ہیں۔ جب میں نے پہلی مرتبہ انہیں اس طرح ہاتھا پائی کرتے دیکھا تو وہ کچھ گڑبڑا سے گئے۔

لیکن اب وہ میری موجودگی کا زیادہ خیال نہیں کرتے۔

فراؤلین کوسٹ گورے رنگ کی شگفتہ صورت لڑکی ہے، اُس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں احمقانہ سی ہیں۔ ہماری ملاقات ڈریسنگ گاؤن پہنے غسل خانے آتے جاتے ہوئے راستے میں ہوتی ہے، اس وقت وہ بڑی حیا کے ساتھ مجھ سے آنکھیں چرانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ ہے تو ذرا موٹی، مگر جسم اچھا ہے۔

ایک دن میں نے فراؤلین شرائیڈر سے بڑی صفائی سے پوچھ لیا: "فراؤلین کوسٹ کا پیشہ کیا ہے؟"

"پیشہ؟ ہا، ہا، ہا، بہت خوب! یہ لفظ بالکل پھبتا ہے! ہاں اس کا پیشہ بڑا نفیس ہے۔ دیکھئے، یوں ——"

انہوں نے کچھ ایسا انداز بنا لیا جیسے کوئی بڑی مذاقیہ حرکت کر رہی ہوں، جھاڑن کو اُنگلی اور انگوٹھے میں بڑے ناز سے پکڑ لیا، اور باورچی خانے میں بطخ کی طرح مٹک مٹک کے چلنے لگیں۔ دروازے کے قریب پہنچ کے وہ یکایک فاتحانہ انداز سے پیچھے مڑیں، اور ایسے جھاڑن ہلانے لگیں جیسے ریشمی رومال ہو، اور میری طرف اشارہ کر کے تمسخرانہ اپنے ہاتھ کو چوما:

"ہاں، ہاں، ہر ایسی ڈوو! یہ لوگ اسی طرح کرتی ہیں!"

"میں ٹھیک طرح سمجھا نہیں، فراؤلین شرائیڈر۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ وہ سرکس میں رسّی پہ چلنے کا تماشا دکھاتی ہیں؟"

"ہی، ہی، ہی! بہت خوب! اپنی روزی کمانے کے لئے وہ پٹری چلتی ہے۔ بالکل یہی تعریف ہے اُس کی!"

اس گفتگو کے دو چار دن بعد ہی فراؤلین کوسٹ ایک جاپانی کے ساتھ آتی ہوئی مجھے زینے پہ مل گئی۔ بعد میں فراؤلین شریڈر نے مجھے بتایا کہ یہ جاپانی فراؤلین کوسٹ کے بہترین گاہکوں میں سے ہے۔ انہوں نے فراؤلین کوسٹ سے پوچھا تھا کہ جب تم لوگ بستر پہ نہیں ہوتے تو ایک ساتھ کس طرح وقت گزارتے ہو، جاپانی جرمن زبان تو بول نہیں سکتا۔

"اوہو،" فراؤلین کوسٹ نے جواب دیا، "یوں ہوتا ہے کہ ہم گراموفون بجانے لگتے ہیں، چاکلیٹ کھاتے ہیں، اور پھر خوب ہنستے ہیں۔ اُسے ہنسی خوب آتی ہے۔۔۔۔"

فراؤلین شریڈر واقعی فراؤلین کوسٹ کو پسند کرتی ہیں، اور اُس کے پیشے پر انہیں کوئی اخلاقی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن جب فراؤلین کوسٹ سے چائے دانی کی ٹونٹی ٹوٹ جاتی ہے، یا جتنی دفعہ ٹیلیفون استعمال کیا ہے بیٹھنے کے کمرے میں رکھی ہوئی سلیٹ پہ اُس کا نشان بنانا بھول جاتی ہے تو انہیں غصہ آجاتا ہے، اور وہ ہر دفعہ چیخ کے کہتی ہیں: "آخر اس قسم کی عورت سے اور کیا امید ہو سکتی ہے، رنڈی ہی جو ٹھیری! ہر اسی وہ آپ کو معلوم ہے پہلے یہ کیا تھی؟ نوکرانی! پھر اُس کی اپنے مالک سے آشنائی ہو گئی، اور آخر ایک دن معلوم ہوا کہ معاملہ خراب ہے۔۔۔۔ اور جب پریشانی دور ہو گئی تو اُسے ملازمت چھوڑنی پڑی۔۔۔۔"

فراؤلین میئر موسیقی گھر میں گاتی ہے۔ فراؤلین شریڈر بڑے احترام کے ساتھ مجھے یقین دلاتی ہیں کہ وہ جرمنی بھر کی بہترین گانے والیوں میں سے ہے، فراؤلین شریڈر فراؤلین میئر کو زیادہ پسند نہیں کرتیں، مگر اُن پر اس کا رعب بہت ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ فراؤلین میئر کا جبڑا بلڈاگ کا سا ہے، بازو بہت موٹے موٹے

ہیں اور بال بہت بھدّے اور رسّی کے سے رنگ کے ہیں۔ وہ بیوپریا کی بولی بولتی ہے اور اس کی آواز میں ایک مخصوص جارحانہ زور ہوتا ہے۔ جب وہ گھر ہوتی ہے تو نشسنگا کی میز کے سامنے جنگلی گھوڑے کی طرح تن کے بیٹھتی ہے، اور فراؤلین شرٹیڈر کے ساتھ مل کے تاش کے پتّے پھیلاتی جاتی ہے۔ یہ دونوں پتّوں سے قسمت کا حال دیکھنے میں بہت ماہر ہیں، اور صبح کو جب تک شگون نہ دیکھ لیں کوئی کام نہیں شروع کرتیں۔ آج کل جو خاص چیز یہ دونوں کی دونوں معلوم کرنا چاہتی ہیں یہ ہے کہ فراؤلین میئر کو نئی ملازمت کب ملے گی۔ اس سوال سے فراؤلین شرٹیڈر کو بھی اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی فراؤلین میئر کو، کیونکہ فراؤلین میئر کے اوپر کرایہ چڑھتا جا رہا ہے۔

جب موسم اچھا ہوتا ہے تو نولس ٹراس کے نکّڑ پہ کرمچ کے چھوٹے سے خیمے کے قریب ایک میلا کچیلا سا بھینگا آدمی کھڑا ہوا کرتا ہے۔ خیمے کے دونوں طرف علمِ نجوم کے نقشے اور مطمئن گاہکوں کے دستخطی سفارشی خطوط لگے رہتے ہیں۔ جب کبھی فراؤلین شرٹیڈر کے پاس اُس کی فیس کے پیسے ہوتے ہیں تو وہ اُس سے مشورہ لینے جایا کرتی ہیں۔ ان کی زندگی میں یہ آدمی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس شخص سے ان کا برتاؤ بھی عجیب وغریب ہوتا ہے، اُن کے رویّے میں دونوں باتیں شامل ہوتی ہیں، خوشامد بھی اور دھمکیاں بھی۔ وہ اُس سے کہتی ہیں کہ تم نے جو مجھے اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں اگر وہ پوری ہوئیں تو میں تمہیں بوسہ دوں گی، تمہاری دعوت کروں گی، تمہیں سونے کی زنجیر دوں گی، لیکن اگر پوری نہ ہوئیں تو گلا گھونٹ ڈالوں گی، دونوں کان اکھاڑ لوں گی، پولیس میں رپٹ لکھوا دوں گی۔ دوسری پیشین گوئیوں کے ساتھ ساتھ نجومی نے انہیں یہ بھی بتایا ہے کہ تمہیں لاٹری میں روپیہ ملے گا۔ ابھی تک اُن کی قسمت نہیں جاگی۔ لیکن وہ ہمیشہ یہی بحث کرتی رہتی ہیں کہ اپنے

جیتے ہوئے روپیہ کو کس طرح استعمال کریں گی۔ ہم سب کو تحفے ملیں گے۔ مجھے ایک ہیٹ ملے گا، کیونکہ فراؤلین شریڈر کا خیال ہے کہ مجھ جیسے تعلیم یافتہ آدمی کے لئے ننگے سر پھرنا ٹھیک نہیں ہے۔

فراؤلین مینر جب پتے بچھانے میں مصروف نہیں ہوتی تو چائے پیتی رہتی ہے اور فراؤلین شریڈر کو تھیٹروں میں اپنی گذشتہ فتوحات کی داستانیں سنایا کرتی ہے:

"اور منیجر مجھ سے کہنے لگا کہ 'فرٹزی، ضرور خدا نے تمہیں یہاں بھیجا ہے! ہمارے یہاں جو ایکٹرس ہیروئن بنتی ہے وہ بیمار ہو گئی ہے۔ تمہیں آج ہی رات کو رن ہیگن جانا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ انکار سننے کو بھی تیار نہیں تھا۔ کہنے لگا، 'فرٹزی (وہ مجھے ہمیشہ فرٹزی کہتا تھا)، دیکھو اپنے پرانے دوست سے بے وفائی مت کرنا!' چنانچہ میں چلی گئی......" فراؤلین مینر چائے پیتے ہوئے پرانی یادیں تازہ کرتی جاتی ہے۔ "بڑا نفیس آدمی تھا۔ اور بڑا مہذب۔" وہ مسکراتی ہے: "بے تکلف تو تھا.... مگر اس میں تمیز سے بات کرنے کا سلیقہ بھی تھا۔"

فراؤلین شریڈر بڑی بے تابی سے سر ہلاتی جاتی ہیں، ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنتی ہیں اور لطف اندوز ہوتی ہیں:

"میرا خیال ہے کہ بعض منیجر تو بڑے شریر اور شیطان ہوتے ہونگے؟ (فراؤلین مینر، تھوڑا سا اور گوشت لیجئے؟)"

"(شکریہ، فراؤلین شریڈر، بس ذرا سا ٹکڑا دے دیجئے۔) ہاں، بعض منیجر ہوتے ہیں ...... آپ کو یقین نہیں آئے گا! لیکن میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ان باتوں سے بچائے رکھا۔ جب میں ذرا سی لڑکی تھی جب بھی..

فراؤلین ہیبر کے پُر گوشت برہنہ بازوؤں کے پٹھوں میں بڑی غیر دلکش تھرتھراہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ٹھوڑی آگے کو نکال دیتی ہے: "میں بویریا کی ہوں۔ بویریا والوں کو کسی آدمی سے نقصان پہنچ جائے تو وہ اس بات کو کبھی نہیں بھولتے۔"

کل شام جو میں بیٹھنے کے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ فراؤلین شریڈر اور فراؤلین ہیبر دونوں پیٹ کے بل لیٹی ہیں اور اپنے کان فرش سے لگا رکھے ہیں۔ بیچ بیچ میں وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے خوشی سے مسکراتی جا رہی تھیں اور مسرت کے مارے ایک دوسرے کے چٹکیاں کاٹ رہی تھیں، اور ساتھ ساتھ شش! شش! کرتی جاتی تھیں۔

"دیکھو!" فراؤلین شریڈر نے آہستہ سے کہا۔ "سارا فرنیچر توڑے ڈال رہا ہے!"

"اُسے مارنے مارتے لال پیلا کئے دے رہا ہے!" فراؤلین ہیبر نے وجد میں آتے ہوئے کہا۔

"وہ تڑ! ذرا سنو!"

"شش! شش!"

"شش!"

فراؤلین شریڈر بالکل دیوانی ہو رہی تھیں۔ جب میں نے پوچھا کہ آخر بات کیا ہے تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں، مٹکتی ہوئی آگے آئیں، اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کے میرے ساتھ ناچنے لگیں: "ہراِسی دُد! ہراِسی دُد! ہراِسی دُد!" یہاں تک کہ اُن کا سانس چڑھ گیا۔

"لیکن بات کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شش!" فراؤلین ہیبر نے فرش پہ لیٹے لیٹے حکم دیا۔ "شش! پھر شروع ہو گیا!"

ہمارے مکان کے بالکل نیچے ایک عورت فراؤ گلان ٹرینک رہتی ہے۔ وہ گلیشیا کی رہنے والی ہے اور یہودن ہے۔ فراؤ لین ہیبر کے لئے اُس کی دشمن بن جانے کو یہی وجہ کافی ہے، کیونکہ فراؤلین ہیبر، جیسا کہ ظاہر ہے، بڑی پُرجوش نازی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دفعہ زینے میں فراؤ لین ہیبر کے گانے کے متعلق ان دو عورتوں میں کچھ سخت کلامی بھی ہوگئی تھی۔ فراؤ گلان ٹرینک نے، شاید غیر آریائی ہونے کی وجہ سے، یہ کہہ دیا تھا کہ اس گانے سے تو مجھے بلّیوں کا غرّانا پسند ہے۔ اس طرح اُس نے صرف فراؤلین ہیبر ہی کی توہین نہیں کی تھی بلکہ سارے یورپ یا، سارے جرمنی کی عورتوں کی، اور یہ فراؤ لین ہیبر کا خوشگوار فرض تھا کہ اُن کا بدلہ لیا جائے۔

کوئی پندرہ دن ہوئے سب پڑوسیوں میں یہ خبر گرم تھی کہ فراؤ گلان ٹرینک نے جو ساٹھ سال کی بڑھیا ہے اور ایسی بدشکل ہے جیسے کوئی جادوگرنی ہو، اخبار میں شوہر کے لئے اشتہار دیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ مزے کی بات یہ ہوئی کہ ایک امیدوار بھی آموجود ہوا؛ وہ ہالے کا رہنے والا قصائی تھا، اور اس کی پہلی بیوی مرچکی تھی۔ اُس نے فراؤ گلان ٹرینک کو دیکھ بھی لیا تھا، مگر اس کے باوجود اُس سے شادی کرنے کو تیار تھا۔ فراؤ لین ہیبر کو موقع ہاتھ آگیا۔ گول مول سوالات کرکے اُس نے قصائی کا نام اور پتہ معلوم کرلیا، اور اُسے ایک گمنام خط لکھا۔ خط میں قصائی سے پوچھا گیا تھا کہ تمہیں یہ باتیں معلوم ہیں یا نہیں:

(۱) فراؤ گلان ٹرینک کے گھر میں کھٹمل ہیں (۲) وہ جعل سازی میں گرفتار ہوچکی ہے، اور فاترالعقل ہونے کی بنا پر رہا ہوئی ہے (۳) وہ غیر اخلاقی مقاصد کے لئے اپنا سونے کا کمرہ کرائے پر دیتی ہے (۴) اور بعد میں چادریں بدلے بغیر اُسی بستر پر سو جاتی ہے۔ اب قصائی وہ خط لے کے فراؤ گلان ٹرینک سے سوال جواب کرنے آپہنچا تھا۔ دونوں کی آوازیں

صاف سنائی دے رہی تھیں: خشم ناک جرمن غرّا رہا تھا، اور یہودن بھرّائی ہوئی آواز میں چیخ رہی تھی۔ کبھی کبھی لکڑی پہ گھونسا پڑنے کی آواز آتی تھی، اور بعض اوقات شیشہ ٹوٹنے کی۔ یہ جھگڑا گھنٹہ بھر تک چلتا رہا۔

آج صبح پتہ چلا ہے کہ پڑوسیوں نے ڈیوڑھی بان عورت سے اس شور و غل کی شکایت کی ہے، اور فراؤ گلان ٹرنیک کی آنکھ کے اوپر کالا کالا نشان ہے۔ اب شادی نہیں ہوگی۔

اس محلّے کے باشندے اب میری شکل پہچاننے لگے ہیں۔ جب میں دکان پہ پہنچ کے ایک پونڈ مکھن مانگتا ہوں تو میرا انگریزوں کا سا لب و لہجہ سُن کر اب لوگ میری طرف مڑ کے نہیں دیکھتے! اندھیرا ہونے کے بعد جب سڑک کے نکڑ سے گزرتا ہوں تو وہ تینوں رنڈیاں اب مجھ سے اپنی گہری آوازیں چپکے چپکے "آؤ، پیارے!" نہیں کہتیں۔

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تینوں رنڈیوں کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ وہ اپنی عمر چھپانے کی کوشش نہیں کرتیں۔ وہ اتنا زیادہ پاؤڈر یا سرخی نہیں لگاتیں کہ دور ہی سے نظر آئے۔ سموّر کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ، لمبے لمبے اسکرٹ اور بڑھیوں کی سی ٹوپیاں پہنتی ہیں۔ میں نے اتفاق سے اُن کا ذکر بوبی سے کیا تو اُس نے مجھے بتایا کہ اس طرح کی آرام دہ قسم کی عورتوں کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ بہت سے ادھیڑ عمر کے آدمی انہیں لڑکیوں پہ ترجیح دیتے ہیں، بلکہ بیس سال سے کم عمر کے لڑکے بھی اُن کی طرف بہت متوجہ ہوتے ہیں۔ بوبی نے بتایا کہ لڑکے اپنی عمر کی لڑکی سے شرماتے ہیں، لیکن اپنی ماں کی عمر کی عورت سے نہیں جھینپتے۔ شراب خانوں میں کام کرنے والوں کی طرح، بوبی جنسی معاملات کا زبردست ماہر ہے۔

ابھی دو ایک دن ہوئے شام کو میں اُس سے کاروبار کے وقت ملنے گیا تھا۔
جب میں ٹروئکا پہنچا تو ابھی بڑا سویرا تھا، کوئی نو بجے ہونگے۔ یہ جگہ میری توقع سے زیادہ بڑی اور شاندار تھی۔ ایک پاسبان نے جس کے لباس میں نوابوں کی طرح فیتے لگے ہوئے تھے، میرے ننگے سر کو بڑے شبہے کی نظروں سے دیکھا، لیکن جب میں نے اُس سے انگریزی میں باتیں کیں تو وہ مطمئن ہوا۔ کوٹ رکھنے کے کمرے میں ایک تیز طرّار لڑکی نے میرا اوورکوٹ لینے پر بڑا اصرار کیا جس سے میرے ڈھیلے ڈھالے فلالین کے پتلون کے بدترین دھبّے چھپے رہتے ہیں۔ کاؤنٹر پر جو لڑکا بیٹھا تھا وہ اندر والا دروازہ کھولنے کے لیئے نہیں اٹھا۔ آخر یہ دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ بُوبی ایک نیلی اور نقرئی میز کے پیچھے اپنی جگہ کھڑا ہے۔ میں اُس کی طرف ایسا لپکا جیسے کسی پرانے دوست کی طرف۔ اُس نے بڑی ملاطفت سے میرا استقبال کیا:

"گڈ ایوننگ، مسٹر اشروڈ، آپ کے تشریف لانے سے بڑی خوشی ہوئی۔"
میں نے بیئر کا آرڈر دیا، اور کونے میں تپائی پر بیٹھ گیا۔ میری کمر دیوار کی طرف تھی، اور میں اپنی جگہ سے سارے کمرے کا جائزہ لے سکتا تھا۔

"کاروبار کیسا چل رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔
بُوبی کا چہرہ نشاط گاہوں میں رات بھر جاگنے والوں کا سا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے طرح طرح کی فکروں نے جھرّیاں ڈال دی ہوں؛ اُس نے پاؤڈر لگا رکھا تھا۔ میرا سوال سُن کر اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ اُس نے سلاخ کے اُوپر سے میری طرف سر جھکایا، اور خوشامدانہ متانت کے ساتھ کچھ ایسے انداز میں بولا جیسے اپنا کوئی راز بتا رہا ہو:
"زیادہ اچھا نہیں چل رہا، مسٹر اُشروڈ۔ آج کل اس طرح کے لوگ آتے ہیں......

قسم کی بُو پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بُو کچھ ایسی ناخوشگوار نہیں ہوتی، اس میں بخورات اور باسی بسکٹوں دونوں کی بُو شامل ہوتی ہے۔ چھت بہت اونچا ہے، اس میں ٹائل لگے ہوئے ہیں اور بڑا بھڑک دار رنگ کیا گیا ہے، جیسے گرجا کی قربان گاہ۔ منہ دھونے کی میز بالکل گوتھک طرز کی عبادت گاہ معلوم ہوتی ہے۔ الماری بھی گوتھک طرز کی ہے اس میں گرجاؤں کی سی منقش کھڑکیاں ہیں؛ کھڑکیوں کے شیشوں پر ایک طرف تو بسمارک کی تصویر ہے اور دوسری طرف پروشا کے بادشاہ کی۔ میری بہترین کرسی اُسقف کے تخت کا کام بڑی اچھی طرح دے سکتی ہے۔ کونے میں از منۂ متوسطہ کے طرز کے تین نقلی تبر باندھ کر رکھ دیئے گئے ہیں، ان سے ٹوپیاں ٹانگنے کی کھونٹیوں کا کام لیا جاتا ہے (یہ تبر کسی دورہ کرنے والی ناٹک کمپنی سے تو نہیں لئے گئے ہیں؟) فراؤلین شربڈر کبھی کبھی ان تبروں کے پھل اتار کر ان پر پالش کیا کرتی ہیں۔ پھل اتنے بھاری اور تیز ہیں کہ ان سے آدمی قتل ہو سکتا ہے۔

کمرے میں ہر چیز اسی قسم کی ہے: بے ضرورت ٹھوس، معمول سے زیادہ بھاری، اور خطرناک طور پر تیز۔ یہاں لکھنے کی میز پر بھی میرے سامنے دھات کی بنی ہوئی چیزوں کی قطار کی قطار موجود ہے ــــ دو شمعدان جن کی شکل ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے سانپوں کی سی ہے، ایک راکھ دانی جس میں سے گھڑیال کا منہ باہر کو نکلا ہوا ہے، ایک کاغذ کاٹنے کا چاقو جو فلورنس کے بنے ہوئے خنجر کی صورت کا ہے، ایک پیتل کا ہنس جس کی دُم پہ ایک چھوٹی سی ٹوٹی سی گھڑی رکھی ہے، ایسی چیزوں کا حشر کیا ہوتا ہے؟ یہ برباد کس طرح ہوتی ہیں؟ غالباً یہ چیزیں ہزاروں سال اسی طرح قائم رہیں گی؛ لوگ انہیں بڑی احتیاط سے عجائب خانوں میں رکھیں گے۔ یا شاید کسی لڑائی میں ہتھیار بنانے کے لئے

انہیں پگھلا لیں گے۔ ہر روز صبح کو فراؤلین شیڈر انہیں احتیاط سے درست کر کے رکھ دیتی ہیں، اور اُن کی جگہیں کبھی نہیں بدلتیں؛ وہ ہمیشہ اپنی اپنی جگہ قائم رہتی ہیں — جیسے سرمائے، سماج، مذہب اور جنس کے بارے میں ان کی بے لوچ اور اٹل رائیں۔

اس لمبے چوڑے اور میلے کچیلے مکان میں وہ سارے دن ادھر سے اُدھر لڑھکتی پھرتی ہیں۔ وہ کچھ بے ہیئت سی ہیں، لیکن ہیں بڑی چوکنّی؛ عام طور سے سلیپریں اور پھولوں دار گاؤن پہنتی ہیں جس کے دامنوں کو اتنی ہوشیاری سے پن لگا کر جوڑا جاتا ہے کہ ذرا سا پیٹی کوٹ یا بوڈس تک نہیں دکھائی دیتا۔ اس ہیئتِ کذائی میں وہ بطخ کی سی چال چلتی اس کمرے سے اس کمرے میں پھرتی رہتی ہیں، اور ادھر اُدھر جھاڑن کے ہاتھ مارتی جاتی ہیں۔ اپنے کرائے داروں کے سامان اور الماریوں میں اپنی چھوٹی سی نوک دار ناک ڈال ڈال کے دیکھتی ہیں، تاک جھانک کرتی ہیں، کن سوئیاں لیتی ہیں۔ ان کی آنکھیں سیاہ، چمکدار اور متجسس ہیں، بال بھورے، لہریا اور بڑے خوبصورت ہیں؛ اپنے بالوں پر انہیں بہت فخر ہے۔ ان کی عمر کوئی پچپن سال کی ہوگی۔

عرصہ ہوا، جنگ اور مصنوعی افراطِ زر کے زمانے سے پہلے وہ نسبتاً زیادہ خوش حال تھیں۔ گرمیوں کی تعطیلات گزارنے کے لئے وہ بالٹک کے کنارے چلی جاتی تھیں، اور گھر کے کام کاج کے لئے اُن کے پاس خادمہ بھی تھی، پچھلے تیس سال سے وہ یہاں رہتی ہیں، اور اپنے مکان میں کرائے دار رکھتی ہیں، انہوں نے کرائے دار اس لئے رکھنے شروع کر دیئے کہ انہیں لوگوں کے ساتھ مل جل کر بیٹھنا بہت پسند تھا۔

"میری سہیلیاں مجھ سے کہا کرتی تھیں کہ لینا، یہ تم سے کیسے ہوتا ہے، یہ تم کیسے برداشت کرتی ہو کہ اجنبی لوگ تمہارے گھر میں رہیں اور تمہارا فرنیچر خراب کریں، تمہارے پاس تو

اتنا روپیہ ہے کہ اکیلے اطمینان سے رہو؟ اور میں ہمیشہ انہیں وہی جواب دیتی تھی۔ میں کہا کرتی تھی کہ میرے کرائے دار نہیں ہیں، وہ میرے مہمان ہیں۔"

"سمجھے آپ، ہر اَسی وُو، اس زمانے میں میرے پاس اتنا روپیہ تھا کہ میں اچھی طرح اطمینان کر لیتی تھی کہ جو لوگ میرے یہاں رہنے آرہے ہیں وہ کس قسم کے ہیں۔ اُس زمانے میں تو میں اپنے کرائے داروں کو اچھی طرح دیکھ بھال کے چھانٹا کرتی تھی۔ میں صرف ایسے آدمیوں کو رکھتی تھی جو واقعی اونچے گھرانے کے اور تعلیم یافتہ ہوں ــــ یعنی جو لوگ حقیقت میں شریف آدمی ہوں (جیسے آپ، ہر اَسی وُو) ایک مرتبہ ایک فوجی افسر آکے رہے تھے، ایک دفعہ ایک نواب صاحب اور ایک دفعہ ایک پروفیسر صاحب۔ میرے کرائے دار مجھے اکثر تحفے دیتے رہتے تھے ــــ کبھی شراب کی بوتل، کبھی چاکلیٹ کا ڈبہ، کبھی پھول اور جب کوئی کرائے دار اپنی چھٹیوں میں باہر چلا جاتا تھا تو ہمیشہ مجھے کارڈ بھیجتا تھا ــــ لنڈن سے، کبھی پیرس سے، کبھی بیڈن بیڈن سے۔ میرے پاس بڑے بڑے خوبصورت کارڈ آیا کرتے تھے......"

اور اب فراؤلین شریڈر کے پاس الگ کمرہ بھی نہیں ہے۔ انہیں بیٹھنے کے کمرے میں پردے کے پیچھے ٹوٹی ہوئی کمانیوں والے چھوٹے سے صوفے پر سونا پڑتا ہے۔ برلن کے بہت سے پرانے مکانوں کی طرح، ہمارے مکان کے اگلے حصّے سے پچھلے حصّے کو راستہ بیٹھنے کے کمرے میں ہو کے جاتا ہے۔ جو کرائے دار اگلے حصّے میں رہتے ہیں۔ انہیں غسل خانے جانے کے لئے بیٹھنے کے کمرے میں سے گزرنا پڑتا ہے، چنانچہ رات کو فراؤلین شریڈر کی نیند میں اکثر خلل پڑتا ہے۔ "لیکن مجھے فوراً پھر نیند آجاتی ہے۔ اس سے مجھے تکلیف نہیں ہوتی۔ مجھے تھکن ہی ایسی رہتی ہے۔" انہیں گھر کا سارا کام خود کرنا پڑتا ہے۔

اور دن کا زیادہ حصہ اسی میں گزر جاتا ہے۔" بیس سال پہلے اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ اپنا فرش دھولو تو میں اُس کے منہ پہ چانٹا رسید کرتی، بات یہ ہے کہ ہر چیز کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اب یہی دیکھئے، مجھے وہ زمانہ یاد ہے کہ میں اپنا دایاں ہاتھ کاٹ ڈالتی مگر پاٹ نہ اٹھتی..... اور اب" فراؤلین شریڈر الفاظ کے معنی ہاتھوں کی حرکت سے سمجھاتے ہوئے کہتی ہیں، "خدا کی قسم' اب تو بس ایسا ہے جیسے پیالی میں چائے انڈیل دی!"

اس کمرے میں جو کرائے دار رہ چکے ہیں اُن کے چھوڑے ہوئے نشانات اور دھبے مجھے دکھانے کا انہیں بڑا شوق ہے:

"ہاں، ہر اسی وُد، ہر آدمی کو یاد رکھنے کے لئے میرے پاس کوئی نہ کوئی چیز ضرور موجود ہے..... ذرا ادھر دیکھئے، یہاں قالین پہ ــــ میں اسے بیسیوں ہی دفعہ دھوبی کے یہاں بھیج چکی ہوں، لیکن یہ صاف نہیں ہو کے دیتا ــــ اس جگہ ہر ٹیکے نے اپنی سال گرہ کی دعوت کے بعد قے کی تھی۔ خدا جانے انہوں نے کیا کھایا تھا جو ایسی گندگی پھیلائی؟ وہ پڑھنے کے لئے برلن آئے تھے۔ ان کے والدین برانڈن برگ میں رہتے تھے ــــ بڑا نفیس خاندان تھا۔ میں سچ کہہ رہی ہوں! کھانچیوں روپیہ تھا اُن لوگوں کے پاس! اُن کے والد صاحب ڈاکٹر تھے، اور وہ اپنے بیٹے کو بھی ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے..... بڑے شاندار نوجوان تھے وہ! میں ان سے کہا کرتی تھی، ہر ٹیکے، معاف کیجئے گا، لیکن آپ کو واقعی محنت کرنی چاہیئے ــــ آپ کا تو دماغ بڑا اچھا ہے! اپنے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کا تو خیال کیجئے۔ اُن کا روپیہ اس طرح ضائع کرنا انصاف کی بات نہیں ہے۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ دریا میں ہی ڈال دو۔ کم سے کم دو چار چھینٹیں ہی اڑیں گی! میں تو بالکل

آپ کو یقین نہیں آئے گا! ایک سال پہلے تو ہم انہیں دروازے میں گھسنے بھی نہ دیتے
بیئر کے ایک گلاس کا آرڈر دے دیتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ساری رات یہاں بیٹھے
رہنے کا حق مل گیا۔"

بوبی انتہائی تلخی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا:
"تم کیا پیو گے؟" میں نے اپنی بیئر مجرمانہ انداز سے جلدی جلدی ختم کرتے ہوئے پوچھا
اور اس ڈر سے کہ کہیں غلط فہمی نہ پیدا ہو، یہ بھی کہہ دیا: "میں تو وسکی اور سوڈا پیوں گا۔"
بوبی نے کہا۔ میں بھی یہی پی لوں گا۔

کمرہ تقریباً خالی تھا۔ جو دو چار آدمی بیٹھے تھے میں نے اُن کی طرف دوبارہ نظر ڈالی
اور انہیں بوبی کی یاس انگیز آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ شراب کی میز کے
قریب تین بڑی دلکش اور عمدہ کپڑوں میں ملبوس لڑکیاں بیٹھی تھیں؛ جو لڑکی مجھ سے قریب
تھی وہ بہت خوش وضع تھی، اور شکل سے بہت مہذب معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب گفتگو
کچھ دیر کے لئے ذرا رُک گئی تو شراب خانے کے دوسرے ملازم سے اُس کی باتوں کے
دو تین فقرے مجھے سنائی دیئے۔ وہ برلن کی بازاری بولی بول رہی تھی۔ وہ کچھ تھکی اور
اُکتائی ہوئی سی تھی، اُس کا منہ نیچے کو لٹک رہا تھا۔ ایک نوجوان اُس کے پاس پہنچا،
اور مباحثہ میں شامل ہو گیا۔ یہ بڑا خوبصورت اور چوڑے شانوں والا لڑکا تھا، اُس نے
بڑی نفیس وضع کی ڈنر جیکٹ پہن رکھی تھی، اور بالکل یہ معلوم ہوتا تھا جیسے انگلستان کے
کسی پبلک اسکول کا کوئی بیری فیکٹ چھٹی منانے آیا ہو۔

"نہیں، نہیں،" میں نے اُسے کہتے سنا "میرے ساتھ نہیں!" وہ دانت پھاڑ
کے مسکرایا، اور بازاروں والا وحشیانہ اور بیہودہ اشارہ کیا۔

کونے میں خادم لڑکا بیٹھا پیجانے کے پستہ قد بڈھے نگہبان سے باتیں کر رہا تھا جو اپنا سفید کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ لڑکے نے کوئی بات کہی، زور سے ہنسا اور یکایک رک کے لمبی سی جمائی لی۔ تینوں باجہ بجانے والے چبوترے پہ بیٹھے گپیں اڑا رہے تھے، غالباً وہ اُس وقت تک موسیقی شروع نہیں کرنا چاہتے تھے جب تک کہ اتنے اور ایسے آدمی جمع نہ ہو جائیں جن کے لئے اتنی تکلیف اٹھائی جا سکے۔ ایک میز پہ ایک موٹا سا مونچھوں والا آدمی بیٹھا تھا، میں نے سوچا کہ یہ واقعی گاہک ہے۔ لیکن ایک لمحے بعد جب اُس کی نظر مجھ پر پڑی تو اُس نے مجھے سلام کیا؛ اس سے مجھے پتہ چلا کہ وہ منیجر تھا۔

دروازہ کھلا۔ دو مرد اور دو عورتیں اندر آئیں۔ عورتیں زیادہ عمر کی تھیں، اُن کی ٹانگیں موٹی موٹی اور بال کٹے ہوئے تھے، انہوں نے شام کا بڑا قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ مرد کچھ کاہل وجود سے اور بالکل زرد تھے، غالباً وہ ہالینڈ کے رہنے والے تھے۔ یہ لوگ واقعی مالدار تھے۔ چشم زدن میں ٹروئکا کی شکل بدل گئی۔ منیجر، سگرٹ بیچنے والا لڑکا اور پیجانے کا نگہبان، سب کے سب ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پیجانے کا نگہبان غائب ہو گیا، منیجر نے سگرٹ بیچنے والے سے خشم ناک لہجے میں زیر لب کچھ کہا، اور وہ لڑکا بھی غائب ہو گیا۔ منیجر مسکراتا اور جھک جھک کے سلام کرتا ہوا گاہکوں کی میز کی طرف بڑھا اور دونوں مردوں سے ہاتھ ملایا۔ سگرٹ بیچنے والا اپنی کشتی لے کر پھر آ موجود ہوا، اور اُس کے پیچھے پیچھے ویٹر شرابوں کی فہرست لئے لپکتا ہوا آیا۔ اس دوران میں تین آدمیوں والے آرکسٹرا نے اپنا کام فوراً شروع کر دیا تھا۔ شراب کی میز کے قریب جو لڑکیاں تھیں وہ اپنی تپائیوں پر گھوم کے بیٹھ گئیں اور اس طرح مسکرانے لگیں کہ اُن کے تبسم میں دعوت تو موجود تھی مگر براہِ راست نہیں۔ پیشہ ور ناچنے والے اُن کی طرف اس طرح بڑھے جیسے اُن سے بالکل ناواقف

ہوں؛ بڑے ادب سے اُن کے سامنے جھک کے سلام کیا، اور مہذب لہجے میں پوچھا کہ آپ ہمیں رقص کی مسرّت بخشیں گی یا نہیں. خادم لڑکا، بڑا بنا ٹھنا، ہوشیاری سے مسکراتا، کمر سے اُوپر اُوپر پھول کی طرح جھُولتا، سگرٹوں کی کشتی لئے کمرے میں ایک طرف سے دوسری طرف گیا: "سگار! سگرٹ!" اُس کی آواز ایکٹروں کی آواز کی طرح بالکل صاف تھی، اور اُس میں ایک طرح کا استہزا تھا. اور ویٹر نے بالکل اسی لہجے میں، لیکن زیادہ استہزا اور مسرّت کے ساتھ، اور بلند آواز میں، تاکہ ہم سب سُن لیں، بوبی کو شراب کا آرڈر دیا: "ہائڈسیک مونوپول!"

ناچنے والے بڑی مہمل اور رفکر مندانہ متانت کے ساتھ پیچیدہ گردشیں کر رہے تھے، اُن کی ہر حرکت سے ایک فرض ادا کرنے کا احساس جھلکتا تھا. سیکسوفون بجانے والا، گردن میں فیتہ باندھے اور اس میں اپنا باجہ لٹکائے، چھوٹا سا بھونپو لئے چبوترے کے کنارے پہ آیا اور گانے لگا:

تم ہنس رہی ہو
مجھے تم سے محبّت ہے
میری پیاری محبوبہ

جب وہ گا رہا تھا تو اُس کے چہرے سے چالاکی جھلک رہی تھی، وہ کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا جا رہا تھا، اور ہم سب کو اپنی سازش میں شریک کئے لے رہا تھا. اُس نے اپنی آواز میں بڑی طنز بھر دی تھی، اور اس طرح آنکھیں گھما رہا تھا جیسے انتہائی مسرّت کی وجہ سے کسی کو مرگی کا دورہ پڑ گیا ہو. بوبی جو عمر میں اُس سے پانچ سال کم ہے، اور بڑا شائستہ اور چکنا چپڑا ہے، شراب کی بوتل انڈیل رہا تھا. اور اس دوران میں وہ دونوں پہلے سے

آدمی شاید کاروبار کے متعلق آپس میں باتیں کر رہے تھے، اور اس محفلِ شبانہ کی طرف دیکھ تک نہیں رہے تھے جو انہیں کی وجہ سے وجود میں آئی تھی۔ اُن کی عورتیں خاموش بیٹھی تھیں، اور کچھ بے آرام سی، کچھ پریشان سی، اور اکتائی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں جیسے کوئی ان کی پرواہی نہ کرتا ہو۔

میری پہلی شاگرد فراؤلین ہیپی برن شٹائن گرونے والڈ میں رہتی ہے۔ اُس کا مکان تقریباً سارے کا سارا شیشے کا بنا ہوا ہے۔ برلن کے سب سے مالدار خاندان زیادہ تر گرونے والڈ ہی میں رہتے ہیں۔ اس کی وجہ معلوم کرنا مشکل ہے۔ ان لوگوں کے بنگلے قیمتی تو ہیں مگر بڑے بدصورت! ان بنگلوں میں سترھویں صدی کے عجیب و غریب اور احمقانہ مکانات سے لے کر لوہے اور شیشے کے بنے ہوئے ہموار چھتوں والے مکعبی صندوقوں تک کوئی طرزِ تعمیر چھوڑا نہیں گیا۔ صنوبر کے نم آلود اور بے رنگ جنگل میں یہ مکانات پٹے گھچ پچ بنے ہوئے ہیں۔ چونکہ زمین بے انتہا مہنگی ہے، اس لئے بڑے بڑے باغ بہت ہی کم مکانوں میں ہیں۔ ہر مکان کے سامنے بس کسی نہ کسی پڑوسی کے مکان کا پچھلا حصہ ہوتا ہے۔ حفاظت کے لئے تاروں کی ٹٹّی لگی رہتی ہے، اور کوئی وحشی کتّا ضرور ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو چوری اور انقلاب کا اتنا ڈر ہے کہ ان بچاروں کی حالت بالکل محصورین کی سی ہو کے رہ گئی ہے: نہ تو انہیں تخلیہ میسّر ہے نہ دھوپ۔ اس محلّے میں رہتے تو ہیں لکھ پتی مگر ہے اتنا گندا اور تاریک جیسے کوئی غریبوں کا محلّہ۔

جب میں نے باغ کے دروازے پر گھنٹی بجائی تو ایک نوجوان خادم کنجی لئے ہوئے مکان سے نکلا اور اس کے پیچھے پیچھے ایک بہت بڑا کتّا غرّاتا ہوا آیا۔

جب تک میں یہاں ہوں آپ کے کاٹ نہیں سکتا،" خادم نے طنزاً مسکراتے ہوئے مجھے تسلّی دی۔

برن شٹائن خاندان کے مکان کے بڑے کمرے میں کواڑوں پر دھات کے پترے چڑھے ہوئے ہیں؛ دیوار پر ایک جہازی گھڑی ہے جسے میخوں سے ٹھونکا گیا ہے۔ کمرے میں جدید قسم کے لیمپ ہیں جنہیں اس طرح بنایا گیا ہے کہ تھرمامیٹر اور سوئچ بورڈ کٹے ہوئے معلوم ہوں۔ لیکن فرنیچر مکان اور اس کی دوسری چیزوں سے مناسبت نہیں رکھتا، یہ جگہ بالکل بجلی گھر کی طرح ہے جیسے انجنیئروں نے کسی پرانی وضع کے اور بڑے معزز بورڈنگ ہاؤس سے کرسیاں اور میزیں لاکر آرام دہ بنانے کی کوشش کی ہو۔ دھات کی بے رنگ دیواروں پر فطری مناظر کی بے انتہا رنگ و روغن والی انیسویں صدی کی تصویریں سونے کے بھاری بھاری چوکھٹوں میں لٹکی ہوئی ہیں۔ غالباً ہر برن شٹائن نے کسی ناعاقبت اندیشی کے لمحے میں جدید قسم کی مقبولِ عام عمارتیں بنانے والے ماہرِ تعمیرات کو بنگلہ بنانے کا حکم دے دیا تھا، لیکن جب نتیجہ نظروں کے سامنے آیا تو بڑی وحشت ہوئی اور خاندان کی پرانی چیزوں سے جتنا بھی ممکن ہو سکا اسے ڈھکنے چھپانے کی کوشش کی۔ فراؤلین ہپی انیس سال کی موٹی سی خوبصورت لڑکی ہے؛ اس کے بال چمکدار اور سرخی مائل بھورے رنگ کے ہیں، دانت بڑے اچھے ہیں اور آنکھیں گائے کی طرح بڑی بڑی ہیں۔ جب وہ ہنستی ہے تو اس کے انداز سے بڑی کاہلی، خوش مزاجی اور تن پروری ٹپکتی ہے۔ اس کا سینہ خوب بھرا بھرا ہے۔ وہ اسکول کی لڑکیوں کی سی انگریزی بولتی ہے اور بڑی اچھی طرح؛ اس کا لب و لہجہ ذرا امریکن قسم کا ہے۔ وہ اپنی انگریزی سے پوری طرح مطمئن ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا ارادہ کوئی کام کرنے کا نہیں ہے۔ جب میں

کچھ ہچکچاتے ہوئے اپنے سبقوں کا خاکہ اُسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا تو وہ مجھے بیچ میں بار بار روک کے چاکلیٹ، کافی، سگریٹیں دیتی جاتی تھی۔ "ذرا ایک منٹ کے لیئے معاف کیجئے گا، پھل تو ہیں ہی نہیں،" وہ گھر کے ٹیلیفون کا رسیور اٹھاتے ہوئے مسکرائی، "اینا، ذرا تھوڑی سی نارنگیاں تو لے آؤ۔"

جب خادمہ نارنگیاں لے آئی تو اتنے احتجاج کے باوجود مجھے پلیٹ اور چھری کانٹے لے ساتھ پیٹ بھر کے کھانا پڑا۔ اُستاد شاگرد کے تعلق کا جو آخری بہانہ باقی رہ گیا تھا اس سے وہ بھی ختم ہو گیا۔ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے میں تو پولیس کا سپاہی ہوں، اور ایک دلکش سی باورچن مجھے باورچی خانے میں بٹھا کے کھانا کھلا رہی ہے۔ فراؤلین ہیپی بیٹھی مجھے کھاتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور اپنے مخصوص طریقے سے مسکرا رہی تھی جس سے اس کی خوش مزاجی اور کاہل وجودی ٹپکتی ہے۔

"یہ تو بتایئے کہ آپ جرمنی کیوں آئے؟"

اُسے میرے بارے میں تجسس تو ہے، مگر بس ایسا جیسے کوئی گائے بے کار پھرتے پھرتے اپنا سر کسی دروازے کی سلاخوں میں اڑانے لگتی ہے، اور اُسے دروازہ کھلنے کی کوئی ایسی خواہش نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ مجھے جرمنی بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

"سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال،" میں نے اپنی سکول ماسٹروں کی سی آوازمیں بڑے تحکم کے ساتھ فی البدیہہ کہنا شروع کیا، "یورپ کے دوسرے ملکوں کی بہ نسبت جرمنی سے زیادہ دلچسپی ہے۔"

"یعنی روس کے علاوہ،" میں نے تجرباتی طور پر اس فقرے کا اضافہ کیا۔

لیکن فراؤلین ہیپی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بس وہ اخلاقاً مسکرا دی۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں تو آپ اُکتا جائیں گے؟ برلن میں آپ کے زیادہ دست

تو ہیں نہیں، یا ہیں ؟"

"نہیں۔ زیادہ نہیں ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اس بات سے وہ بہت خوش اور محظوظ ہوئی:

"آپ کی دو چار اچھی لڑکیوں سے واقفیت ہے یا نہیں ؟"

یہاں گھر والے ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ کاہلانہ انداز سے مسکراتے ہوئے اُس نے ریسیور اٹھالیا، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اُس سے جو ٹین کی طرح کھڑکھڑاتی ہوئی آواز نکل رہی ہے وہ اُسے سنائی نہیں دے رہی۔ میرے کان میں ہیپی کی ماں فراؤ برن شٹائزہ کی اصلی آواز صاف آرہی تھی جو برابر والے کمرے سے بول رہی تھیں۔

"آپ یہاں اپنی لال کتاب چھوڑ گئی ہیں؟" فراؤلین ہیپی نے از راہِ تمسخر دہرایا، اور میری طرف اس طرح مسکرا کے دیکھا جیسے یہ کوئی مذاق تھا جس میں مجھے بھی شریک کرنا لازمی تھا۔ "نہیں، مجھے تو نہیں دکھائی دیتی۔ نیچے ہوگی مطالعے کے کمرے میں۔ ابا کو فون کرکے پوچھیئے۔ ہاں، وہ وہاں کام کر رہے ہیں۔" اُس نے کچھ کہے بغیر میری طرف ایک اور نارنگی بڑھائی۔ میں نے بڑے اخلاق سے سر ہلا کے انکار کر دیا۔ ہم دونوں مسکرانے لگے: "اماں، آج دوپہر کے لیئے کیا پکا ہے؟ اچھا؟ واقعی؟ بہت عمدہ!"

اُس نے ریسیور ٹانگ دیا، اور پھر جرح شروع کر دی:

"آپ کی دو چار اچھی لڑکیوں سے واقفیت ہے یا نہیں؟"

میں نے بات ٹالتے ہوئے اُس کی انگریزی ٹھیک کی۔ لیکن فراؤلین ہیپی صرف مسکرا دی، اور اپنے سوال کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

"ہاں۔ ایک۔" آخر مجھے کہنا پڑا۔ میرے ذہن میں فراؤلین کوسٹ کا نام تھا۔

"صرف ایک؟" اُس نے مزاجیہ حیرت کے ساتھ اپنی بھنویں اُوپر اٹھا دیں۔ "اچھا مجھے یہ بتائیے کہ آپ کو جرمن لڑکیاں انگریز لڑکیوں سے مختلف معلوم ہوتی ہیں یا نہیں؟"
میں شرم کے مارے سرخ ہو گیا۔ میں اُس کی انگریزی ٹھیک کرنے لگا، لیکن بیچ ہی میں رُک گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے خود ہی یقین نہیں کون سا جملہ صحیح ہے کون سا غلط۔

"آپ کو جرمن لڑکیاں انگریز لڑکیوں سے مختلف معلوم ہوتی ہیں یا نہیں؟" اُس نے متبسم اصرار کے ساتھ دہرایا۔

میں پہلے سے بھی زیادہ سرخ ہو گیا۔ "ہاں۔ بہت مختلف" میں نے جرأت آمیز انداز میں کہا۔

"کیا خاص فرق ہوتا ہے؟"

خدا کا شکر ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ کوئی باورچی خانے سے بول رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ آج دوپہر کا کھانا معمول سے ایک گھنٹہ پہلے ہوگا۔ ہر برنشٹائن کو آج تیسرے پہر شہر جانا تھا۔

"مجھے بڑا افسوس ہے" فراؤ لین ہپی نے اُٹھتے ہوئے کہا، "لیکن آج تو پڑھائی یہیں ختم کرنا پڑے گی۔ جمعہ کو پھر ملاقات ہوگی؟ کیوں، ہوگی نا؟ اچھا، خدا حافظ مسٹر اشروڈ۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

اُس نے اپنے بٹوے میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے ایک لفافہ نکالا اور مجھے دیدیا۔ میں نے جھینپتے ہوئے لفافے کو جیب میں ٹھونس لیا اور جب برنشٹائن خاندان کا مکان نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اُسے کھولا۔ اس میں پانچ مارک کا سکّہ تھا۔ میں نے اسے اوپر ہوا میں اچھال دیا لیکن پکڑ نہیں سکا۔ پھر پانچ منٹ کی تلاش کے بعد مجھے سکّہ ریت میں

دبا ہوا ملا۔ ٹریم کے اسٹیشن تک میں سارے راستے دوڑتا ہوا آیا، میں گا رہا تھا اور سڑک کے روڑوں کو ٹھوکروں سے اِدھر اُدھر لڑھکا رہا تھا۔ میں ایک طرف تو اپنے آپ کو بے انتہا مجرم سمجھ رہا تھا اور دوسری طرف بڑا فخر محسوس کر رہا تھا، گویا میں نے کامیابی کے ساتھ کوئی چھوٹی سی چوری کی ہو۔

فراؤلین ہیپی کو کچھ پڑھانے کی کوشش کرنا یا اس کا دعویٰ کرنا بالکل تضیع اوقات کرنا ہے۔ اگر اُسے کوئی لفظ معلوم نہ ہو تو وہ جرمن لفظ بول دیتی ہے۔ اگر میں اُس کی غلطی ٹھیک کروں تو وہ اُسی جملے کو دہرا دیتی ہے۔ میں اس بات پر خوش تو ہوں کہ وہ اتنی کاہل وجود ہے، لیکن ڈر یہ ہے کہ فراؤ برنشٹائن کو یہ پتہ نہ چل جائے کہ اُن کی بیٹی کتنی کم ترقی کر رہی ہے۔ لیکن اس کا امکان بہت کم ہے۔ زیادہ تر امیر آدمی اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اگر انہوں نے ایک دفعہ آپ کو ساری بات سونپ دینے کا فیصلہ کر لیا تو انہیں جتنا چاہیے دھوکا دے سکتے ہیں۔ ذاتی طور پر پڑھانے والے کے لئے اصلی مسئلہ بس اتنا ہوتا ہے کہ کسی طرح مکان میں پہنچ جائے۔

جہاں تک ہیپی کا تعلق ہے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے آنے سے بہت خوش ہے اُس دن وہ کچھ ایسی باتیں کہہ رہی تھی جس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ اپنی اسکول کی سہیلیوں سے شیخی بگھارا کرتی ہے کہ مجھے ایک اصلی انگریز استاد پڑھانے آتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ مجھے پھلوں کی رشوت ملتی ہے کہ انگریزی زبان کے متعلق اُسے زیادہ پریشان نہ کروں۔ جہاں تک اُس کا تعلق ہے وہ اپنے والدین سے کہتی ہے کہ مجھے آج تک ایسا اچھا اُستاد ملا ہی نہیں۔ جن چیزوں سے اُسے دلچسپی ہے اُن کے متعلق

ہم جرمن میں گپ اُڑاتے رہتے ہیں اور ہرزہین چارمنٹ کے بعد ہمیں بیچ میں رکنا پڑتا ہے اور اُن کے خاندان میں ٹیلیفون پر بالکل غیر ضروری پیغامات تبدیل کرتے رہنے کا جو کھیل کھیلا جاتا ہے اُس میں ہپی بھی حصّہ لینے لگتی ہے۔

ہپی مستقبل کے بارے میں کبھی پریشان نہیں ہوتی۔ برلن کے اور سب آدمیوں کی طرح وہ برابر سیاسی حالت کا ذکر کرتی رہتی ہے، لیکن بڑے اختصار اور رسمی افسردگی کے ساتھ جیسے لوگ مذہب کے بارے میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ اُس کے لئے سیاسی حالات بالکل غیر ضروری ہیں۔ اُس کا ارادہ ہے کہ یونیورسٹی میں پڑھے، اِدھر اُدھر سفر کرے، خوب مزے اڑائے اور آخر شادی کرلے۔ بہت سے لڑکے اُس کے دوست ہیں۔ ہم اپنا بہت سا وقت اُن کے متعلق گفتگو کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ ایک لڑکے کے پاس بڑی نفیس کار ہے دوسرے کے پاس ہوائی جہاز ہے۔ ایک اور لڑکا سات دفعہ ڈوئیل لڑ چکا ہے۔ ایک اور لڑکے نے کھمبوں پر ایک خاص جگہ زور سے لات مار کے سڑک کی بتیاں بجھانے کا طریقہ دریافت کیا ہے۔ ایک رات رقص سے واپس آتے ہوئے اُس نے اور ہپی نے اس علاقے میں سڑکوں کی ساری بتیاں بجھا دی تھیں۔

برنشٹائن خاندان میں آج دوپہر کا کھانا سویرے کھایا گیا۔ چنانچہ "سبق" پڑھانے کے بجائے مجھے کھانے کی دعوت دی گئی۔ سارا خاندان موجود تھا۔ فراؤ برنشٹائن دوہرے بدن کی اور بڑی پُرسکون طبیعت کی ہیں۔ ہر برنشٹائن پستہ قد، کچھ مذبذب اور چالاک سے ہیں۔ ہپی کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی جو اسکول میں پڑھتی ہے اور بارہ سال کی ہے۔ وہ بے انتہا موٹی ہے۔ اُس نے اتنا کھایا اتنا کھایا کہ حد ہوگئی۔ ہپی نے اُس کا بہت مذاق

اُڑایا اور تنبیہہ کی کہ کھاتے کھاتے پیٹ پھٹ جائے گا. لیکن اُس کے اُوپر کوئی اثر نہیں ہوّا. معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے پُرسکون اور بھاری بھر کم انداز میں ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں. ایک ہلکا سا گھریلو جھگڑا ابھی ہوا، کیونکہ ہر برنشٹائن نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی بیوی آج تیسرے پہر کو خرید و فروخت کے لئے کار میں جائیں؛ پچھلے چند دن سے شہر میں نازیوں کی وجہ سے کافی فسادات ہو رہے ہیں.

"ٹریم میں چلی جاؤ." ہر برنشٹائن نے کہا." میں نہیں چاہتا کہ وہ لوگ میری خوبصورت کار پر پتھر پھینک پھینک کے ماریں."

"اور فرض کرو وہ میرے پتھر مارنے لگے ؟" فراؤ برنشٹائن نے خوش مزاجی سے پوچھا.

"اُونہہ، اس سے کیا ہوتا ہے. اگر انہوں نے تمہارے پتھّر مارے تو میں تمہارے سر پہ لگانے کے لئے مرہم خرید کے لا دوں گا. اس میں بس پانچ گروشن خرچ ہونگے لیکن اگر انہوں نے میری کار پہ پتھر پھینکے تو شاید میرا پانچ سو مارک کا نقصان ہو گا."

چنانچہ معاملہ طے ہو گیا. اب ہر برنشٹائن نے میری طرف توجّہ منعطف کی:

"تم یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ ہم تم سے بُرا سلوک کر رہے ہیں، کیوں بھئی؟ ہم تمہیں اچھا کھانا ہی نہیں کِھلاتے، بلکہ کھانا کھانے کے دام بھی دیتے ہیں!"

میں نے ہپی کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ ہر برنشٹائن نے بہت بڑی بات کہدی جو اس خاندان کے مزاحی شعور پر بھی گراں گزری تھی. چنانچہ میں ہنس دیا اور بولا: "اگر میں اور کھانا مانگوں تو کیا آپ ہر دفعہ مجھے ایک مارک زیادہ دیں گے ؟"

اِس جملے سے ہر برنشٹائن بہت محظوظ ہوئے. لیکن انہوں نے احتیاط برتی اور یہ جتا دیا کہ اُنہیں اچھی طرح معلوم ہے میں نے یہ بات سنجیدگی سے نہ کہی.

پچھلے ہفتے سے ہمارے گھر میں بڑا فتنہ فساد برپا ہے۔

بات یوں شروع ہوئی کہ فراؤلین کوسٹ، فراؤلین شریڈر کے پاس آئی اور اعلان کیا کہ میرے کمرے سے پچاس مارک چوری چلے گئے ہیں۔ وہ بہت پریشان تھی، خاص طور سے یوں کہ، اس کے قول کے مطابق، اُس نے یہ روپیہ کرایہ اور ٹیلیفون کا بل ادا کرنے کے لیے الگ رکھا تھا۔ فراؤلین کوسٹ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازے کے پاس جو الماری ہے اُس کی دراز میں یہ پچاس مارک کا نوٹ پڑا ہوا تھا۔

فراؤلین شریڈر نے فوراً یہ تجویز پیش کی، اور یہ بالکل فطری بات تھی، کہ روپیہ فراؤلین کوسٹ کے کسی گاہک نے چرایا ہے۔ فراؤلین کوسٹ نے کہا کہ یہ بالکل ناممکن ہے، کیونکہ تین دن سے کوئی آیا ہی نہیں تھا۔ پھر اُس کا دعویٰ تھا کہ اُس کے دوستوں پر تو کوئی شبہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ سب کے سب امیر آدمی تھے جن کے نزدیک پچاس مارک کے حقیر سے نوٹ کی کیا وقعت ہو سکتی تھی۔ اِس سے فراؤلین شریڈر بہت چڑی:

"شاید وہ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ یہ ہم میں سے کسی کا کام ہے! ذرا دیدہ دلیری تو دیکھو! میرا اِسی وُدھ، آپ کو یقین نہیں آئے گا، میں چاہوں تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں!"

"ہاں، فراؤلین شریڈر۔ واقعی آپ کر سکتی ہیں۔"

اب فراؤلین شریڈر نے یہ نظریہ مرتب کیا کہ روپیہ بالکل چوری نہیں گیا اور یہ فراؤلین کوسٹ کی کرایہ دینے سے بچنے کی ترکیب ہے۔ اُنھوں نے یہ بات اشاروں اشاروں میں فراؤلین کوسٹ سے کہہ بھی ڈالی۔ جس پر وہ بڑی خشمناک ہوئی۔ فراؤلین کوسٹ

نے کہا کہ خیر کچھ بھی ہو، میں
دو چار دن میں کہیں نہ کہیں سے روپیہ لا کے دوں گی۔ اور واقعی اُس نے روپیہ لا کے دے دیا ہے، اور ساتھ ہی مہینے کے آخر میں اپنا کمرہ خالی کر دینے کا نوٹس بھی۔

اس دوران میں بالکل اتفاقیہ طور سے مجھے پتہ چلا ہے کہ فراؤلین کوسٹ کا بوبی سے عشق لڑ رہا ہے۔ ایک دن شام کو جو میں اندر آیا تو دیکھا کہ فراؤلین کوسٹ کے کمرے میں روشنی نہیں ہے۔ اس کا پتہ ہر وقت چل جاتا ہے کیونکہ اُس کے دروازے میں ایک رنگین شیشہ لگا ہوا ہے تاکہ بڑے کمرے میں روشنی رہے۔ بعد میں جب میں بستر پہ لیٹا پڑھ رہا تھا تو فراؤلین کوسٹ کا دروازہ کھلنے اور بوبی کے ہنسنے اور کھسر پھسر کرنے کی آواز آئی۔ بڑی دیر تک تختے چرچڑاتے رہے اور دبی دبی ہنسی سنائی دیتی رہی، پھر بوبی پنجوں کے بل چلتا مکان سے باہر چلا گیا، اور بہت ہی آہستگی کے ساتھ دروازہ بند کر گیا۔ ایک لمحے بعد وہ بہت شور مچاتا ہوا پھر اندر آیا اور سیدھا نشست گاہ کی طرف چلا گیا۔ میں نے سنا کہ وہ فراؤلین شریڈر کو سلام کر رہا ہے۔

اگر فراؤلین شریڈر کو اس بات کا پوری طرح علم نہیں تو کم سے کم شبہ ضرور ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُنہیں فراؤلین کوسٹ پر اتنا غصّہ کیوں ہے۔ کیونکہ سچّی بات یہ ہے کہ وہ بے انتہا حاسد ہیں۔ بہت ہی مضحکہ خیز اور پریشان کُن واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ ایک روز صبح کو میں غسل خانے جانا چاہتا تھا تو دیکھا کہ وہاں تو پہلے سے فراؤلین کوسٹ موجود ہے۔ فراؤلین شریڈر دوڑی دوڑی دروازے پر پہنچیں اور میں انہیں روک بھی نہ سکا۔ آتے ہی اُنہوں نے فراؤلین کوسٹ کو حکم دیا کہ فوراً باہر آ جاؤ۔ اور جب فراؤلین کوسٹ نے حکم نہیں مانا تو فراؤلین شریڈر نے میرے منع کرنے کے باوجود دروازے

برُ مکتے برسانے شروع کر دیئے۔ "میرے غسل خانے سے نکلو۔" انہوں نے چیخ کے کہا "ابھی نکلو۔ ابھی باہر نکلو، ورنہ میں پولیس کو بلا کے تمہیں باہر نکلوا دوں گی!"

اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں ــــ رونے کی وجہ سے اختلاجِ قلب شروع ہو گیا۔ بُوبی کو اُنہیں سسکیاں لیتے اور آہیں بھرتے اُٹھا کر صوفے تک لے جانا پڑا۔ ہم بڑی بیچارگی کے عالم میں اُن کے چاروں طرف کھڑے تھے۔ فراؤلین میئر دروازے میں نمودار ہوئی۔ اُس کا چہرہ ایسا ہو رہا تھا جیسے کسی جلّاد کا، اور اُس نے بڑی خوفناک آواز میں فراؤلین کوسٹ سے کہا: "اگر یہ مَری نہیں تو بس سمجھنا تم بڑی خوش قسمت ہو!" اب سارا انتظام فراؤلین میئر نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہم سب کو کمرے سے نکال دیا اور مجھے گولیاں لانے کے لیے عطّار کے یہاں بھیجا۔ جب میں واپس آیا تو وہ صوفے کے قریب بیٹھی فراؤلین شریڈر کا ہاتھ تھپتھپا رہی تھی اور بڑے المناک لہجے میں آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی: "لینا، میری بچاری چھوٹی سی بچّی..... ان لوگوں نے تجھے کیا کر دیا؟"

سیلی بولز

اکتوبر کا آغاز تھا کہ ایک دن تیسرے پہر کو مجھے فرٹز وینڈل کے گھر کالی کافی پینے کے لئے بلایا گیا۔ فرٹز ہمیشہ "کالی کافی" پینے کی دعوت دیا کرتا تھا اور کالی پر بہت زور دیتا تھا۔ اُسے اپنی کافی پر بڑا فخر تھا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ برلن میں اس سے زیادہ تیز کافی نہیں ملتی۔

فرٹز نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو وہ عام طور سے کافی کی دعوت میں پہنا کرتا تھا، یعنی کشتی رانی والا بہت ہی موٹا سفید سویٹر اور ہلکے نیلے رنگ کی فلالین کا پتلون۔ اُس نے اپنے بے تکلف اور شیریں تبسم سے میرا استقبال کیا:

"ہیلو، کرس!"

"ہیلو فرٹز۔ کہو کیسے ہو؟"

"بہت عمدہ۔" وہ کافی کی مشین پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے کالے چمکدار بال اپنی جگہ سے الگ ہو گئے تھے اور معطر لٹیں اُس کی آنکھوں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ "یہ کمبخت چلتی ہی نہیں۔" وہ بولا۔

"کاروبار کیسا چل رہا ہے؟" میں نے پوچھا

"بہت ہی خراب، بہت ہی گندا۔" فرٹز بڑی فیاضی سے مسکرایا۔ "اگلے مہینے

یا تو میں کوئی نیا سودا کروں گا یا پھر پیشہ ور رقاص بن کے چلا جاؤں گا۔"

پیشہ ورانہ عادت کی وجہ سے میں نے اُس کی انگریزی ٹھیک کی۔

"میں آجکل بڑی گندی انگریزی بول رہا ہوں" فرٹز نے بڑی خود اطمینانی کے ساتھ لفظ کھینچ کھینچ کے کہا۔ "سیلی کہتی ہے کہ میں تمہیں دو چار سبق پڑھاؤں گی۔"

"یہ سیلی کون ہے؟"

"ارے میں بھول ہی گیا۔ تم سیلی کو نہیں جانتے۔ میں نے بہت بُری بات کی۔ خیر آج تیسرے پہر کو وہ یہاں آ رہی ہے۔"

"ہے کچھ عمدہ سی؟"

فرٹز نے اپنی شربتی کالی آنکھیں گھمائیں، اور اپنے خاص ڈبے سے شراب میں بھیگی ہوئی سگرٹ نکال کے مجھے دی۔

"بہت — بہت نفیس!" اُس نے لفظ کھینچ کھینچ کے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ میں اُس کے پیچھے بالکل دیوانہ ہوا جا رہا ہوں۔"

"وہ ہے کون؟ کیا کرتی ہے؟"

"ایک انگریز لڑکی ہے، ایکٹریس ہے۔ لیڈی وِنڈ میئر میں گاتی ہے۔ سچ کہہ رہا ہوں، بڑی زور دار ہے!"

"صاف بات ہے، اس بیان سے تو وہ انگریز لڑکی معلوم ہوتی نہیں۔"

"اُس کے اندر تھوڑا سا فرانسیسی خون بھی شامل ہے۔ اُس کی ماں فرانسیسی تھی۔"

چند منٹ بعد خود سیلی بھی آ پہنچی۔

"مجھے بہت زیادہ دیر تو نہیں ہو گئی، فرٹز پیارے؟"

بس آدھ گھنٹہ، زیادہ نہیں،" فرٹز نے مالکانہ مسرت سے چہرہ دمکاتے ہوئے اُسی طرح لفظ کھینچ کھینچ کر کہا۔ "آؤ میں تمہارا تعارف مسٹر اشروڈ سے کراؤں ـــــ مس بولز۔ مسٹر اشروڈ کو عام طور سے لوگ کرس کہتے ہیں۔"

"نہیں، غلط ہے،" میں نے کہا۔ "فرٹز ہی ایک آدمی ہے جس نے عمر بھر میں مجھے کرس کہا ہے۔"

سیلی ہنسنے لگی۔ وہ کالے ریشم کا لباس پہنے ہوئے تھی، کندھوں پر ایک چھوٹی سی قبا پڑی ہوئی تھی، اور سر پر ایک طرف کو خادموں کی سی ٹوپی بڑے بانکپن سے رکھی تھی:

"میں تمہارا ٹیلیفون استعمال کر لوں، پیارے؟"

"ضرور۔ فوراً کرو۔" فرٹز کی اور میری آنکھیں چار ہوگئیں۔ "آؤ، کرس، دوسرے کمرے میں چلیں۔ تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔" غالباً اُسے یہ بات معلوم کرنے کی بڑی بےتابی تھی کہ اُس کی نئی دریافت سیلی سے پہلی مرتبہ مل کر میں نے کیا رائے قائم کی ہے۔

"خدا کے واسطے مجھے اس آدمی کے ساتھ اکیلے مت چھوڑنا!" سیلی نے چلّا کے کہا "ورنہ وہ ٹیلیفون ہی پہ مجھ سے لطف اندوز ہونے گا۔ اُس کے جذبات بڑے خوفناک ہیں۔"

جب وہ ٹیلیفون کا نمبر ملا رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ اُس کے ناخون زمرّد کی طرح ہرے رنگے ہوتے ہیں۔ اُس نے یہ رنگ بڑا بُرا انتخاب کیا تھا، کیونکہ اس سے آدمی کی نظر فوراً اُس کے ہاتھوں کی طرف جاتی تھی جن پہ سگرٹ پینے کی وجہ سے بڑے دھبّے پڑے ہوئے تھے اور جو ایسے گندے تھے جیسے کسی چھوٹی سی بچی کے ہاتھ۔ اُس کا رنگ اتنا گہرا سرخ تھا کہ فرٹز کی بہن معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا چہرہ لمبا اور پتلا سا تھا جسے اُس نے پاؤڈر تھوپ کے بالکل سفید بنا رکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور بادامی رنگ کی تھیں، لیکن وہ

اپنی بھنوؤں کے لیئے جو پنسل استعمال کرتی تھی اُس کے لحاظ سے اور اُس کے بالوں کی منا سے آنکھوں کا رنگ اور سیاہ ہونا چاہیئے تھا۔

"ہلو" اُس نے فاختہ کی سی آواز میں کہا۔ اُس کے چمکدار سُرخ سُرخ ہونٹ ایسے لٹک رہے تھے جیسے وہ ٹیلیفون کے رسیور کو چومنے والی ہو۔ "کیا تم ہے میرے پیارے؟" اُس کا منہ کھُل گیا، اور وہ بڑے بے مغز مگر شیریں انداز سے مسکرانے لگی۔ فرٹز اور میں بیٹھے اُس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جیسے تھیٹر میں ناٹک دیکھ رہے ہوں۔ وہ جرمن زبان میں بولتی چلی گئی: "کیا چاہتے ہو، کل شام؟ اوہو، بڑا مزا رہے گا..... نہیں نہیں، آج شام تو میں گھر ہی رہوں گی۔ ہاں، ہاں، واقعی آج گھر ہی رہوں گی .... خدا حافظ میری جان۔" اُس نے رسیور ٹانگ دیا اور ہماری طرف فاتحانہ مڑی۔

"یہ وہ آدمی ہے جس کے ساتھ میں کل رات سوئی تھی،" اُس نے اعلان کیا۔ "محبّت کرنے میں بے نظیر ہے۔ اپنے کاروبار میں بڑا تیز ہے اور بے انتہا مالدار ہے ——" وہ آکے صوفے پر فرٹز کے برابر بیٹھ گئی۔ اور ایک لمبا سا سانس کھینچ کے گدّوں پر لڑھک گئی۔ "تھوڑی سی کافی دو، پیارے۔ پیاس کے مارے مری جا رہی ہوں۔"

ہم بڑی جلدی فرٹز کے محبوب موضوع پر آگئے: وہ اسے مو —— جبّت کہتا تھا۔

"اوسط کے لحاظ سے،" اُس نے ہمیں بتایا، "ہر دو سال میں کم سے کم ایک دفعہ میرا کوئی زبردست معاشقہ ضرور لڑتا ہے۔"

"آخری معاشقے کو کتنے دن ہوتے؟" سیلی نے پوچھا۔

"ٹھیک ایک سال اور گیارہ مہینے!" فرٹز نے اُس کی طرف انتہائی شریر نظروں سے دیکھا۔

"بہت عمدہ!" سیلی نے اپنی ناک سکوڑی اور اپنا قیقہہ والا نقرئی قہقہہ لگایا۔ "اچھا بتاؤ —— آخری معاشقہ کیسا رہا؟"

فرٹز نے اپنی پوری سوانح عمری سنانی شروع کر دی۔ اُس نے ہمیں پیرس میں ایک عورت کو پھسلا لینے کا قصہ سنایا، لاس پالماس میں تعطیلات کے زمانے میں عشق بازی کی تفصیلات بتائیں، پھر نیویارک کی چار خاص محبتوں، شکاگو کی ناامیدی اور بوسٹن کی فتح کا نمبر آیا؛ اس کے بعد پیرس میں تھوڑی سی دل لگی رہی، ویانا میں بڑا حسین واقعہ پیش آیا، غم غلط کرنے کے لئے لنڈن جانا پڑا، اور آخر میں پھر برلن۔

"سمجھے، پیارے فرٹز،" سیلی نے ناک سکوڑ کے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "میرا تو خیال یہ ہے کہ تمہارے ساتھ اصل میں گڑبڑ یہ ہے کہ تمہیں کبھی صحیح قسم کی عورت نہیں ملی۔"

"شاید یہی بات ہو ——" فرٹز نے اس رائے کو بڑی سنجیدگی سے سنا۔ اُس کی سیاہ آنکھیں ملائم اور جذباتی سی ہو گئیں: "ممکن ہے کہ میں ابھی تک اپنے آدرش کی تلاش میں ہوں ....."

"لیکن مجھے بالکل یقین ہے کہ تمہیں ایک نہ ایک دن مل ضرور جائے گی"، سیلی خود تو فرٹز کا مذاق اُڑا ہی رہی تھی، میری طرف ایک نظر ڈال کر اُس نے مجھے بھی اس کھیل میں شامل کر لیا۔

"کیا واقعی تمہاری یہی رائے ہے؟" فرٹز سیلی کی طرف آنکھیں جھپکاتے ہوئے بڑے شیریں انداز میں مسکرایا۔

"آپ کا بھی تو یہی خیال ہے نا؟" سیلی نے مجھ سے اپیل کی۔

"میں ٹھیک طرح نہیں کہہ سکتا،" میں نے جواب دیا۔ "میں آج تک یہی نہیں معلوم کر سکا کہ فرٹز کا آورشش کیا ہے۔"

نہ معلوم کیوں، فرٹز کو یہ بات بہت پسند آئی۔ اُس نے اِسے ایک طرح کی سند سمجھا۔ "اِ کرس مجھ سے بڑی اچھی طرح واقف ہے،" اُس نے اپنی سُریلی آواز میں کہا۔ "اگر کرس کو معلوم نہیں تو پھر میرا خیال ہے کہ کسی کو بھی نہیں معلوم۔"

اب سیلی کے جانے کا وقت آ گیا۔

"مجھے ایڈلون میں پانچ بجے ایک آدمی سے ملنا ہے،" اُس نے بتایا۔ "اور چھ بج چکے ہیں! خیر، کوئی بات نہیں، سؤر کو انتظار کرنے میں ذرا مزا آئے گا، وہ مجھے اپنی داشتہ بنانا چاہتا ہے، لیکن میں نے اُس سے کہہ دیا ہے کہ چاہے مر ہی کیوں نہ جاؤں، جب تک تم میرا سارا قرض ادا نہیں کر دو گے میں راضی نہیں ہوں گی۔ مرد ہمیشہ ایسے جانور کیوں ہوتے ہیں؟" اپنا بٹوہ کھول کر اس نے اپنے ہونٹوں اور بھنوؤں کو ٹھیک کیا۔ "ہاں، خوب یاد آیا؛ پیارے فرٹز، دیکھوں تو تم کیسے آدمی ہو، مجھے دس مارک ادھار دے سکتے ہو یا نہیں؟ ٹیکسی کے لئے میرے پاس ایک دھیلا نہیں ہے۔"

"ہاں، ضرور!" فرٹز نے جیب میں ہاتھ ڈالا، اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بہادر آدمی کی طرح روپیہ دے دیا۔

سیلی میری طرف مڑی: "کسی دن آیئے اور میرے ساتھ چائے پیجئے۔ آیئے گا نا؟ مجھے اپنے فون کا نمبر دیدیجئے۔ میں آپ کو فون کر دوں گی۔"

میں نے سوچا کہ شاید وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ میرے پاس بہت روپیہ ہے۔ خیر، اُسے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سبق مل جائے گا۔ میں نے اُس کی چھوٹی سی چمڑے کی کتاب

میں اپنا نمبر لکھ دیا۔ فرٹز اُسے پہنچانے دروازے تک گیا۔

"کہو!" وہ اُچھلتا ہوا کمرے میں آیا اور ہنسی کے مارے کھلکھلاتے ہوئے د بند کیا۔ "کرس، کیا رائے ہے تمہاری اُس کے بارے میں؟ میں نے کہا نہیں تھا کہ بڑ خوب صورت ہے؟"

"ہاں، کہا تو تھا!"

"میں اُس سے جب ملتا ہوں اور زیادہ دیوانہ ہو جاتا ہوں!" اُس نے خوشی مارے ٹھنڈا سا سانس بھر کے سگرٹ سلگا لی۔

"اور کافی لوگے، کرس؟"

"نہیں، بہت بہت شکریہ۔"

"سنو، کرس، میرا خیال ہے کہ تم بھی اُسے پسند آگئے!"

"حماقت کی بات ہے!"

"سچ کہہ رہا ہوں، میرا تو یہی خیال ہے!" فرٹز بڑا خوش خوش معلوم ہوتا تھا۔ "میرا تو اندازہ یہ ہے کہ اب ہماری اُس سے بہت زیادہ ملاقات ہوا کرے گی!"

جب میں فرائولین شریڈر کے یہاں واپس پہنچا تو مجھے ایسے چکر آرہے تھے کہ مجھے آدھے گھنٹے تک بستر پہ لیٹا رہنا پڑا۔ فرٹز کی سیاہ کافی ہمیشہ کی طرح زہریلی ثابت ہو رہی تھی۔

دو چار دن بعد وہ مجھے سیلی کا گانا سنانے لے گیا۔

لیڈی وِنڈرمیئر (سنا ہے کہ اب یہ موجود ہی نہیں) ایک "غیر رسمی" اور فن پرستانہ

قسم کا شراب خانہ تھا۔ اور ٹاؤنٹ زین اسٹراسے کے قریب واقع تھا۔ اس کے مالک نے اسے موں پارناس کی طرح بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ دیواریں کھانے کی فہرستوں پر بنے ہوئے خاکوں، کارٹونوں اور تھیٹر والوں کی دستخطی تصویروں سے ڈھکی ہوئی تھیں کسی تصویر پر لکھا تھا " واحد اور بے مثل لیڈی ونڈرمیئر کے لئے " اور کسی پر " ریجو ڈی کے لئے، محبت اور خلوص کے ساتھ۔" شراب خانے کی میز کے اُوپر بہت بڑا پنکھا لگا ہوا تھا جو عام قسم کے پنکھے سے چوگنا تھا۔ کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹے سے پر بڑا سا پیانو رکھا تھا۔

مجھے یہ دیکھنے کی بڑی بے چینی تھی کہ سیلی کا رویہ کس قسم کا ہوگا۔ نہ معلوم کیوں میں نے یہ تصور باندھا تھا کہ وہ جھینپی جھینپی سی ہوگی۔ لیکن وہ تو ذرا بھی نہ جھینپ رہی تھی۔ اُس کی آواز اتنی گہری اور بھرّائی ہوئی تھی کہ تعجب ہوتا تھا۔ وہ بہت بُرا گا رہی تھی اور اُس کے چہرے سے کسی قسم کے جذبے کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ ہاتھ دونوں طرف لٹکے ہوئے تھے، لیکن اپنے طریقے پر اُس کا گانا بھی بڑا مؤثر ثابت ہوا۔ کیونکہ ایک تو اُس کی شکل چونکا دینے والی تھی دوسرے اُس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ اُسے ذرا بھی پروا نہیں کہ لوگ اُس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں کیا نہیں۔ اُس کی بانہیں بے پروائی سے ڈھیلی ڈھالی نیچے لٹک رہی تھیں، چہرے پر چاہے جانے والی مسکراہٹ تھی، اور وہ ایک انگریزی گانا گا رہی تھی۔

"اب مجھے پتہ چلا کہ اماں

مجھ سے باعصمت رہنے کو کیوں کہتی تھیں،

وہ مجھے کسی ایسے آدمی سے بیاہنا چاہتی تھیں

جو بالکل تمہاری طرح کا ہو۔

گانے کی بڑی تعریف ہوئی۔ پیانو بجانے والا جو لہردار سنہرے بالوں والا خوبصورت نوجوان تھا، کھڑا ہو گیا اور بڑے احترام سے سیلی کا ہاتھ چوما۔ پھر اُس نے دو اور گانے گائے۔ ایک فرانسیسی میں اور دوسرا جرمن میں۔ ان کی اتنی تعریف نہیں ہوئی۔

گانا ختم ہونے کے بعد اُس کا ہاتھ بہت زیادہ چوما گیا اور سب لوگ شراب کی میز کی طرف چل پڑے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سیلی یہاں ہر آدمی کو جانتی ہے۔ وہ اُن سب سے نو تڑاخ کر رہی تھی اور سب کو پیارا کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ ارباب نشاط میں شامل تھی مگر اس اعتبار سے اُس میں کاروباری سلیقہ اور سمجھ بے انتہا کم تھی۔ اُس نے بہت سا وقت ایک عمر رسیدہ آدمی کو رجھانے میں ضائع کیا جو اُس کی بہ نسبت خادم سے باتیں کر کے زیادہ خوش ہوتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم سب کو نشہ چڑھ گیا۔ پھر سیلی کو کسی سے ملنے کے لئے جانا پڑا اور منیجر آ کے ہماری میز پر بیٹھ گیا۔ وہ اور فرٹز انگلستان کے نوابی خاندانوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ فرٹز نے خوب اپنے جوہر دکھائے جیسا پہلے بہت دفعہ ہو چکا تھا میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس قسم کی جگہ پھر کبھی نہیں آؤں گا۔

اپنے وعدے کے مطابق سیلی نے مجھے فون کیا اور چائے کی دعوت دی۔

وہ کوُر فورسٹین ڈام کے علاقے میں بہت اندر کی طرف مکانوں کے اُس بے رنگ سلسلے میں رہتی تھی۔ جو ہالنسے کی طرف بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مکان کی مالکہ جو بڑی موٹی اور گندی سی تھی اور جس کے مینڈک کی شکل کے بٹوا جیسے گلے نیچے لٹک رہے تھے وہ مجھے ایک بڑے سے نیم روشن کمرے میں لے گئی جس میں پورا سامان بھی نہیں تھا۔

ایک کونے میں ٹوٹا ہوا صوفا پڑا تھا اور کسی اٹھارھویں صدی کی لڑائی کی ایک دھندلی سی تصویر تھی جس میں زخمی بڑے شائستہ انداز سے کہنیوں کے بل لیٹے تھے اور فریڈرک اعظم کے گھوڑے کی اچھل کود کو بڑی تحسین آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"آہا، ہلو، کرس پیارے!" سیلی نے دروازے ہی سے چیخ کے کہا۔ "تم نے بڑا اچھا کیا کہ چلے آئے! میں بڑی تنہائی محسوس کر رہی تھی۔ میں فراؤ کارپف کے سینے پہ سر رکھ کے رو رہی تھی.... میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا، فراؤ کارپف؟" اُس نے جرمن زبان میں مینڈک کی شکل والی مالکہ مکان سے اپیل کی۔ "میں تمہارے سینے پہ سر رکھ کے رو رہی تھی۔" فراؤ کارپف نے مینڈک کی طرح ہنس کے اپنا سینہ ہلایا۔

"بولو کرس، کافی پیو گے یا چائے؟" سیلی نے کہا۔ "جو چاہو پی لو۔ لیکن میں چائے کی زیادہ سفارش نہیں کروں گی، نہ معلوم فراؤ کارپف چائے کو کیا کر دیتی ہیں؛ میرا تو خیال ہے کہ باورچی خانے کا سارا گندا پانی دیگچی میں جمع کرتی جاتی ہیں اور اُس میں چائے کی پتیاں ڈال کے اُبال دیتی ہیں۔"

"خیر میں کافی پی لوں گا۔"

"فراؤ کارپف پیاری، ذرا ثواب کماؤ، ایک پیالی کافی تو لا دو۔" سیلی کی جرمن صرف غلط ہی نہیں تھی، بلکہ یہ زبان خود اُس نے گھڑی تھی۔ وہ ہر لفظ کو چبا چبا کر، مخصوص طور سے "غیر ملکیوں" کے انداز میں ادا کرتی تھی۔ صرف اُس کا چہرہ دیکھ کر آپ کہہ سکتے تھے کہ وہ غیر زبان بول رہی ہے۔ "پیارے کرس، ایک کام تو کرو، ذرا پردے کھینچ دو۔"

حالانکہ ابھی باہر خاصی روشنی تھی، لیکن میں نے پردے کھینچ دیئے۔ اس عرصے میں سیلی نے میز کا لیمپ جلا دیا تھا۔ جب میں کھڑکی کے پاس سے لوٹا تو وہ صوفے پر بڑی

نزاکت سے بلی کی طرح تڑی مڑی بیٹھی تھی اور اپنا بٹوہ کھول کر اس میں سگرٹ ڈھونڈھ رہی تھی. لیکن ابھی یہ انداز مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ پھر کود کر کھڑی ہو گئی:

"کچھ پیو گے؟" اُس نے ٹوٹی ہوئی منہ دھونے کی میز کے نیچے جوتوں کی الماری میں سے گلاس، انڈے اور چٹنی کی بوتل نکالی. "میرا تو گزارا انہیں چیزوں پر ہوتا ہے" اُس نے بڑی مہارت کے ساتھ گلاس میں انڈے توڑے، اُس میں چٹنی ملائی اور قلم سے پھینٹا، "میرے پاس بس اتنے ہی انڈے ہیں." وہ پھر صوفے پر پہنچ گئی اور پہلے کی طرح نزاکت سے تڑمڑ کے بیٹھ گئی.

وہ آج بھی [illegible] لباس پہنے ہوئے تھی، لیکن آج وہ قبا نہیں تھی. اُس کے بجائے اُس نے سفید کالر اور سفید کف لگا رکھے تھے. ان سے عصمت و عفت کا بالکل تھیٹر کی قسم کا اثر پیدا ہوتا تھا جیسے ننگیت ناٹک میں کوئی راہبہ. "تم کس بات پر ہنس رہے ہو، کرِس؟" اُس نے پوچھا.

"پتہ نہیں." [illegible] نے کہا. لیکن اب بھی میری ہنسی رُکی نہیں. اس وقت سیلی کی شکل بڑی مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی. وہ واقعی خوب صورت تھی ـــــ چھوٹا سا سیاہ بالوں والا سر، بڑی بڑی آنکھیں [illegible] بھی خمیدہ ناک ـــــ اور اُسے ابھی ان سب خصوصیات کا بڑا مہمل احساس تھا. وہ [illegible] کر [illegible] انداز سے صوفے پر بیٹھی تھی جیسے کوئی قمری، اُس کا سر بڑے شعوری انداز میں اُوپر اٹھا ہوا تھا اور اُنہیں ہاتھ بڑی نفاست سے رکھے تھے.

"کرس، سور، بتاؤ تم کیوں ہنس رہے ہو؟"

"مجھے بالکل پتہ نہیں."

اس پر وہ بھی ہنسنے لگی. "[illegible] پاگل ہو گئے ہو، بے!"

١٦١

"تم یہاں کتنے دن سے ہو؟" میں نے اس بڑے سے نیم روشن کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جب سے میں برلن آئی ہوں۔ ٹھہرو ذرا سوچ لوں ـــــ کوئی دو مہینے ہوئے۔"

میں نے پوچھا کہ اُس نے جرمنی آنے کا فیصلہ آخر کیا ہی کیوں تھا۔ کیا وہ اکیلی آئی تھی؟ نہیں، ایک سہیلی کے ساتھ آئی تھی۔ وہ ایکٹرس تھی۔ اُس کی عمر سیلی سے زیادہ تھی۔ وہ لڑکی پہلے بھی برلن آ چکی تھی۔ اُس نے سیلی کو بتایا تھا کہ انہیں اُوفا اسٹوڈیو میں ضرور کام مل جائے گا۔ چنانچہ سیلی ایک نیک دل بڈھے سے دس پونڈ قرض لے کر اُس کے ساتھ چلی آئی تھی۔

جب تک کہ وہ دونوں جرمنی نہیں پہنچ گئیں اُس نے اپنے والدین کو بتایا تک نہیں۔

"کاش کہ تم ڈائنا سے ملے ہوتے۔ روپیہ کمانے میں تو وہ اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ تم ٹھیک طرح تصور نہیں کر سکتے۔ وہ ہر جگہ لوگوں کو پھانس لیتی تھی، چاہے اُن کی زبان بول سکتی ہو یا نہ بول سکتی ہو، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ اُس کی باتوں پر مجھے اتنی ہنسی آتی تھی کہ ہنستے ہنستے میرا بُرا حال ہو جاتا تھا۔ میں اُس پر بالکل فدا تھی۔"

لیکن جب انہیں برلن میں ساتھ رہتے ہوئے تین ہفتے گزر گئے اور انہیں کوئی ملازمت نہیں ملی تو ڈائنا نے ایک صراف کو پھانس لیا جو اُسے اپنے ساتھ لے کر پیرس چلا گیا تھا۔

"اور وہ تمہیں اکیلا چھوڑ گئی؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ اُس نے بڑی ذلیل حرکت کی۔"

"کہہ نہیں سکتی..... ہر آدمی کو اپنا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میں اُس کی جگہ ہوتی تو شاید میں بھی یہی کرتی۔"

"میں شرط لگاتا ہوں کہ تم ایسا نہیں کر سکتی تھیں!"

"بہرحال میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ میں ہمیشہ اپنا کام اکیلے چلا سکتی ہوں۔"

"تمہاری کیا عمر ہے بیلی ؟"

"اُنیس سال۔"

"واقعی! میں نے سمجھا تھا کہ تم کوئی پچیس سال کی ہو!"

"میں جانتی ہوں۔ ہر آدمی یہی سمجھتا ہے۔"

فراؤ کارلیف دھات کی میلی سی کشتی میں کافی کی دو پیالیاں لئے لڑکھڑاتی ہوئی اندر آئی۔

"اوہو، فراؤ کارلیف، پیاری تم کتنی اچھی ہو!

"آخر تم اس مکان میں کیوں رہتی ہو؟" جب مکان کی مالکہ چلی گئی تو میں نے پوچھا "تمہیں تو اس سے کہیں اچھا کمرہ مل سکتا ہے۔"

"ہاں مل تو سکتا ہے۔"

"اچھا تو پھر تم کوئی اور کمرہ کیوں نہیں لے لیتیں؟"

"کچھ پتہ نہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ میں کاہل بہت ہوں۔"

"یہاں تمہیں کیا دینا پڑتا ہے؟"

"اسّی مارک ماہوار۔"

"اس میں ناشتہ شامل ہے یا نہیں؟"

"نہیں — میرا تو خیال ہے کہ نہیں۔"

"تمہارا خیال ہے کہ نہیں؟" میں نے سخت آواز میں زور سے کہا۔ "لیکن تمہیں تو ٹھیک طرح معلوم ہونا چاہیئے؟"

بیلی نے کان دبا کے میری بات سُن لی۔ "ہاں، بس میری حماقت ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ جب میرے پاس کچھ روپیہ ہوتا ہے تو میں بڑھیا کو دے دیتی ہوں۔ اس لئے اس کا

ٹھیک ٹھیک حساب لگانا مشکل ہے۔"

"لیکن سیلی، خدا کے لیے سوچو تو کہ میں ناشتے سمیت اپنے کمرے کے پچاس مارک ما۔ دیتا ہوں، اور وہ اس کمرے سے کہیں اچھا ہے!"

سیلی نے سر ہلایا لیکن معذرت خواہی کے انداز میں بولی، "ایک اور بات ہے، پیارے کرسٹفر۔ اگر میں فراؤ کاریف کو چھوڑ کے چلی گئی تو وہ بچاری کیا کرے گی۔ مجھے یقین ہے کہ اُسے کوئی اور کرائے دار نہیں مل سکتا۔ کوئی اور آدمی اُس کی شکل، اُس کی بدبو اور ریاکی باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ حال یہ ہے کہ اُس کے اُوپر تین مہینے کا کرایہ چڑھا ہُوا ہے اگر مکان دار کو معلوم ہو گیا کہ اب اُس کے پاس کرائے دار نہیں ہیں تو وہ اُسے گھر سے نکال دے گا۔ اور وہ کہتی ہے کہ اگر مجھے گھر سے نکال دیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔"

"بہرحال یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم اُس کے لئے خود کیوں تکلیف اٹھا رہی ہو۔"

"میں بالکل تکلیف نہیں اٹھا رہی ہوں۔ مجھے تو یہاں رہنا بہت پسند ہے۔ فراؤ کاریف اور میں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اُس کی حالت کم و بیش وہی ہے جو تیس سال میں میری ہو جائے گی۔ کوئی شریف قسم کی مکان والی تو مجھے ایک ہفتے میں اپنے مکان سے نکال دے گی۔"

"میری مکان والی تمہیں نہیں نکالے گی۔"

سیلی نے اپنی ناک اُوپر کو سکوڑ لی اور مبہم انداز سے مسکرا پڑی۔ "کہو، پیارے کرس، تمہیں کافی پسند ہے یا نہیں؟"

"مجھے تو فرٹز کی کافی سے زیادہ پسند ہے۔" میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

سیلی ہنسنے لگی۔ "فرٹز بڑا نفیس آدمی ہے، کیوں ہے نا؟ مجھے تو بہت پسند ہے۔ جب

وہ کہتا کہ مجھے ذرّہ بھر پروا نہیں، تو اُس کا انداز مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔"

"مجھے ذرّہ بھر پروا نہیں۔" میں نے فرٹز کی نقل اتارنے کی کوشش کی۔ ہم دونوں ہنسنے لگے۔ سیلی نے ایک اور سگرٹ جلالی۔ وہ برابر سگرٹ پیتی رہی تھی، میں نے دیکھا کہ لیمپ کی روشنی میں اُس کے ہاتھ بڑھیوں کے سے لگتے ہیں۔ ہاتھ بڑے دُبلے پتلے اور کمزور سے تھے اور اُن پر رگیں اُبھری ہوئی تھیں ـــــ بالکل جیسے کسی ادھیڑ عمر کی عورت کے ہاتھ ہوں۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہرے ناخون ان ہاتھوں کے نہیں ہیں، بلکہ اتفاقیہ یہاں آبیٹھے ہیں ـــــ جیسے چھوٹے چھوٹے سخت، چمکدار، بدصورت کیڑے۔" اس بات پہ بڑی ہنسی آتی ہے،" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ فرٹز اور میں کبھی ایک ساتھ نہیں سوئے۔" وہ تھوڑا سا رُکی، اور پھر بڑی دلچسپی سے پوچھا: "کیا تمہارا خیال تھا کہ ہم ساتھ سو چکے ہیں؟"

"ہاں ـــــ میں نے تو یہی سمجھا تھا۔"

"نہیں ہم نہیں سوئے۔ ایک دفعہ بھی نہیں....." اُس نے جمائی لی۔ "اور اب تو میں سمجھتی ہوں کہ ہم کبھی بھی ساتھ نہیں سوئیں گے۔"

ہم چند منٹ تک خاموشی سے سگرٹ پیتے رہے۔ پھر سیلی مجھے اپنے خاندان کا حال سنانے لگی۔ وہ لنکا شائر کے ایک کارخانے دار کی بیٹی تھی۔ اُس کی ماں کا نام مس بولز تھا، اور وہ کسی بڑے رئیس کی وارث تھی۔ چنانچہ جب اُس کی ماں کی شادی مسٹر جیکسن سے ہوئی تو دونوں نے اپنے نام ملا کے ایک کر لئے۔ "ابا بڑے جاہ پرست ہیں، حالانکہ اُن کا دعویٰ ہے کہ میں اس قسم کا نہیں ہوں۔ میرا اصلی نام جیکسن بولز ہے۔ لیکن میں تھیٹر میں اپنا یہ نام نہیں رکھ سکتی۔ لوگ سمجھیں گے کہ میں خبطی ہوں۔"

"شاید فرٹز نے تو مجھے یہ بتایا تھا کہ تمہاری ماں فرانسیسی تھیں ؟"

"نہیں، بالکل نہیں!" معلوم ہوتا تھا کہ سیلی چڑ گئی۔ "فرٹز تو احمق ہے۔ وہ ہمیشہ نئی نئی باتیں گھڑتا رہتا ہے۔"

سیلی کی ایک بہن بھی جس کا نام بیٹی تھا۔ "بالکل فرشتہ ہے مجھے اُس سے بڑی محبت ہے۔ ویسے تو وہ سترہ سال کی ہے، مگر ہے ابھی تک بے انتہا معصوم۔ اماں اُس کی اس طرح تربیت کر رہی ہیں کہ وہ بالکل دیہاتی قسم کی رہے۔ اگر بیٹی کو پتہ چل جائے کہ میں کیسی بے شرم رنڈی بن گئی ہوں تو وہ شرم کے مارے مرجائے۔ اُسے مردوں کے متعلق ذراسی بات بھی معلوم نہیں۔"

"لیکن تم دیہاتی قسم کی کیوں نہیں، سیلی؟"

"پتہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ابا کے اُوپر ہوں۔ تم اُن سے ملو تو تم انہیں بڑا پسند کروگے۔ انہیں کسی کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی۔ کاروبار کے معاملے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مہینے میں ایک دفعہ وہ شراب کے نشے میں بالکل دُھت ہوجاتے ہیں اور اماں کی ساری نیز طرار سہیلیوں کو ڈرا دیتے ہیں۔ اُنہوں نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ لندن جاؤ اور اداکاری سیکھو۔"

"غالباً تم نے بڑی کم عمر میں اسکول چھوڑ دیا تھا؟"

"ہاں۔ مجھے اسکول بڑا بُرا لگتا تھا۔ میں نے ایسی حرکت کی کہ مجھے اسکول سے نکال دیا گیا۔"

"کیوں، تم نے کیا کیا تھا؟"

"میں نے ہیڈ ماسٹرنی سے کہا کہ میرے بچّہ ہونے والا ہے۔"

"جھوٹ بول رہی ہو، سیلی، تم نے یہ نہیں کہا ہوگا!"

"سچ کہہ رہی ہوں، میں نے بالکل یہی بات کہی تھی! اس بات سے ایک ہُلّڑ مچ گیا۔ مجھے دیکھنے کے لئے ایک ڈاکٹر آیا، اور میرے والدین کو بلوایا گیا جب اُن لوگوں کو پتہ چلا کہ اس قسم کی کوئی بات بھی نہیں تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ ہیڈ ماسٹرنی نے کہا کہ جو لڑکی ایسا گندا خیال اپنے دل میں بھی لا سکتی ہے وہ اس قابل نہیں کہ اُسے اسکول میں رہنے دیا جائے، نہیں تو وہ دوسری لڑکیوں کو خراب کرے گی۔ چنانچہ جو میں چاہتی تھی وہی ہوا۔ اب میں نے ابا کو تنگ کرنا شروع کیا یہاں تک کہ انہیں یہ کہنا پڑا کہ اچھا تم لنڈن چلی جاؤ۔"

سیلی لنڈن جا کے دوسری طالب علم لڑکیوں کے ساتھ ہوسٹل میں رہی۔ حالانکہ وہاں نگرانی ہوتی تھی، مگر اُس نے کوئی ایسی ترکیب نکال لی تھی کہ وہ رات گئے تک نوجوان مردوں کے گھر رہا کرتی تھی۔ "جس آدمی نے پہلی مرتبہ میرے ساتھ ہم بستری کی اُسے یہ معلوم تک نہیں تھا کہ میں بالکل دوشیزہ ہوں، میں نے بعد میں اُسے بتایا۔ وہ بڑا بے نظیر آدمی تھا۔ مجھے اُس سے بڑی محبّت تھی۔ مذاقیہ پارٹ کرنے میں اُسے کمال حاصل تھا۔ ایک نہ ایک دن وہ ضرور بڑی زبردست شہرت پائے گا۔"

کچھ دن بعد سیلی کو فلموں میں ہجوم میں شامل ہونے کا کام ملنے لگا، اور آخر وہ ایک دورہ کرنے والی کمپنی میں کوئی چھوٹا سا پارٹ کرنے پر ملازم ہوگئی۔ اب اُس کی ملاقات ڈائنا سے ہوئی۔

"تم برلن میں کتنے دن اور رہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"خدا ہی جانے۔ لیڈی ونڈرمیئر میں میری ملازمت بس ایک ہفتہ اور ہے۔ یہ ملازمت مجھے ایک آدمی کے ذریعے ملی تھی جس سے میری ملاقات ایڈن بار میں ہوئی تھی۔ لیکن وہ اب

دیا نا چلا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اُدفا سٹوڈیو کو دوبارہ فون کرنا چاہئیے۔ ایک خبیث بڈھا یہودی ہے جو کبھی کبھی مجھے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ وعدہ کرتا رہتا ہے کہ تمہیں جگہ دلوا دوں گا، لیکن وہ سؤر بس میرے ساتھ سونا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس ملک کے آدمی بڑے بُرے ہیں۔ ان لوگوں میں سے کسی کے پاس بھی روپیہ نہیں ہے۔ اگر کہیں چاکلیٹ کا ایک ڈبہ دے دیتے ہیں تو یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمبستری کی اجازت مل جائے گی"

"جب تمہاری یہ ملازمت ختم ہو جائے گی تو پھر کیسے کام چلاؤ گی؟"

"کچھ روپیہ تو خیر گھر سے آجاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی اب زیادہ دن چلنے والی نہیں۔ اماں دھمکی دے چکی ہیں کہ اگر میں جلدی انگلستان واپس نہ پہنچ گئی تو وہ روپیہ بھیجنا بند کر دیں گی۔ .... وہ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہاں کسی سہیلی کے ساتھ ہوں۔ اگر اماں کو پتہ چل جائے کہ میں خود اپنا خرچ چلا رہی ہوں تو اُن کا فوراً دم نکل جائے۔ بہرحال، میں کسی نہ کسی طرح جلدی ہی اتنا روپیہ کما لوں گی کہ اپنا کام چلا سکوں۔ مجھے گھر سے روپیہ لینا پسند نہیں۔ آجکل کساد بازاری کی وجہ سے ابا کے کاروبار کا حال بہت پتلا ہے۔"

"سیلی، اگر کبھی تمہارے اُوپر کوئی مصیبت پڑے تو مجھے ضرور خبر کر دینا۔"

سیلی ہنسنے لگی: "کرس، تمہاری مہربانی ہے۔ مگر میں دوستوں کے ٹکڑوں پہ نہیں پلنا چاہتی"

"تو کیا فرٹز تمہارا دوست نہیں ہے؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ سیلی کو ذرا بھی بُرا نہیں لگا۔

"ہاں، مجھے فرٹز بے انتہا پسند ہے" اُس کے پاس روپیہ ڈھیروں ہے۔ نہ معلوم کیا بات ہے، لیکن جب لوگوں کے پاس روپیہ ہوتا ہے تو اُن کے بارے میں ہمارے جذبات بالکل مختلف ہوتے ہیں ــــ پتہ نہیں کیوں۔"

"اور تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میرے پاس بھی ڈھیروں روپیہ نہیں ہے ؟"

"تمہارے پاس ؟" سیلی قہقہہ مار کے ہنسنے لگی۔ "تمہیں دیکھتے ہی مجھے پتہ چل گیا تھا کہ تم روپیہ کی وجہ سے پریشان ہو!"

ایک دن تیسرے پہر کو سیلی میرے یہاں چائے پینے آئی۔ اُس دن فراؤلین شریڈر مارے جوش کے پاگل ہو رہی تھیں۔ اُنہوں نے اس موقع پر اپنا بہترین لباس پہنا تھا، اور بالوں میں لہریں ڈالی تھیں۔ جب باہر کی گھنٹی بجی تو انہوں نے بڑے ڈرامائی انداز میں دروازہ کھولا: "ہراِسی وُڈ،" انہوں نے میری طرف اس طرح آنکھ ماری جیسے ساری بات جانتی ہوں، اور بلند آواز سے اعلان کیا، "ایک خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں!"

پھر میں نے رسمی طور سے سیلی اور فراؤلین شریڈر کا تعارف کرایا۔ فراؤلین شریڈر مارے خوش اخلاقی کے بچھی جا رہی تھیں، اور اُسے بار بار "محترمہ" کہہ کر خطاب کر رہی تھیں۔ سیلی سر پہ ایک طرف کو اپنی خادموں والی ٹوپی اوڑھے، بڑی شائستگی سے صوفے پر بیٹھی تھی اور اپنی نقرئی ہنسی ہنس رہی تھی۔ فراؤلین شریڈر اُس کے گرد منڈلا رہی تھیں، اور اپنے تعریف و تحیر کے جذبات ذرا نہیں چھپا رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے سیلی جیسی عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ جب وہ چائے لائیں تو پیسٹری کے غیر اشتہا انگیز زرد زرد ٹکڑوں کے بجائے پلیٹ میں مُربّے دار کیک ستارے کی شکل میں سجے ہوئے تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ فراؤلین شریڈر نے ہمیں کاغذ کے دو رومال بھی کپڑوں پر ڈالنے کے لئے دیئے ہیں، ان رومالوں کے کناروں پر سوراخ تھے جن سے بیل سی بن گئی تھی (بعد میں جب میں نے اُن کے انتظامات کی تعریف کی تو انہوں نے بتایا کہ جب ہر ربٹ مانسٹر اپنی منگیتر کو چائے پر بُلاتے

تھے تو وہ ہمیشہ کاغذ کے رومال استعمال کیا کرتی تھیں۔" ہاں، ہر اسی وُو۔ آپ مجھ پر اعتماد رکھئے! مجھے معلوم ہے کہ نوجوان خواتین کس بات سے خوش ہوتی ہیں!"

"میں تمہارے صوفے پر لیٹ جاؤں، پیارے؟" جب ہم اکیلے رہ گئے تو سیلی نے فوراً پوچھا۔

"نہیں، ایسا مت کرنا۔"

سیلی نے ٹوپی اُتار لی، اپنے مخمل کے چھوٹے چھوٹے جوتوں سمیت پیر صوفے کے اوپر رکھ لئے، اپنا بٹوہ کھولا اور پاؤڈر لگانے لگی: "میں بے طرح تھک رہی ہوں۔ کل رات میری آنکھ تک نہیں جھپکی۔ میرا نیا عاشق بڑا بے نظیر ہے۔"

میں چائے اُنڈیلنے لگا۔ سیلی نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا: "کرسٹفر پیارے، جب میں ایسی باتیں کرتی ہوں تو تمہیں صدمہ تو نہیں پہنچتا؟"

"نہیں، ذرا بھی نہیں۔"

"لیکن تمہیں یہ باتیں پسند نہیں؟"

"میرا ان باتوں سے کیا مطلب۔" میں نے اُسے چائے کا گلاس دیا۔

"تمہیں خدا کا واسطہ!" سیلی نے چیخ کے کہا۔ "انگریزوں کی سی باتیں مت شروع کرو! تم کیا سوچتے ہو، کیا نہیں، اس بات سے تمہیں مطلب کیسے نہیں ہے!"

"اچھا، تم جاننا ہی چاہتی ہو تو سُنو، اس سے مجھے اکتاہٹ ہوتی ہے۔"

یہ بات اُسے اتنی بُری لگی کہ اتنا تو میں چاہتا بھی نہیں تھا۔ اُس کا لہجہ بدل گیا۔ اُس نے سرد مہری سے کہا: "میرا تو خیال تھا کہ تم بات سمجھتے ہو گے۔" اُس نے ٹھنڈا سا سانس لیا۔ "لیکن میں بھولتی ہوں ——— تم مرد ہو۔"

"مجھے بڑا افسوس ہے، سیلی۔ اب میں مرد ہوں تو یہ میرے اختیار میں تھوڑی ہے۔
لیکن مجھ سے خفا مت ہو۔ میرا مطلب تو صرف یہ تھا کہ جب تم اس طرح کی باتیں کہتی ہو تو اس کا اصلی سبب یہ ہوتا ہے کہ تم اعصابی مزاج ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم فطری طور پر غیر لوگوں کے سامنے شرماتی ہو، چنانچہ تم نے لاشعوری طور سے یہ ترکیب نکالی ہے کہ انہیں زبردستی تمہیں پسند یا ناپسند کرنے پر مجبور کر دیتی ہو۔ میں یہ بات اس وجہ سے جانتا ہوں کہ میں خود بھی کبھی کبھی اس پر عمل کرتا ہوں .... بس میں اتنا چاہتا ہوں کہ تم یہ ترکیب مجھ پر نہ آزماؤ کیونکہ اول تو اس سے کوئی فائدہ نہیں، اور دوسرے میں اس سے بالکل گڑبڑا جاتا ہوں۔ اگر تم برلن کے ہر آدمی کے ساتھ سوؤ اور ہر دفعہ آکے مجھے بتاؤ تو بھی مجھے یقین نہیں دلا سکو گی کہ تم "کیمیلیا کے پھولوں والی خاتون" کی ہیروئن ہو، کیونکہ درحقیقت تم ایسی ہو ہی نہیں۔"

"نہیں.... میرا خیال ہے کہ میں ایسی نہیں ہوں —" سیلی نے بڑی احتیاط سے اپنی آواز کو غیر شخصی بنا لیا تھا۔ اُسے اس گفتگو میں بڑا مزا آنے لگا تھا۔ میں ایک نئے طریقے سے اُس کی چاپلوسی کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ "تو پھر میں ہوں کیا، کرسٹفر پیارے؟ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

"تم مسٹر اور مسز جیکسن بولز کی بیٹی ہو۔"

سیلی اپنی چائے کے گھونٹ لینے لگی۔ "ہاں.... میں سمجھ گئی تمہارا کیا مطلب ہے.... شاید تم ٹھیک کہتے ہو.... اچھا تو کیا تمہارا خیال ہے کہ مجھے عاشق بالکل نہیں بنانے چاہئیں؟"

"نہیں، میں تو نہیں کہتا۔ جب تک تم سمجھتی ہو کہ تمہیں اس میں مزا آتا ہے تمہیں یہ حرکت نہیں چھوڑنی چاہیئے۔"

"ہاں،" سیلی نے ذرا رُک کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "میں محبت کو اپنے کام میں بالکل

فل نہیں ہونے دوں گی۔ کام ہر چیز سے پہلے ہے..... لیکن میرا خیال ہے کہ کوئی عورت
س وقت تک بڑی ایکٹریس نہیں بن سکتی جب تک کہ اُس نے ایک آدھ دفعہ عشق نہ کیا
ہو ـــ" وہ یکایک بیچ میں رُک گئی۔ "کس بات پہ ہنس رہے ہو، کرس؟"

"میں تو نہیں ہنس رہا۔"

"تم ہمیشہ میرے اُوپر ہنستے رہتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں دنیا میں سب سے زیادہ بیوقوف ہوں؟"

"نہیں، سیلی۔ میں تو تمہیں بالکل بے وقوف نہیں سمجھتا۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ میں ہنس رہا
تھا۔ جو لوگ مجھے پسند ہیں اُن پر ہنسنے کو اکثر میرا جی چاہا کرتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔"

"اچھا تو تم مجھے پسند کرتے ہو، پیارے کرسٹفر؟"

"ہاں میں تمہیں پسند کرتا ہوں، سیلی۔ تم کیا سمجھتی تھیں؟"

"لیکن تم مجھ پر عاشق تو نہیں ہو، کیوں ہو؟"

"نہیں۔ میں تم پر عاشق نہیں ہوں۔"

"اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ جب پہلی مرتبہ ہماری ملاقات ہوئی ہے اُسی وقت
ے میرا جی چاہ رہا ہے کہ تم مجھے پسند کرو۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم میرے اُوپر عاشق نہیں
، کیونکہ نہ معلوم کیا وجہ ہے، میں تمہارے اوپر عاشق نہیں ہو سکتی ـــ اس لیے اگر تم عاشق
ہو جاتے تو معاملہ بگڑ جاتا۔"

"اچھا، تب تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔"

"ہاں، بہت....." سیلی ہچکچا رہی تھی۔ "میں تمہارے سامنے ایک بات کا اعتراف
نا چاہتی ہوں، کرس پیارے.... پتہ نہیں تم سمجھ جاؤ گے یا نہیں۔"

ایسے خوبصورت ہاتھ پیر تھے! شکل ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ بہترین گھرانے کی ہوگی..... ہر اسی وُو
آپ سے امید نہیں تھی کہ ایسی عورت آپ کی دوست ہوگی! آپ تو بڑے خاموش رہتے ہیں۔"

"ہاں، فراؤلین شریڈر، اکثر خاموش لوگ ہی ——"

وہ اپنے مخصوص طریقے سے چیخ کے ہنس پڑیں، اور اپنی چھوٹی ٹانگوں پہ آگے پیچھے ہلنے لگیں:

"بالکل ٹھیک، ہر اسی وُود! بالکل ٹھیک!"

نئے سال کی شام کو سیلی فراؤلین شریڈر کے یہاں رہنے کے لئے آگئی۔

یہ سارے انتظامات بالکل آخری وقت ہوئے تھے۔ میری بار بار کی تنبیہوں سے سیلی کے شبہات اور بڑھ گئے تھے، اور اُس نے فراؤ کارپف کو بے ایمانی کرتے اور بے ڈھنگے پن سے روپیہ اُڑاتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ چنانچہ اُس نے جی کڑا کر کے نوٹس دے دیا تھا۔ اُسے فراؤلین کوسٹ والا کمرہ ملا ۔ فراؤلین شریڈر کو بے انتہا خوشی تھی۔ ہم نے نئے سال کی شام کا کھانا گھر پہ ہی کھایا؛ کھانے میں فراؤلین شریڈر، فراؤلین میئر، سیلی، بوبی، ٹرونکا کا ایک اور ملازم، اور میں شامل تھے۔ دعوت بڑی کامیاب رہی۔ بوبی کی خطا معاف ہو چکی تھی، اور اُسے پھر فراؤلین شریڈر کی عنایت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ اُن سے بڑی جرأت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ فراؤلین میئر اور سیلی ایسے باتیں کر رہی تھیں جیسے ایک بڑا فن کار دوسرے سے کرتا ہے۔ اُن میں اس بات پہ بحث ہو رہی تھی کہ انگلستان میں موسیقی گھروں کے کام کے امکانات کیا ہیں۔ سیلی بڑے چونکا دینے والے جھوٹ بول رہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت اُسے خود بھی ان پر آدھا یقین آگیا ہے۔ چنانچہ اُس نے بتایا کہ ہم لنڈن کے پلیڈیم اور

اور کولی زیئم میں گا چکی ہوں۔ فراؤلین میئر نے اس سے بھی بڑھ کے گپ ہانکی، اور یہ کہانی سنائی کہ اُسے میونخ میں پُرجوش طالب علموں نے گاڑی میں بٹھا کے کس طرح سڑکوں پہ کھینچا تھا۔ اس کے بعد سیلی نے فراؤلین میئر کو بڑی جلدی گانے پہ راضی کر لیا۔ سستی شراب پینے کے بعد یہ گانا میرے مزاج کے ایسا موافق ثابت ہوا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ بار بار دُہرائے جانے والے مصرعوں اور کان پھاڑنے والی آخری تان میں ہم سب بھی شریک ہو جاتے تھے۔ پھر سیلی نے ایک انگریزی گانا ایسے ڈوب کے گایا کہ بوبی کے ساتھی نے گانے کو اپنے سے متعلق کر لیا، اور سیلی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ بوبی نے اُسے روکا، اور سختی سے سے یاد دلایا کہ کام پہ چلنے کا وقت آ گیا۔

سیلی اور میں اُس کے ساتھ ٹروڈکا گئے۔ جہاں ہمیں فرٹز ملا۔ اُس کے ساتھ کلاؤس لنکے تھا، جب سیلی لیڈی ونڈرمیئر میں گاتی تھی تو یہی نوجوان اُس کے ساتھ پیانو بجایا کرتا تھا۔ اس کے بعد فرٹز اور میں اکیلے چل کھڑے ہوئے۔ فرٹز کچھ افسردہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اُس نے مجھے بتا کے نہیں دیا کہ آخر کیوں کچھ لڑکیاں ہوا جیسے باریک پردے کے پیچھے کلاسیکی قسم کا رقص دکھا رہی تھیں۔ پھر ہم ایک بہت بڑے رقص گھر میں پہنچے جہاں میزوں پہ ٹیلیفون رکھے تھے۔ وہی معمولی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں: "معاف کیجئے گا، مادام، آپ کی آواز سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ بہت دلکش ہیں، آپ کا رنگ گورا اور پلکیں لمبی لمبی اور سیاہ ہیں —— بالکل میری طرح۔ مجھے کیسے پتہ چلا؟ اوہو، یہ تو میرا راز ہے! ہاں۔ ٹھیک ہے۔ میں لمبے قد کا خوب سرخ۔ چوڑے کندھوں والا فوجی شکل کا آدمی ہوں۔ میرے چھوٹی چھوٹی مونچھیں ہیں .... آپ کو یقین نہیں آیا؟ آئیے خود دیکھ لیجئے!" لوگ ایک دوسرے کی کمر پہ ہاتھ رکھے ناچ رہے تھے، منھ سے منھ بھڑائے چیختے جا رہے تھے اور پسینے میں

شرابور تھے۔ بویریا کے لباس میں ملبوس سازندے کھانس رہے تھے اور شراب پی رہے تھے اور ان کے پسینے تک سے بیئر کی بو آ رہی تھی، کمرے میں ایسی بدبو پھیلی ہوئی تھی جیسے چڑیا گھر میں۔ اس کے بعد شاید میں اکیلا چل دیا اور گھنٹوں کاغذ کی جھنڈیوں کے جنگل میں گھومتا رہا۔ اگلے دن صبح کو جب میں جاگا تو بستر پہ جھنڈیاں ہی جھنڈیاں تھیں۔

مجھے اٹھ کر کپڑے بدلے ہوئے بھی کافی دیر ہو چکی تھی جب سیلی گھر واپس آئی۔ وہ سیدھی میرے کمرے میں پہنچی۔ سیلی بہت تھکی ہوئی تھی لیکن اپنے آپ سے بہت خوش معلوم ہو رہی تھی۔

"ہیلو، ڈارلنگ! کیا وقت ہو گا؟"

"کوئی لنچ کا وقت ہو گا۔"

"کیا واقعی؟ بہت نفیس! میں بھوک کے مارے مری جا رہی ہوں۔ ناشتے میں مجھے بس کافی کی ایک پیالی ملی تھی......" وہ اس طرح رک گئی جیسے کسی بات کی توقع کر رہی ہو، اور میرے اگلے سوال کا انتظار کرنے لگی۔

"کہاں رہیں؟" میں نے پوچھا۔

"لیکن، پیارے" سیلی نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔ "میں تو سمجھتی تھی کہ تمہیں معلوم ہے!"

"مجھے بالکل پتہ نہیں۔"

"بالکل جھوٹ!"

"واقعی سیلی مجھے بالکل نہیں معلوم۔"

"کرسٹفر پیارے، اتنا جھوٹ کیوں بول رہے ہو! صاف ظاہر تھا کہ ساری ترکیب تمہاری ہی ہے! تم نے فرٹز کو خوب ٹلایا —— وہ بڑا ناراض معلوم ہوتا ہے! کلاؤس کی

اور میری ہنستے ہنستے بُری حالت ہوگئی۔"

بہرحال وہ کچھ بے چین سی تھی۔ میں نے اُسے پہلی مرتبہ شرم سے سُرخ ہوتے ہوئے دیکھا

"تمہارے پاس سگرٹ ہے، کرِس؟"

میں نے اُسے ایک سگرٹ دے دی اور دیا سلائی جلائی۔ اُس نے دھوئیں کا ایک بہت بڑا بادل بنایا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس جا پہنچی:

"میں اُس پہ بے طرح عاشق ہوں۔"

وہ تیوری پہ ہلکے سے بل ڈال کے مڑی اور صوفے پہ جاکے بڑی احتیاط سے مڑتڑ کے بیٹھ گئی، اور اپنے ہاتھ پیروں کو قاعدے سے رکھ لیا: "کم سے کم میرا خیال ہے کہ میں عاشق ہوں" وہ بولی۔

اُس کے جذبات کے احترام میں سوال پوچھنے سے پہلے میں رُکا: "اور کلاؤس بھی تم پہ عاشق ہے؟"

"وہ تو مجھ پر بالکل فریفتہ ہے۔" سیلی بہت سنجیدہ تھی۔ وہ کئی منٹ تک سگرٹ پیتی رہی

"وہ کہتا ہے کہ لیڈی ونڈرمیئر میں جب ہم پہلی مرتبہ ملے تھے اُسی دن وہ مجھ پہ عاشق ہوگیا تھا۔ لیکن جب تک ہم ایک ساتھ کام کرتے رہے اُس کی ہمّت نہیں پڑی کہ مجھ سے کچھ کہے۔ وہ ڈرتا تھا کہ اس سے کہیں میرا گانا خراب ہوجائے.... وہ کہتا ہے کہ مجھ سے ملنے سے پہلے اُسے بالکل پتہ نہیں تھا کہ عورت کا جسم کتنا خوبصورت اور حیرت انگیز ہوتا ہے: اس سے پہلے اُس کی زندگی میں صرف تین عورتیں آئی ہیں...."

میں نے سگرٹ جلالی۔

"کرِس، میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک طرح سمجھ نہیں سکتے.... یہ بات بیان کرنا بڑا مشکل ہے۔"

"ہاں، یقیناً۔"

"میں چار بجے اُس سے پھر مل رہی ہوں۔" سیلی کے لہجے میں تھوڑی سی سرکشی تھی۔

"یہ بات ہے تو تھوڑا سا سو لو۔ میں فراؤلین شریڈر سے کہہ کے تمہارے لئے دو چار انڈے تلوا دوں گا۔ اور اگر وہ ابھی تک نشے میں دھت ہیں تو پھر میں خود تل دوں گا۔ تم جا کے بستر پہ لیٹو۔ میں انڈے وہیں لے آؤں گا، وہیں کھا لینا۔"

"شکریہ، کرس پیارے۔ تم تو فرشتے ہو۔" سیلی نے جمائی لی "تم نہ ہو تو میرا کام کیسے چلے۔"

اس کے بعد سیلی اور کلاؤس ایک دوسرے سے روز ملنے لگے۔ عام طور پر ان کی ملاقات ہمارے گھر میں ہوا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ تو کلاؤس ساری رات ہی رہا۔ فراؤلین شریڈر نے مجھ سے اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہا، لیکن اُن کے چہرے سے ظاہر تھا کہ انہیں دھچکا سا لگا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ کلاؤس کو پسند نہ کرتی ہوں۔ وہ تو بلکہ اُسے بڑا دلکش سمجھتی تھیں۔ لیکن وہ سیلی کو میری ملکیت خیال کرتی تھیں۔ اور یہ دیکھ کر انہیں بڑا صدمہ ہوتا تھا کہ میں چپ چاپ کان دبائے ایک طرف کھڑا ہوں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے اس واقعے کا علم نہ ہوتا اور سیلی مجھے دھوکا دے رہی ہوتی تو فراؤلین شریڈر بڑی خوشی سے اس سازش میں مدد دیتیں۔

کلاؤس اور میں ایک دوسرے سے کچھ شرماتے تھے۔ جب کبھی زینے پر ہماری مڈبھیڑ ہو جاتی تو ہم دشمنوں کی طرح سرد مہری سے سلام کرتے۔

جنوری کے وسط میں کلاؤس یکایک انگلستان چلا گیا۔ بغیر کسی توقع کے اُسے فلموں میں موسیقی بھرنے کا کام مل گیا؛ جگہ بڑی اچھی تھی جس دن وہ تیسرے پہر کو رخصت ہونے آیا تو مکان میں بالکل اسپتال کی سی فضا چھائی ہوئی تھی جیسے سیلی کو کوئی خطرناک آپریشن کرا رہی ہو۔ فراؤلین شریڈر اور فراؤلین میئر نشست گاہ میں بیٹھی تھیں اور پتّے پھیلا رکھے تھے۔ فراؤلین شریڈر نے بعد میں مجھے یقین دلایا کہ اس سے اچّھا شگون نہیں ہو سکتا تھا چڑیا کا اٹھا تین دفعہ آیا تھا، اور اُس کے ساتھ والے پتّے بھی ہر دفعہ بہت اچھے تھے۔

سیلی اگلے دن صبح سے شام تک اپنے کمرے میں صوفے پر مُڑی تڑی بیٹھی رہی اور گود میں پنسل اور کاغذ رکھّا رہا۔ وہ نظمیں لکھ رہی تھی، مگر مجھے دیکھنے نہیں دیتی تھی۔ وہ سگرٹوں پر سگرٹیں پیئے چلی جا رہی تھی اور انڈوں میں چٹنی ملا کے پی رہی تھی۔ فراؤلین شریڈر نے آملیٹ لا کر دیا تو اُس نے دو چار نوالے کھائے مگر پھر انکار کر دیا۔

"تمہارے لیئے کوئی چیز لاؤں سیلی؟"

"نہیں، شکریہ، کرس پیارے۔ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ میں اپنے آپ کو بڑا عجیب و غریب اور ہوا کی طرح لطیف سمجھ رہی ہوں، جیسے میں کوئی زبردست ولی یا ایسی ہی کوئی چیز ہوں۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں کیسی عجیب باتیں محسوس کر رہی ہوں ۔۔۔ نوچا کلیٹ کھاؤ، پیارے؟ کلاؤس نے مجھے تین ڈبّے دیئے تھے۔ اگر میں نے زیادہ کھائے تو میں بیمار پڑ جاؤں گی۔"

"شکریہ"

"میرا خیال ہے کہ میں اُس سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔ شادی سے ہمارے پیشوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ سمجھے، کرسٹفر، اُسے مجھ سے اتنی محبّت ہے کہ میرا ہر وقت اُس کے ساتھ

سائے کی طرح رہنا اُس کے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔"

"جب تم دونوں مشہور ہو جاؤ تو اُس وقت شادی کر سکتی ہو۔"

یسلی نے اس پر غور کیا:

"نہیں، . . . . اِس سے تو معاملہ بالکل بگڑ جائے گا۔ پھر تو ہماری کوشش یہ رہے گی کہ ہم ویسے ہی رہیں جیسے پہلے تھے۔ سمجھے نامیرا کیا مطلب ہے۔ اور ہم دونوں ہوں گے بالکل مختلف . . . . وہ بالکل ایسا تھا جیسے قدیم زمانے کے انسان ـــــ جیسے کوئی جنگل کا دیوتا۔ اُس کی وجہ سے مجھے یہ محسوس ہونے لگتا تھا جیسے میں جنگل کی پری ہوں یا کوئی ایسی چیز ہوں جو دنیا سے کوسوں دور جنگل میں رہتی ہو۔"

کلاؤس کا پہلا خط ٹھیک وقت پر آ پہنچا۔ ہم سب اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ فراؤلین شریڈر نے مجھے بہت ہی سویرے جگا کے بتایا کہ خط آ گیا ہے۔ شاید اُنہیں یہ ڈر تھا کہ انہیں خط پڑھنے کا موقع نہیں ملے گا۔ چنانچہ وہ مجھ پر بھروسا کر رہی تھیں کہ میں انہیں بتا دوں گا خط میں کیا لکھا ہے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو اُن کا ڈر بے بنیاد تھا۔ یسلی نے اپنا خط فراؤلین شریڈر، فراؤلین میئر، بوبی کو اور مجھے دکھایا بلکہ جب دربان کی بیوی کرایہ لینے اُوپر آئی تو اُس کی موجودگی میں خط کے بعض حصّے بلند آواز سے پڑھ کر سنائے۔

شروع ہی سے خط نے میرے منہ میں کسیلا کسیلا سا مزا پیدا کر دیا تھا۔ اُس کا سارا لب و لہجہ خود پرستانہ اور سرپرستی کا انداز لئے ہوئے تھا۔ کلاؤس نے لکھا تھا کہ مجھے لندن پسند نہیں آیا۔ وہ بڑی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ کھانا اُسے موافق نہیں آیا تھا۔ اسٹوڈیو کے لوگ اس سے بڑی بے اعتنائی سے پیش آتے تھے۔ اُس کی خواہش تھی کہ یسلی بھی اُس کے ساتھ ہوتی؛

اُس سے کلاؤس کو بہت مدد ملتی. لیکن اب وہ انگلستان پہنچ ہی گیا تھا. چنانچہ اس کا ارادہ تھا جیسے بھی بنے گزارے، خوب محنت کرے اور روپیہ کمائے. اُس نے سیلی کو بھی محنت کرنے کا مشورہ دیا تھا، اور لکھا تھا کہ کام کرنے سے تم خوش رہو گی اور تمہارا غم غلط ہو گا. خط کے آخر میں کچھ پیار کی باتیں تھیں. لیکن یہ باتیں بڑی استادی سے لکھی گئی تھیں. اُنہیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ اُس نے یہ باتیں پہلے بہت دفعہ لکھی ہیں.

بہرحال سلی بہت خوش تھی. کلاؤس کے مشورے نے اُس پر ایسا اثر کیا کہ اُس نے فوراً کئی فلم کمپنیوں، ایک تھیئٹر کی ایجنسی اور آدھے درجن "کاروباری" ملاقاتیوں کو فون کیا. یہ تو ٹھیک ہے کہ ان سب باتوں کا کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوا، لیکن اگلے چوبیس گھنٹوں میں اُس کی امیدیں بڑی بلند رہیں. اُس نے مجھے بتایا کہ خواب میں بھی اُسے اقرارنامے اور ہزاروں کے چیک نظر آئے: "میں بڑی حیرت انگیز باتیں محسوس کر رہی ہوں، کرِس. مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں اب بہت ترقی کرنے والی ہوں اور دنیا کی سب سے شاندار ایکٹرس بننے والی ہوں."

اس کے ایک ہفتے بعد ایک دن صبح کو جو میں سیلی کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ وہ ہاتھ میں خط لئے بیٹھی ہے. میں نے کلاؤس کا خط فوراً پہچان لیا.

"گڈ مورننگ، کرِس ڈارلنگ."

"گڈ مورننگ، سیلی."

"کیسی نیند آئی؟" اُس کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوشش کر کے مسرور بن رہی ہے، اور یہ دکھانا چاہتی ہے کہ میرا دل بات چیت کرنے کو چاہ رہا ہے.

"بہت اچھی، شکریہ۔ تمہیں کیسے نیند آئی؟"

"اچھی خاصی آئی.... موسم بڑا گندا ہے، کیوں ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے کھڑکی کے پاس جا کے دیکھا۔ واقعی موسم بڑا خراب تھا۔

وہ اس طرح مسکرائی جیسے گفتگو جاری رکھنا چاہتی ہو: "تمہیں معلوم ہے کہ اس سؤر نے وہاں جا کے کیا کیا ہے؟"

"کون سے سؤر نے؟" میں ایسی آسانی سے پکڑ میں آنے والا نہیں تھا۔

"اوہو، کرس! خدا کے لئے، ایسے احمق مت بنو!"

"معاف کرنا۔ آج صبح نہ معلوم کیا ہو رہا ہے کہ میں بات ذرا دیر میں سمجھ رہا ہوں۔"

"مجھ سے اتنا جھنجھٹ نہیں ہوگا، پیارے، کہ میں ساری بات سمجھاؤں۔" سیلی نے خط میری طرف بڑھا دیا۔ "لو، اسے پڑھ لو۔ ذرا دیدہ تو دیکھو! زور سے پڑھو، سنوں تو کیسا لگتا ہے۔"

"میری بچاری پیاری سی بچی" خط اس طرح شروع ہوتا تھا۔ کلاؤس نے خط میں سمجھایا تھا کہ وہ سیلی کو بچاری پیاری سی بچی کیوں کہہ رہا ہے۔ اُسے ڈر تھا کہ جو بات وہ کہنے والا ہے اُس سے سیلی کو بڑا رنج ہوگا۔ بہرحال کہنا تو ضروری تھا: وہ یہ بتانے پر مجبور تھا کہ اُس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ سیلی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اُس نے یہ فیصلہ آسانی سے کر لیا ہوگا۔ اُسے تو بڑی مشکل پڑی تھی اور بڑا دکھ پہنچا تھا۔ بہرحال، اُسے علم تھا کہ وہ صحیح راستے پر ہے مختصر یہ کہ اب اُن دونوں کا علیحدہ ہو جانا لازمی تھا۔

کلاؤس نے لکھا تھا: اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ میرا رویہ بڑا خود غرضانہ تھا۔ مجھے صرف اپنے مزے کا خیال تھا۔ لیکن میں اب یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ تمہارے اُوپر میرا بہت

بڑا اثر پڑا ہے۔ میری جان، تم میرے اُوپر بہت زیادہ فریفتہ رہی ہو۔ اگر ہم ایک ساتھ رہیں گے تو تمہارے اندر نہ تو قوّتِ ارادی رہ جائے گی نہ تمہاری کوئی ذاتی رائے ہو گی۔" اس کے بعد کلاڈس نے سیلی کو نصیحت کی کہ اپنے کام کے لئے زندہ رہو۔" کام ہی وہ چیز ہے جو واقعی اہم ہے ــــ خود میں نے یہی بات دریافت کی ہے۔" اُسے بڑی فکر تھی کہ سیلی کہیں ضرورت سے زیادہ رنج نہ کرے۔ "بہادری سے کام لو، میری پیاری بچّی۔"

خط کے آخر میں بات بالکل صاف ہو گئی:

"یہاں ایک لیڈی کلائن ہیں جو انگلستان کے طبقۂ امرا کی سربرآوردہ ہستیوں میں سے ہیں۔ چند دن ہوئے رات کو اُن کے یہاں دعوت میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک بڑی خوبصورت اور ذہین نوجوان انگریز لڑکی سے ہوئی جس کا نام مس گور ایکٹرسلی ہے۔ وہ ایک انگریز نواب کی رشتہ دار ہے جس کا نام میں نے ٹھیک طرح سنا نہیں ــــ شاید تم سمجھ جاؤ کہ میرا مطلب کس سے ہے۔ اس کے بعد سے ہم دو دفعہ مل چکے ہیں، اور بہت سی باتوں کے متعلق ہماری بڑی عجیب و غریب گفتگو ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے آج تک کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جو میرے دماغ کو اتنی اچھی طرح سمجھتی ہو جیسے وہ سمجھتی ہے ــــ"

"یہ ایک نئی چڑھائی،" سیلی نے بات کاٹتے ہوئے تلخی سے کہا، اور چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ "مجھے کبھی شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ اس شخص کے پاس دماغ بھی ہے۔"

اس وقت فراؤلین شر ٹیڈر نے اندر آ کے سلسلۂ کلام منقطع کر دیا۔ وہ رازوں کی تلاش میں سیلی سے یہ پوچھنے آئی تھیں کہ نہاؤ گی یا نہیں۔ میں اُن دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کے چلا آیا کہ اس موقع سے خوب فائدہ اٹھا لیں۔

"مجھے اُس احمق پر غصہ بھی تو نہیں آتا،" سیلی نے اُسی دن کچھ دیر بعد کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہلتے اور زور زور سے سگرٹ پیتے ہوئے کہا: "مجھے تو اُس کے اوپر ایسے افسوس ہوتا ہے جیسے اُس کی ماں کو ہوتا. لیکن اگر وہ اسی طرح اِن عورتوں کے پیچھے دیوانہ رہا تو اُس کے کام کا کیا حشر ہوگا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا."

اُس نے ایک دفعہ اور کمرے کا چکّر لگایا:

"اگر وہ کسی عورت سے باقاعدہ عشق لڑا رہا ہوتا، اور مجھے بہت دن بعد پتا تا تو شاید مجھے زیادہ رنج ہوتا. لیکن یہ لڑکی! میرا تو خیال ہے کہ وہ اس کی معشوقہ تک نہیں ہے"

"ظاہر میں یہی معلوم ہوتا ہے،" میں نے تائید کی. "بولو انڈے چٹنی ملا کے پیتی ہو یا نہیں؟"

"تم بڑے بے نظیر آدمی ہو، کرس! تم ہمیشہ بالکل ٹھیک بات سوچتے ہو. جی چاہتا ہے کہ تمہارے اُوپر عاشق ہو جاؤں. کلاؤس تو تمہاری چھنگلیا کے برابر بھی نہیں ہے."

"ہاں، واقعی نہیں ہے."

"ذرا اُس کی دیدہ دلیری تو دیکھو!" سیلی نے انڈے پی کر اُوپر کا ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا. "کہتا ہے کہ میں اُس پر فریفتہ تھی!..... لیکن خرابی تو یہی ہے کہ میں واقعی فریفتہ تھی!"

اُس روز شام کو جو میں اُس کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ سامنے کاغذ اور قلم رکھے بیٹھی ہے:

"میں اُسے لاکھوں خط لکھ چکی ہوں اور سب پھاڑ پھاڑ کے پھینک دیتی ہوں."

"بالکل ٹھیک ہے، کرس پیارے۔" سیلی نے اپنے چھوٹے سے رومال کے کونے سے آنکھیں پونچھیں۔ "فکر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، یا ہے؟"

"کوئی بھی فائدہ نہیں۔"

"اب میں بہت بڑی ایکٹرس بنوں گی۔ ذرا اُسے دکھاؤں تو!"

"یہی چاہیئے!"

ہم ایک چھوٹے سے سنیما میں گئے جہاں فلم میں ایک لڑکی کا قصہ دکھایا جا رہا تھا جس نے اپنی محبت، گھر بار اور بچوں کی خاطر تھیئٹر کی کامیاب زندگی کو قربان کر دیا تھا۔ ہمیں اتنی ہنسی آئی کہ ہم فلم ختم ہونے سے پہلے ہی چلے آئے۔

"اب تو میری طبیعت پہلے سے بہت ہلکی ہے۔" سیلی نے راستے میں کہا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"شاید مجھے اُس سے پوری محبت نہیں تھی۔ . . . تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔"

"مجھے اکثر یہ خیال ہوا ہے کہ مجھے فلاں آدمی سے محبت ہو گئی ہے اور پھر بعد میں پتہ چلا کہ نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس دفعہ،" سیلی کی آواز میں تاسف تھا، "اب کی دفعہ تو مجھے بالکل یقین تھا۔ . . . لیکن اب تو نہ معلوم کیا بات ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہر چیز کچھ گڈ مڈ ہو گئی ہے۔ . . . ."

"شاید تمہیں صدمہ بہت پہنچا ہے۔" میں نے تجویز پیش کی۔

سیلی کو یہ خیال بہت پسند آیا۔ "شاید ایسا ہی ہے! . . . . کرس، تم عورتوں کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہو۔ آج تک کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو تم سے بہتر سمجھتا ہو۔ . . . . مجھے

یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن تم کوئی عجیب و غریب ناول ضرور لکھو گے جو لاکھوں کی تعداد میں بکے گا۔"

"سیلی، تمہارا شکریہ کہ تمہیں مجھ پر اتنا یقین ہے!"

"کیا تمہیں بھی مجھ پر یقین ہے، کرس؟"

"ہاں، ہے۔"

"نہیں، سچ سچ بتاؤ۔"

"ہاں، مجھے پورا پورا یقین ہے کہ تم کسی نہ کسی چیز میں بہت زبردست کامیابی حاصل کرو گی، البتہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس چیز میں۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو تم بڑی آسانی سے کر سکتی ہو، بس کوشش شرط ہے۔ کیوں، نہیں کر سکتیں؟"

میرا خیال ہے، کر تو سکتی ہوں۔" سیلی کچھ سوچنے لگی۔ کم سے کم مجھے بعض وقت محسوس تو یہی ہوتا ہے۔۔۔۔ اور بعض وقت مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی مصرف ہی کی نہیں ہوں۔۔۔۔ دیکھو نا میں مہینے بھر کسی آدمی کو وفادار نہیں رکھ سکتی۔"

"او ہو، سیلی، یہ باتیں پھر مت شروع کر دو!"

"اچھا، کرس، چلو نہیں شروع کرتے۔ آؤ چل کے کچھ پئیں۔"

اس کے بعد کئی ہفتے تک سیلی اور میں زیادہ تر ساتھ ساتھ ہی رہتے تھے۔ وہ بڑے نیم روشن کمرے میں صوفے پر گٹھری بنی بیٹھی رہتی تھی، سگریٹیں اور انڈوں میں چینی ملا کے پیتی جاتی تھی، اور لگاتار مستقبل کے بارے میں باتیں کرتی رہتی تھی۔ جب موسم اچھا ہوتا اور مجھے پڑھانے نہ جانا ہوتا، تو ہم ٹہلتے ہوئے وٹن برگ پلاٹس تک چلے جاتے

اور دھوپ میں بینچ پر بیٹھ جاتے ، اور آتے جاتے لوگوں پر تبصرہ کیا کرتے....
سیلی اپنی زرد ٹوپی اور سمور کا شکستہ حال کوٹ پہنے رہتی تھی جو کسی بڈھے خارش زدہ کتے کی کھال کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ ہر آدمی اُس کی طرف بڑے غور سے دیکھتا تھا۔

وہ یہ بات بہت کہا کرتی تھی: "اگر لوگوں کو یہ پتہ چل جائے کہ ہم دونوں آوارہ گرد بہت مشہور ہونے والے ہیں، ایک تو بڑا حیرت انگیز ناول نویس بنے گا اور دوسری دنیا کی سب سے بڑی ایکٹرس، تو وہ کیا کہیں گے۔"

"شاید انہیں بڑا تعجب ہوگا۔"

"میرا خیال ہے کہ جب ہم اپنی نفیس موٹروں میں چلا کریں گے تو یہ زمانہ یاد آیا کریگا اور ہم سوچا کریں گے کہ چاہے کچھ ہو، اُس زمانے میں بھی اچھی دل لگی رہی!"

"ہاں، اچھی خاصی دل لگی رہے اگر وہ موٹر ہمیں ابھی مل جائے۔"

ہم دولت، شہرت، سیلی کے بڑے بڑے معاہدوں اور جو ناول میں لکھنے والا تھا اُن کی رکارڈ توڑ دینے والی بکری کے متعلق لگاتار باتیں کرتے رہتے تھے۔ سیلی کہتی، "ناول نویس ہونا بھی بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ تم بے انتہا خوابوں میں ڈوبے رہتے ہو۔ تم میں عمل کی صلاحیت نہیں، نہ کاروبار کا سلیقہ ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ تمہیں جتنا چاہیں بڑی آسانی سے لُوٹ سکتے ہیں، اور پھر تم بیٹھ کے اُن کے بارے میں ایک کتاب لکھ ڈالو گے جس سے اُنہیں پتہ چلے گا کہ وہ کیسے بدمعاش ہیں، اور یہ کتاب بے انتہا کامیاب ہوگی، اور تم لاکھوں روپے کما لو گے۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ میرے ساتھ اصلی خرابی یہ ہے کہ میں ایسا زیادہ خوابوں میں نہیں ڈوبا رہتا...."

مجھے کوئی ایسا عاشق مل جاتا جو واقعی مالدار ہوتا. خیر، دیکھو..... مجھے بس تین ہزار سالانہ ایک مکان اور ایک عمدہ سی کار چاہیئے. اس وقت تو میں مالدار ہونے کے لیئے ہر کام کرنے کو تیار ہوں. اگر آدمی مالدار ہو تو اچھے سے معاہدے کا انتظار کر سکتا ہے؛ پھر یہ مجبوری نہیں رہتی کہ جتنے پیسوں کی ملازمت بھی ملتی ہو فوراً منظور کر لی جاتے... جو آدمی مجھے داشتہ بنا کے رکھے گا میں اُس سے پوری وفاداری برتوں گی ——"

سیلی ایسی باتیں بڑی سنجیدگی سے کہتی تھی، اور غالباً اُسے یقین تھا کہ اُس کا واقعی یہی مطلب ہے. اُس کے دماغ کی حالت عجیب ہو رہی تھی، وہ بڑی بے کل اور اعصاب زدہ سی ہو رہی تھی. اکثر وہ بغیر کسی خاص سبب کے بگڑ اُٹھتی تھی. کام ڈھونڈھنے کے بارے میں برابر باتیں کرتی رہتی تھی مگر اس کے لیئے ذرا بھی کوشش نہیں کرتی تھی. ابھی تک اُس کے گھر سے روپیہ آنا بند نہیں ہؤا تھا اور آج کل ہم بہت کم روپیہ خرچ کر رہے تھے. کیونکہ سیلی کا جی شام کو باہر جانے اور لوگوں سے ملنے ہی کو نہیں چاہتا تھا. ایک مرتبہ فرٹز چلا آیا. میں انہیں اکیلا چھوڑ کے چلا گیا اور جا کے خط لکھنے لگا. جب میں واپس آیا تو فرٹز جا چکا تھا اور سیلی رو رہی تھی.

"اس آدمی سے مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے!" وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی. "مجھے اُس سے نفرت ہے. جی چاہتا ہے اُسے مار ڈالوں!"

لیکن دو چار منٹ ہی میں وہ پھر اچھی خاصی ہو گئی. میں نے سیلی کا مخصوص جام تیار کرنا شروع کر دیا، یعنی چٹنی اور انڈے. سیلی صوفے پر مڑی تڑی بیٹھی تھی اور تفکر میں ڈوبی ہوئی سگرٹ پی رہی تھی.

"میں یہ سوچ رہی ہوں،" وہ اچانک بولی، "کہ میرے بچہ تو نہیں ہونے والا."

" خدایا!" میرے ہاتھ سے گلاس گرتے گرتے رہ گیا۔ " کیا واقعی تمہیں ایسا معلوم ہو رہا ہے؟"

" پتہ نہیں۔ میرے متعلق تو ٹھیک طرح بتانا مشکل ہے۔ میں ہوں ہی اتنی بے ڈھنگی .... بعض وقت میری طبیعت گری گری رہتی ہے۔ شاید کوئی الٹی سیدھی چیز کھانے کی وجہ سے ہو....."

" لیکن کسی ڈاکٹر کو دکھا دو!"

" ہاں چاہیئے تو۔" سیلی نے بدمزگی سے جمائی لی۔" ایسی جلدی نہیں ہے۔"

" ہاں جلدی تو ہے ہی! تمہیں جا کے ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا!"

" ہوش میں آؤ کرس، یہ تم حکم کس پہ چلا رہے ہو؟ اس سے تو اچھا تھا کہ میں نے تمہیں بتایا ہی نہ ہوتا!" سیلی کے آنسو پھر نکلنے والے ہو رہے تھے۔

" اچھا، خیر! کوئی بات نہیں ہے!" میں نے اُسے جلدی سے تسلّی دینے کی کوشش کی۔" جیسا جی چاہے کرو۔ کوئی میرا معاملہ تھوڑی ہے۔"

" معاف کرنا پیارے۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ خواہ مخواہ بدتمیزی سے جواب دوں۔ صبح کو دیکھوں گی کہ طبیعت کیسی رہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑے گا۔"

مگر وہ گئی نہیں۔ بہرحال اگلے دن وہ بہت شگفتہ معلوم ہو رہی تھی۔" چلو، کرس، آج شام کو تو کہیں باہر چلیں۔ یہ کمرہ تو مجھے پھاڑے کھاتا ہے۔ چلو، کہیں ٹہلنے ٹہلانے چلیں!"

" اچھا، چلو، سیلی۔ بولو کہاں چلنی ہو؟"

"چلو، ٹروٹکا چلیں، وہاں احمق بوبی سے باتیں کریں گے۔ کیا خبر وہ ہمیں ایک آدھ جام پلا ہی دے!"

بوبی نے ہمیں کچھ نہیں پلایا، لیکن سیلی کی تجویز بہت اچھی ثابت ہوئی۔ کیونکہ کلاؤ سے ہماری بات چیت پہلی دفعہ ٹروٹکا کے شراب خانے ہی میں ہوئی۔

اس کے بعد ہم تقریباً لگاتار اُس کے ساتھ رہنے لگے، یا تو ہم تینوں ایک ساتھ ہوتے ورنہ ہم دونوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا۔ کلاؤ نے ہمیں بتایا کہ وہ ناشتے سے پہلے وسکی کی آدھی بوتل پیتا ہے، اور اُس بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ وہ اکثر ہمیں بتایا کرتا تھا کہ میں اتنی شراب کیوں پیتا ہوں—— اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بڑا غمزدہ تھا۔ لیکن وہ اتنا غم زدہ کیوں تھا، اس کا مجھے کبھی پتہ نہیں چلا، کیونکہ سیلی ہمیشہ بیچ میں بات کاٹ دیتی تھی، کبھی کہتی کہ باہر چلنے کا وقت آگیا، کبھی کہتی اب اگلی جگہ چلو یا سگرٹ پیو یا وسکی کا گلاس پیو، غرض بات بیچ ہی میں رہ جاتی۔ وہ بھی اتنی ہی وسکی پی رہی تھی جتنی کلاؤ پیتا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اُسے نشہ ہی نہیں چڑھتا، البتہ کبھی کبھی اُس کی آنکھیں بڑی خوفناک نظر آنے لگتی تھیں جیسے انہیں اُبالا گیا ہو۔ اُس کے چہرے پر سُرخی اور پاؤڈر کی تہہ روز موٹی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

کلاؤ لمبا تڑنگا، ذرا بھاری سے رومن قسم کے چہرے کا وجیہہ آدمی تھا، اور اب کچھ موٹا ہوتا جا رہا تھا۔ اُس کے چہرے کا انداز کچھ افسردگی اور امریکیوں کی سی ابہامی کیفیت لئے ہوئے تھا جو ہمیشہ بہت دلکش معلوم ہوتی ہے، خاص طور سے اُس آدمی کے چہرے پر جس کے پاس روپیہ بہت ہو۔ وہ اُداس، مبہم اور کھویا کھویا سا تھا۔ اُسے اپنا وقت

مزے کے ساتھ گزارنے کی ہلکی سی بے چینی تھی، مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ بات حاصل کیسے ہو معلوم ہوتا تھا کہ وہ کبھی ٹھیک طرح بتا ہی نہیں سکتا کہ اُسے مزا آ بھی رہا ہے یا نہیں، ہم جو کچھ کر رہے ہیں اُس میں واقعی کوئی تفریحِ طبع کا سامان ہے یا یوں ہی۔ اُس کے لئے لازمی تھا کہ کوئی اُسے برابر یقین دلاتا رہے۔ کیا یہی ہے وہ اصلی چیز؟ کیا تفننِ طبع کا یہی طریقہ ہے اور اس میں اتنا ہی مزا آتا ہے؟ یہی ہے؟ ہاں، ہاں، اس میں تو مزا آیا ہی — بہت نفیس! بہت خوب! ہا، ہا، ہا! وہ اس طریقے سے ہنسنے لگتا تھا جیسے کوئی بڑی عمر کا اسکول میں پڑھنے والا لڑکا؛ اُس کی ہنسی بار بار گونجتی، ایسی معلوم ہونے لگتی جیسے زبردستی ہنسا جا رہا ہو، اور پھر یکایک استفسار اور ذہنی الجھن کا اظہار کرتی ہوئی ختم ہو جاتی۔ وہ ہماری مدد کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ چاہے وہ ہم سے مدد کا طلب گار ہی رہتا ہو مگر بعض وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے انداز میں ایک عجیب وغریب اور شرارت آمیز طعن ہے۔ اُس کی ہمارے بارے میں آخر کیا رائے تھی؟

ہر روز صبح کو کلاؤ کرائے کی موٹر بھیج کر ہمیں اس ہوٹل میں بلواتا تھا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈرائیور ہمیشہ اپنے ساتھ بڑا نفیس گلدستہ لاتا تھا جو کسی بہت ہی بڑھیا دکان سے خریدا جاتا تھا ایک دن صبح کو مجھے پڑھانا تھا، چنانچہ میں نے سیلی سے طے کر لیا کہ میں اُن لوگوں سے بعد میں آملوں گا۔ جب میں ہوٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ کلاؤ اور سیلی صبح سویرے ہی ہوائی جہاز سے ڈریسڈن چلے گئے ہیں۔ کلاؤ ایک پرچہ چھوڑ گیا تھا جس میں اُس نے بڑی معافی مانگی تھی اور اُس کے مہمان کی حیثیت سے مجھے ہوٹل میں اکیلے کھانا کھا لینے کی دعوت دی تھی، لیکن میں نے کھانا نہیں کھایا۔ میں ویٹر کی آنکھوں کی اُس مخصوص چمک سے ڈرتا تھا۔ شام کو

جب کلاڈ اور سیلی لوٹے تو کلاڈ میرے لئے ایک تحفہ لایا تھا۔ یہ ریشم کی چھ قمیصوں کا بنڈل تھا۔ سیلی نے میرے کان میں کہا، "وہ تمہارے لئے سونے کا سگرٹ کیس خریدنا چاہتا تھا، لیکن میں نے اُس سے کہا کہ قمیصیں اچھی رہیں گی۔ تمہاری قمیصوں کی بڑی بُری حالت ہے ..... پھر ہمیں ذرا بھی احتیاط برتنا چاہیئے۔ کبھی وہ یہ نہ سمجھے کہ ہم اُسے لوٹنا چاہتے ہیں"
میں نے یہ تحفہ شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ کلاڈ نے ہماری عادتیں بالکل خراب کر دی تھیں۔ یہ بات طے سی ہو گئی تھی کہ وہ سیلی کو روپیہ دے گا تاکہ وہ اسٹیج پر کام شروع کر سکے۔ وہ اس کے بارے میں اکثر باتیں کیا کرتا تھا اور بہت ہی شریفانہ انداز میں گویا یہ کوئی بہت ہی معمولی بات تھی اور بغیر کسی شور و شر کے دوستوں کے درمیان بڑے اطمینان سے طے ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ موضوع چھیڑنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کی توجہ پھر کسی اور طرف بھٹک جاتی ــــ اُس کے خیالات اتنی ہی آسانی سے راستہ گم کر دیتے تھے جیسے کسی بچے کے خیالات۔ بعض دفعہ سیلی کو اپنی جھنجلاہٹ اور بے چینی ضبط کرنے میں بڑی دقّت ہوتی تھی۔ وہ میرے کان میں کہتی "تھوڑی دیر کے لئے ہمیں ذرا اکیلا چھوڑ دو، چھوڑ دو پیارے۔ کلاڈ اور میں کچھ کاروباری باتیں کریں گے" لیکن چاہے سیلی اُسے اصلی بات کی طرف لانے کی کتنی ہی ہوشیاری سے کوشش کیوں نہ کرے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتی تھی۔ جب میں آدھ گھنٹے بعد اُن لوگوں کے پاس واپس پہنچتا تو دیکھتا کہ کلاڈ مسکرا رہا ہے اور وسکی پی رہا ہے، اور سیلی بھی اپنی جھنجلاہٹ چھپانے کے لئے مسکرا رہی ہے۔

"کلاڈ مجھے بہت پسند ہے۔" جب کبھی ہم دونوں اکیلے ہوتے تو سیلی مجھ سے بار بار بڑے مرعوب اور متین لہجے میں کہا کرتی۔ اُسے اس بات پر بڑا گہرا اور پختہ یقین

تھا۔ یہ بات اُس کے لئے کسی نئے اختیار کئے ہوئے مذہب کے بنیادی عقیدے کی طرح تھی ـــــ سیلی کو کلا تو بہت پسند ہے کبھی لکھ پتی کو پسند کرنا بھی بڑا اہم اور سنجیدہ کام ہے۔ سیلی کے چہرے پر خفیشٹر کی راہبہ کی سی بے خودی اور سرمستی طاری ہونے لگی، اور یہ کیفیت بڑی جلدی جلدی پیدا ہونے لگی۔ اور واقعی جب کلاؤ کسی بے حیا پیشہ ور فقیر کو اپنے دلکش اور مبہم انداز میں بیس مارک کا نوٹ دے دیتا تو ہم ایک دوسرے کی طرف بڑی مرعوب نظروں سے دیکھتے۔ اتنے روپیئے کی بربادی سے ہمارے اوپر بڑا رعب پڑتا تھا، اور یہ بات ہمیں ایک قسم کا معجزہ معلوم ہوتی تھی یا کوئی ایسی چیز جس کا حکم براہِ راست خدا سے ملا ہو۔

آخر ایک ایسا دن بھی آیا کہ جب کلاؤ معمول سے زیادہ سنجیدہ معلوم ہونے لگا۔ اُس نے منصوبے باندھنے شروع کر دیئے۔ دو چار دن میں ہم تینوں ہمیشہ کے لئے برلن سے چلے جائیں گے۔ ریل گاڑی ہمیں ایتھنز لے جائے گی۔ وہاں سے ہم ہوائی جہاز کے ذریعے مصر جائیں گے۔ مصر سے مارسے ای۔ مارسے ای سے دخانی جہاز کے ذریعے جنوبی امریکہ۔ پھر تاہی ٹی، سنگاپور، جاپان۔ کلاؤ یہ نام اس طرح لے رہا تھا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو اور یہ سب جگہیں بھی کسی ریلوے لائن کے اسٹیشن ہیں۔ وہ یہ سب جگہیں دیکھ چکا تھا اور ان سب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس کی خشک اور بے مزا اکتاہٹ نے آہستہ آہستہ اس مضحکہ خیز گفتگو میں حقیقت کا رنگ بھر دیا۔ اس میں جھوٹ ہی کیا تھا، وہ یہ ساری باتیں کر ہی سکتا تھا۔ مجھے بڑی سنجیدگی سے یقین آگیا کہ وہ یہی کرنا چاہتا ہے۔ اپنی دولت کے ایک اشارے سے وہ ہماری ساری زندگی بدل

سکتا تھا.

اب ہمارا کیا ہوگا ؟ ایک مرتبہ چل پڑے تو پھر ہم کبھی نہیں پلٹیں گے. ہم اُس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑ سکتے. سِبلی تو اُس سے شادی کرلے گی. میری حیثیت کچھ مبہم سی ہوگی. میں ایک طرح کا پرائیویٹ سکرٹری ہوں گا جس کے کوئی فرائض نہیں ہوں گے. میرا مستقبل بجلی کی طرح میری آنکھوں کے سامنے کوند گیا، اور میں نے دیکھا کہ اب سے دس سال بعد میں فلالین کا پتلون اور سفید و سیاہ دو رنگ کے جوتے پہنے ہوں گا، میرا چہرہ کچھ بھاری اور چمکدار ہو گیا ہوگا، اور میں کیلی فورنیا کے کسی ہوٹل کی نشست گاہ میں بیٹھا شراب اُنڈیل رہا ہوں گا.

"آؤ ذرا یہ جنازہ تو دیکھیں،" کلاتو کہہ رہا تھا.

"کیسا جنازہ، پیارے ؟" سِبلی نے بڑے ضبط کے ساتھ پوچھا. یہ ایک بالکل نئی قسم کی چیز تھی جس نے ہماری کاروباری باتوں کا سلسلہ درہم برہم کر دیا تھا.

"ارے، تم لوگوں نے دیکھا تک نہیں!" کلاتو ہنسنے لگا. "بڑا شاندار جنازہ ہے گھنٹے بھر سے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے."

ہم تینوں کلاتو کے کمرے کے چھجے پر پہنچے. واقعی ساری سڑک آدمیوں سے بھری ہوئی تھی. یہ لوگ ہرمان میولر کو دفن کرنے جا رہے تھے. جنازہ کے ساتھ زرد چہروں والے مستقل مزاج کلرکوں، سرکاری ملازموں، ٹریڈ یونینوں کے سکرٹریوں کی قطاریں کی قطاریں غرضکہ سماجی جمہوریت پسند جماعت کا پورا بے رنگ اور تھکا ماندہ جلوس کا جلوس اپنی جھنڈیوں کے سائے میں برانڈن بورگر ٹور کی سیاہ محرابوں کی طرف جا رہا تھا جس پر لمبی لمبی کالی جھنڈیاں شام کی ہوا میں ہلکے ہلکے ہل رہی تھیں.

"تھا کون آدمی یہ؟" کلاؤ نے نیچے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "معلوم ہوتا ہے آدمی تھا کوئی بڑا زور دار؟"

"خدا ہی جانے،" سیلی نے جمائی لیتے ہوئے جواب دیا۔ "اِدھر دیکھو، کلاؤ پیارے سورج ڈوب رہا ہے۔ کیسا نفیس منظر ہے، کیوں ہے نا؟"

سیلی واقعی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ سڑک پر چلتے ہوئے جرمنوں، یا تابوت میں لیٹے ہوئے مردہ آدمی، یا جھنڈوں پر لکھے ہوئے الفاظ سے ہمیں کوئی مطلب نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا کہ چند دن کے اندر دنیا کی آبادی کے ننانوے فی صدی حصّے سے، اُن مردوں اور عورتوں سے جو اپنی روزی خود کماتے ہیں، جو اپنی زندگیوں کا بیمہ کراتے ہیں، جنہیں اپنے اولاد کے مستقبل کی فکر کھائے جاتی ہے، ان سب لوگوں سے ہمارا رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ شاید ازمنۂ وسطیٰ میں جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اپنی رُوح شیطان کے ہاتھ بیچ دی ہے، اسی طرح محسوس کیا کرتے تھے۔ یہ ایک عجیب و غریب، فرحت بخش اور خاصی خوشگوار سنسنی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ میں ایک ہلکا سا ڈر بھی محسوس کر رہا تھا۔ میں دل میں کہنے لگا کہ ہاں، جو بات نہ کرنے کی تھی وہ میں نے کر لی، اب میرا خاتمہ ہے۔

اگلے دن صبح کو ہم حسبِ معمول اُسی وقت ہوٹل پہنچے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ دربان ہمیں بڑے عجیب طریقے سے دیکھ رہا ہے۔

"آپ کس سے ملنا چاہتی ہیں حضور؟"

یہ سوال ایسا غیر معمولی معلوم ہوا کہ ہم دونوں ہنس پڑے۔

"کیوں، وہی ۳۶۵ سے،" سیلی نے جواب دیا۔ "تم کس سے سمجھے؟ تم ابھی

تک ہمیں پہچانتے نہیں ؟"

"اُن سے تو، حضور، آپ نہیں مل سکتیں۔ ۳۶۵ میں جو صاحب تھے وہ تو آج صبح سویرے چلے گئے۔"

"چلے گئے ؟ تمہارا مطلب ہے کہ آج دن بھر کے لئے گئے ہیں ؟ بڑی عجیب بات ہے! کس وقت واپس آئیں گے ؟"

"واپس آنے کو تو انہوں نے کچھ کہا نہیں، حضور۔ وہ بوڑا پسٹ گئے ہیں۔"

ہم کھڑے دربان کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اتنے میں ایک خادم ایک خط لئے دوڑا ہوا اُوپر آیا۔

"پیاری سیلی اور کرس،" خط میں لکھا تھا، "میں اس کم بخت شہر میں زیادہ دن نہیں رہ سکتا، بس اب میں چلا۔ امید ہے کہ تم سے کبھی نہ کبھی ملاقات ہوگی، کلاؤ۔"

" (یہ نوٹ اس لئے ہیں کہ شاید میں کچھ بھول گیا ہوں۔)"

لفافے میں تین سو مارک کے نوٹ تھے۔ یہ نوٹ، مرجھاتے ہوئے پھول، سیلی کے چار جوڑے جوتے اور دو ہیٹ (جو ڈرلیسڈن میں خریدے گئے تھے) اور میری چھ قمیصیں، کلاؤ کے آنے سے ہمارا مجموعی فائدہ بس اتنا ہوا تھا۔ پہلے تو سیلی کو بڑا غصہ آیا۔ پھر ہم دونوں ہنسنے لگے:

"کرس، میرا تو خیال ہے کہ ہم روپیہ اینٹھنے کے معاملے میں کچھ ایسے زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ کیوں، پیارے، تمہاری کیا رائے ہے ؟"

ہم سارے دن اس بات پر بحث کرتے رہے کہ کلاؤ جو اس طرح یکایک چلا گیا تھا کہیں یہ پہلے سے سوچی سمجھی ہوئی چال تو نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ ایسی بات نہیں ہو سکتی

میرا تخیل تو یہی بتاتا تھا کہ وہ ہر نئے گروہ کو اسی طرح چھوڑتا ہے۔ مجھے اُس سے بہت کافی ہمدردی تھی۔

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس روپیہ کا کیا کیا جائے۔ بیلی نے فیصلہ کیا کہ ڈھائی سو مارک تو نئے کپڑے خریدنے کے لئے الگ رکھ دیئے جائیں، اور پچاس مارک آج شام کو ہی اُڑا ڈالیں۔

لیکن پچاس مارک اڑانے میں ہمیں اتنا مزہ نہیں آیا جتنا ہم سمجھے تھے۔ بیلی کی طبیعت کچھ خراب تھی، اور ہم نے جو نفیس کھانا منگایا تھا وہ اُسے نہیں کھا سکی۔ ہم دونوں کچھ مضمحل سے تھے۔

"کرس، اب تو مجھے یہ خیال پیدا ہو چلا ہے کہ مرد مجھے ہمیشہ اسی طرح چھوڑ چھاڑ کے جاتے رہیں گے۔ جتنا زیادہ اس کے بارے میں سوچتی ہوں اُتنے ہی زیادہ مرد یاد آتے ہیں جو مجھے، چھوڑ کے چل دیئے۔ واقعی بڑی ہولناک بات ہے۔"

"میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا، بیلی۔"

"سچ کہہ رہے ہو پیارے؟..... میں واقعی سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں، میں سمجھتی ہوں کہ میں کچھ "مثالی عورت" قسم کی چیز ہوں؛ سمجھتے ہو نا کہ میرا مطلب کیا ہے؟ میں اس قسم کی عورت ہوں جو مردوں کو اپنی بیویوں سے جدا کر سکتی ہے، لیکن میں کسی کو زیادہ دن اپنے پاس نہیں رکھ سکتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس قسم کی واقع ہوئی ہوں کہ جب تک وہ مجھے حاصل نہ کر لے ہر آدمی سمجھتا ہے کہ اُسے میری خواہش ہے، اور بعد میں اُسے پتہ چلتا ہے کہ درحقیقت اُسے میری خواہش نہیں ہے۔"

"لیکن تم بدصورت اور نیک دل ہونے کے بجائے ایسا ہی رہنا زیادہ پسند کرو گی؛

کیوں، کیا خیال ہے؟"

"..... میں نے کلاؤ سے جیسا برتاؤ کیا ہے اُس سے تو جی چاہتا ہے کہ اپنے کھینچ کے لات ماروں۔ مجھے روپیہ کے معاملے میں اُسے اتنا پریشان نہیں کرنا چاہیئے تھا جیسا میں نے کیا۔ شاید اُس نے یہی سمجھا کہ میں بھی اوروں کی طرح معمولی رنڈی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں مجھے ایک طرح اُس سے بڑی محبت ہے..... اگر میں اُس سے شادی کرلیتی تو واقعی اُسے انسان بنادیتی۔ میں اُس سے شراب بالکل چھڑوا دیتی۔"

"تم نے اُس کے سامنے مثال ہی ایسی اچھی پیش کی تھی" ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"اس سوّر کو کم سے کم اتنا تو چاہیئے ہی تھا کہ میرے لئے ایک معقول قسم کا چیک چھوڑ جاتا۔"

"کوئی پروا نہیں ہے، پیاری۔ اُس کے بھائی اور بہت سے ملیں گے۔"

"مجھے ذرا بھی پروا نہیں ہے،" سیلی نے کہا، "میں اس رنڈی کے کام سے بالکل تھک گئی ہوں۔ اب تو میں کسی روپیہ والے آدمی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھوں گی بھی نہیں۔"

اگلے دن صبح کو سیلی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ ہم دونوں نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ سب شراب کی کرامت ہے۔ وہ دن چڑھے تک بستر پہ لیٹی رہی، اور جب اُٹھی تو بے ہوش ہوگئی۔ میں نے اُس سے کہا کہ فوراً ڈاکٹر کے پاس جاؤ، مگر وہ کسی طرح مانی ہی نہیں۔ چائے کے وقت وہ پھر بے ہوش ہوگئی اور بعد میں اُس کی حالت ایسی خراب نظر آئی کہ فراؤلین شرؤڈر اور میں نے اُس سے پوچھے بغیر ڈاکٹر کو بلوا بھیجا۔

ڈاکٹر آیا تو بہت دیر تک ٹھیرا۔ فراؤلین شرنڈیر اور میں نشست گاہ میں بیٹھے انتظار کرتے رہے کہ دیکھیں کیا تشخیص کرتا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ وہ یکایک بڑی تیزی سے نکلا، اور ہمیں سلام کرنے کے لئے کمرے میں جھانکا تک نہیں، سیدھا چلا گیا۔ میں فوراً سیلی کے کمرے میں گیا۔ سیلی بستر پہ تکیہ لگائے بیٹھی تھی، اور اُس کے چہرے پہ ایک طعن آمیز سی ہنسی جم کے رہ گئی تھی:

"سُنا، کرسٹفر پیارے، میں خوب احمق بنی۔"

"کیا مطلب؟"

سیلی نے ہنسنے کی کوشش کی: "وہ کہتا ہے کہ میرے بچہ ہونے والا ہے۔"

"خدایا!"

"اتنے گھبراؤ مت، پیارے! مجھے تو اس کی تھوڑی بہت امید تھی ہی۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ کلاؤس ہے؟"

"ہاں۔"

"اب اس معاملے میں تم کیا کرو گی؟"

"بچہ نہیں ہونے دوں گی۔" سیلی نے سگرٹ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں احمقوں کی طرح بیٹھا اپنے جوتوں کو گھورتا رہا۔

"کیا ڈاکٹر....."

"نہیں، وہ تو تیار نہیں ہے۔ میں نے اُس سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ اُسے بڑا دھکّا لگا۔ میں نے کہا، 'جناب عالی، اگر یہ بدنصیب بچہ پیدا ہو گیا تو آپ کے خیال میں اس کا حشر کیا ہو گا؟ کیا میری شکل سے معلوم ہوتا ہے کہ میں اچھی ماں ثابت ہوں گی؟"

"اُس نے کیا جواب دیا؟"

"اُس کا خیال تھا کہ یہ بات بالکل غیر ضروری اور دور از کار ہے۔ اُسے تو بس ایک بات کی فکر ہے، اپنی پیشہ ورانہ شہرت کی۔"

"اچھا تو اب ہمیں کوئی ایسا آدمی ڈھونڈنا چاہیئے جس کی کوئی پیشہ ورانہ شہرت نہ ہو۔ بس اتنی بات ہے۔"

سیلی نے کہا، "میں سمجھتی ہوں کہ ہم فراؤلین شریڈر سے پوچھیں تو بہتر ہو گا۔"

چنانچہ فراؤلین شریڈر سے مشورہ لیا گیا۔ انہوں نے یہ خبر بڑی دلجمعی سے سُنی۔ وہ ذرا چوکنی تو ہوئیں، لیکن باتیں انہوں نے سب عملی قسم کی بتائیں، ہاں وہ ایک آدمی سے واقف تھیں۔ ایک مرتبہ ایک سہیلی کی سہیلی کو مشکل پیش آئی تھی۔ ڈاکٹر پوری طرح سند یافتہ تھا، اور اپنے کام میں بڑا ہوشیار تھا۔ بس دقت تھی تو یہ کہ شاید وہ ذرا مہنگا پڑے۔

"خدا کا شکر ہے،" سیلی نے خوش ہوتے ہوئے کہا، "ابھی اُس سوّر کلائو کا سارا روپیہ خرچ نہیں ہوا!"

"میں سمجھتا ہوں کہ کلاؤس کو چاہیئے ——"

"سنو، کرس۔ میں صاف صاف کہے دیتی ہوں، اگر میں نے تمہیں کلاؤس کو اس بات کے متعلق خط لکھتے ہوئے پکڑ لیا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی اور نہ تم سے کبھی بولوں گی!"

"اچھا..... میں نہیں لکھوں گا۔ میں تو صرف ایک تجویز پیش کر رہا تھا، اس سے زیادہ میرا کچھ مطلب نہیں تھا۔"

مجھے ڈاکٹر پسند نہیں آیا۔ وہ سیلی کے بازو کو تھپ تھپاتا رہا اور چٹکیاں کاٹتا رہا، اور

اُس کا ہاتھ مسلتا رہا۔ بہرحال اس کام کے لئے وہ بالکل ٹھیک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ اُس کے ذاتی زچّہ خانے میں جگہ خالی ہوتے ہی سیلی وہاں چلی جائے گی۔ ہر بات بالکل سرکاری طور سے اور کھلّم کھلّا ہو رہی تھی۔ اس لمبے قد اور چست و چالاک ڈاکٹر نے دو چار چمکیلے جملوں سے سارا اشتباہ دور کر دیا، اور اس حرکت کے غیر قانونی ہونے کا شائبہ تک باقی نہ رہا۔ اُس نے بتایا کہ سیلی کی صحت کے پیشِ نظر وہ بچے کی پیدائش کے خطرات بالکل برداشت نہیں کر سکتی تھی؛ اُس نے اس قسم کی سند دینے کا وعدہ کر لیا۔ یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ اس سند پر بہت روپیہ خرچ ہو گا۔ اسی طرح زچّہ خانے اور آپریشن پر بھی۔ ڈاکٹر کوئی انتظام کرنے سے پہلے چاہتا تھا کہ ہم اسے ڈھائی سو مارک دے دیں۔ آخر ہم اُسے دو سو مارک تک لے آئے۔ سیلی نے مجھے بعد میں بتایا کہ وہ پچاس مارک شب خوابی کے نئے لباس خریدنے کے لئے رکھنا چاہتی تھی۔

آخر بہار کا موسم آگیا۔ چائے خانے سڑک کے کنارے لکڑی کے چبوترے بنوا رہے تھے، اور آئس کریم کی دکانیں کھلنے لگی تھیں جن کے اُوپر دھنک جیسے رنگوں کے پہیئے لگے ہوئے تھے۔ ہم کھلی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کے زچّے خانے گئے۔ موسم بہت حسین تھا اس وجہ سے سیلی کی طبیعت بڑی ہلکی تھی، کئی ہفتوں سے میں نے اُسے اتنی اچھی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ لیکن فراؤلین شرِیڈر بالکل روہانسی ہو رہی تھیں، حالانکہ وہ بڑی بہادری سے مسکرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ "ڈاکٹر یہودی تو نہیں ہے؟" فراؤلین مئیر نے سخت لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "کسی گندے یہودی کو سیلی کے قریب بھی نہ آنے دینا۔ یہ لوگ ہمیشہ اسی قسم کے کام کیا کرتے ہیں، بڑے جانور ہوتے ہیں!"

سِلی کو بڑا نفیس، صاف ستھرا اور روشنی دار کمرہ ملا جس میں آ گئے چھجّا بھی تھا۔ میں شام کو پھر سِلی کے پاس گیا، وہ بستر پہ لیٹی تھی، اور اُس نے چہرے پہ پاؤڈر یا سُرخی کچھ نہیں لگا رکھا تھا۔ اس حالت میں اُس کی عمر کئی سال کم نظر آتی تھی، اور وہ بالکل چھوٹی سی لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

"ملوڈ ڈارلنگ..... ابھی ان لوگوں نے مجھے قتل تو نہیں کیا۔ لیکن اپنی سی کوشش ضرور کرتے رہے ہیں..... یہ عجیب بے ہنگم جگہ ہے، کیوں ہے نا؟..... جی چاہتا ہے کہ وہ سُوئر کلاؤس مجھے یہاں دیکھتا..... اُس کے "دماغ" کو نہ سمجھ سکنے کا یہ نتیجہ نکلا ہے۔"

اُسے ہلکا سا بخار تھا، اور وہ بہت ہنس رہی تھی۔ ایک نرس یوں ہی ایک لمحے کو اندر آئی جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہو اور پھر فوراً باہر چلی گئی۔

"یہ تمہیں ایک نظر دیکھنے کو مری جا رہی تھی،" سِلی نے تشریح کی۔ "میں نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ تمہیں بچّے کے باپ ہو۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں، پیارے؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ یہ تو اور الٹی تعریف کی بات ہے۔"

"اس سے بات ذرا سیدھی سادی ہو جاتی ہے، ورنہ اگر کوئی باپ نہ ہو تو لوگ اسے بڑا عجیب سمجھتے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ لوگ مجھے ایسی سیدھی سادی لڑکی سمجھیں جس کے عاشق نے بے وفائی برتی ہو اور چھوڑ کے چلا گیا ہو، اور نہ مجھے اس کی تاب ہے کہ لوگ مجھے حقارت سے دیکھیں اور میرے اوپر رحم کھائیں۔ اس میں میرے لئے کوئی بڑی تعریف کی بات نہیں ہو گی، کیوں، ہو گی؟ چنانچہ میں نے اس نرس سے کہہ دیا کہ ہمیں ایک دوسرے سے بڑی محبّت ہے لیکن روپے کی بڑی تنگی ہے، اس لئے ہم شادی نہیں کر سکتے، اور اُس زمانے کے خواب دیکھا کرتے ہیں جب ہم دونوں امیر اور مشہور ہوں گے، اور ہمارے

ایک کے بجائے دس بچے ہوں گے۔ بچاری نرس کے دل پر بڑا اثر پڑا، بلکہ وہ تو رونے لگی۔ آج رات جب اُس کی ڈیوٹی میرے پاس ہوگی تو وہ مجھے اپنے عاشق کی تصویریں دکھائے گی۔ کیوں، مزے دار بات ہے نا؟"

اگلے دن فراؤلین شریڈر اور میں دونوں اکٹھے زچہ خانے گئے۔ سیلی چت لیٹی تھی اور اُس نے ٹھوڑی تک چادر اوڑھ رکھی تھی۔

"اہا، آؤ! بیٹھو نا۔ کیا بج گیا؟" اُس نے بڑی بے چینی سے کروٹ لی اور آنکھیں ملیں، "اتنے سارے پھول کہاں سے آئے؟"

"ہم لائے ہیں۔"

"بہت خوب!" سیلی کچھ بے معنی سے انداز میں مسکرانے لگی۔ "آج میں بڑی بے وقوف سی ہو رہی ہوں.... یہ کم بخت کلوروفارم ہے.... سارے سر میں بھرا ہوا ہے۔"

ہم چند منٹ ٹھیرے۔ جب ہم گھر واپس جا رہے تھے تو فراؤلین شریڈر بہت مغموم معلوم ہو رہی تھیں۔ "آپ کو یقین آئے نہ آئے، ہر اسی دو، مگر میری بیٹی بھی ہوتی تب بھی مجھے اتنا رنج نہ ہوتا۔ جب میں اس بچاری بچی کو ایسی تکلیف میں دیکھتی ہوں تو جی چاہتا ہے کہ اُس کی جگہ میں لیٹی ہوتی —— واقعی یہی جی چاہتا ہے!"

اگلے دن سیلی کی حالت اچھی تھی۔ ہم سب اُسے دیکھنے گئے، فراؤلین شریڈر، فراولین میئر، موبی اور فرٹز سب۔ فرٹز کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ اصل بات کیا ہے۔ اُسے یہ بتایا گیا تھا کہ سیلی کے پیٹ میں چھوٹا سا پھوڑا ہو گیا ہے جس کا آپریشن ہو رہا ہے۔ جب لوگوں کو اصلی راز معلوم نہ ہو تو وہ ہمیشہ بے موقع باتیں کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ فرٹز نے بھی بالکل غیر ارادی طور پر

بگلوں، گوز بیری کی جھاڑیوں، بچہ گاڑیوں اور عام طور سے بچوں کے بارے میں ایسے مناسب حال اشارے کیئے کہ ہم لوگ چونک چونک پڑے۔ بلکہ اُس نے نوبرلن کی ایک مشہور اور باعزت خاتون کے بارے میں ایک نئی کہانی بھی سنا ڈالی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ حال ہی میں اُس نے ایک غیر قانونی قسم کا آپریشن کرایا ہے۔ سیلی اور میں ایک دوسرے سے آنکھیں چرا رہے تھے۔

اگلے دن شام کو میں اُس سے زچہ خانے میں آخری مرتبہ ملا۔ اگلے دن صبح کو وہ وہاں سے جانے والی تھی۔ وہ اکیلی تھی اور ہم دونوں چھجے پر بیٹھ گئے۔ وہ اب کم و بیش ٹھیک تھی اور کمرے میں چل پھر سکتی تھی۔

"میں نے نرس سے کہہ دیا تھا کہ میں آج تمہارے سوا اور کسی سے نہیں ملنا چاہتی۔" سیلی نے بڑی ناتوانی سے جمائی لی۔ "لوگ مجھے تھکا دیتے ہیں۔"

"تم چاہو تو میں چلا جاؤں؟"

"ارے نہیں۔" سیلی نے بغیر کسی خاص جذبے کے کہا۔ "تم چلے جاؤ گے تو کوئی نرس آجائے گی اور بک بک شروع کر دے گی۔ اگر میں نے اُس کے ساتھ ہنس ہنس کے اور خوش ہو ہو کے باتیں نہ کیں تو یہ لوگ کہیں گے کہ مجھے اس گندی جگہ میں دو دن اور ٹھیرنا پڑے گا، اور اس کی مجھ میں تاب نہیں۔"

وہ خاموش سڑک کی طرف بڑی افسردہ نظروں سے تکنے لگی۔

"سنو، کرس، ایک طرح تو میرا جی چاہتا ہے کہ میرے بچہ ہو جاتا..... بچہ ہو جاتا تو بڑی شاندار بات رہتی۔ دو ایک دن سے میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ ماں بننے میں

کیا معلوم ہوتا ہو گا. تمہیں معلوم ہے، کل رات میں یہاں بہت دیر اکیلی بیٹھی رہی، اور اس تکیئے کو اپنے بازوؤں میں لئے سوچتی رہی کہ یہ میرا بچہ ہے. اس میں مجھے بڑا مزا آیا اور میں یہ محسوس کرنے لگی جیسے ساری دنیا سے بالکل الگ ہو گئی ہوں. میں سوچنے لگی کہ بچہ کیسے بڑا ہو گا. اور میں کیسے اس کی خدمت کیا کروں گی، اور رات کو اسے سلانے کے بعد باہر نکل جایا کروں گی، اور اس کے کھانے کپڑے کا خرچ چلانے کے لئے گندے گندے بڈھوں سے عشق لڑایا کروں گی.... تمہارا جی چاہ رہا ہے تو خوب ہنسو، کرس... واقعی میں یہی سب باتیں سوچ رہی تھی!"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ پھر تمہارے بچے بھی ہو جائیں گے."

"پتہ نہیں کیوں نہیں کرتی.... کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے مردوں کا اعتبار نہیں رہا. میری نظروں میں تو ان کی کوئی وقعت نہیں رہی.... اور تو اور، کرسٹفر، اگر تم بھی کہیں سڑک پہ چلتے ہوئے موٹر کے نیچے آ جاؤ... خیر ایک طرح تو مجھے افسوس ہو گا، لیکن حقیقت میں ذرا بھی پروا نہیں ہو گی."

"شکریہ، سیلی."

ہم دونوں ہنسنے لگے.

"میرا یہ مطلب نہیں تھا، پیارے ــــ تم نے کم ذاتی طور سے یہ مطلب نہیں تھا تم میری باتوں کا خیال نہ کرنا، میری حالت ایسی ہی ہو رہی ہے. میرے دماغ میں عجیب عجیب پاگل پن کی باتیں آتی رہتی ہیں. بچہ ہونے سے آدمی بڑا وحشی سا بن جاتا ہے، جیسے کوئی جنگلی جانور اپنے بچوں کی حفاظت کر رہا ہو. بس خرابی یہ ہے کہ میرے پاس بچے ہی نہیں ہیں جن کی حفاظت کروں... شاید یہی وجہ ہے کہ میں آج کل ہر آدمی سے

اتنی بدمزاجی سے پیش آرہی ہوں

بڑی حد تک یہ اس گفتگو کا نتیجہ تھا کہ میں نے اسی دن شام کو فیصلہ کر لیا کہ پڑھانے کا سلسلہ ختم کر دوں، جتنی جلدی ممکن ہو برلن چھوڑ کے بالٹک کے کنارے کسی شہر میں چلا جاؤں اور کام شروع کرنے کی کوشش کروں کیونکہ ابھی تک میں نے ایک لفظ نہیں لکھا جب میں نے سیلی سے اپنے ارادے کا ذکر کیا تو میرا خیال ہے کہ اس بات سے اُسے بڑا اطمینان ہوا۔ ہم دونوں کو جائے رہائش بدلنے کی ضرورت تھی۔ یوں ہم نے مبہم انداز میں ذکر تو کیا کہ وہ بعد میں مجھ سے آملے گی، لیکن اُس وقت میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ نہیں آئے گی۔ اُس کے ارادوں کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ اُس نے کہا کہ اگر مجھے روپیہ مل گیا تو شاید میں بعد میں پیرس یا آلپس یا جنوبی فرانس چلی جاؤں۔ "لیکن شاید"۔ وہ ذرا رک کے بولی، "میں یہیں ٹھیری رہوں گی۔ میں یہاں بڑے مزے میں رہونگی۔ میں اس جگہ سے کچھ مانوس ہو گئی ہوں"۔

میں جولائی کے وسط میں برلن واپس آیا۔

اس تمام عرصے میں اُن چھ کارڈوں کے علاوہ جو میری غیر حاضری کے پہلے مہینے میں ہم نے ایک دوسرے کو بھیجے تھے، مجھے سیلی کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر زیادہ تعجب نہیں ہوا کہ وہ ہمارے گھر سے چلی گئی ہے اور اب وہاں کمرے میں نہیں رہتی۔

"میں خوب جانتی ہوں کہ وہ یہاں سے کیوں چلی گئیں۔ میں انہیں اتنا آرام نہیں پہنچا سکی جتنا انہیں ملنا چاہیئے تھا۔ خاص طور سے ہمارے یہاں سونے کے کمروں میں پانی کے نل نہیں ہیں۔" فراؤلین شریڈر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ "لیکن پھر بھی اُن کے جانے سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی..... فراؤلین بولز کا برتاؤ بڑا نفیس تھا۔ اس کے بارے میں مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ انہوں نے خود اصرار کر کے اپنے کمرے کا جولائی کے آخر تک کا کرایہ دیا۔ ویسے تو خیر قانوناً مجھے یہ روپیہ ملنا چاہیئے تھا کیونکہ انہوں نے اکیس تاریخ تک نوٹس نہیں دیا تھا ——— لیکن میں اُن سے اس کا ذکر بالکل نہ کرتی .... بڑی نفیس آدمی تھیں ———۔"

"آپ کو اُن کا پتہ معلوم ہے؟"

"ہاں، اور ٹیلیفون نمبر بھی۔ آپ انہیں فون تو ضرور ہی کریں گے۔ آپ سے مل کے وہ بہت خوش ہوں گی.... یوں تو اور لوگ بھی آتے جاتے رہتے تھے لیکن اُن کے اصلی دوست آپ ہی تھے، ہیراسی ووُ۔ میں امید کیا کرتی تھی کہ آپ دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ آپ کا جوڑا بڑا شاندار رہتا۔ آپ کا اثر اُن پر بڑا اچھا پڑتا تھا، اور جب آپ پڑھنے لکھنے میں بہت زیادہ مشغول ہو جاتے تھے تو وہ آپ کا تھوڑا بہت دل بہلاتی رہتی تھی.... ہاں، ہیراسی ووُ، آپ ہنسیں گے تو ——— مگر کچھ پتہ نہیں! شاید ابھی ایسی دیر بھی نہیں ہوئی!"

اگلے دن صبح کو فراؤلین شریڈر نے مجھے بڑی گھبراہٹ میں آ کے جگایا۔

"ہیراسی ووُ، کچھ آپ نے سنا! قومی بینک بند کر دیا گیا! ہزاروں آدمی برباد ہو

ہو جائیں گے! دودھ والا کہتا ہے کہ پندرہ دن کے اندر خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ اب بولئے آپ کی رائے کیا ہے!"

کپڑے بدلتے ہی میں نیچے سڑک پر پہنچا۔ سڑک کے نکڑ پہ بنیک کی شاخ کے سامنے بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ چمڑے کے تھیلے لئے ہوئے مرد اور تاگوں کے بٹوے لئے ہوئے عورتیں ـــــ بالکل فراؤلین شریڈر کی قسم کی عورتیں ـــــ جمع تھیں۔ بنیک کی کھڑکیوں پہ لوہے کی سلاخیں لگا دی گئی تھیں۔ زیادہ تر آدمی کچھ احمقانہ اور مبہوت نظروں سے مقفّل دروازے کی طرف تک رہے تھے۔ دروازے کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا نوٹس لگا ہؤا تھا جیسے گو تھک حرفوں میں بڑا خوبصورت چھاپا گیا تھا جیسے کسی کلاسیکی مصنف کا ایک صفحہ۔ نوٹس میں لکھا تھا کہ بنیک میں جتنی رقمیں جمع ہیں اُن سب کی ذمّہ داری صدیر حکومت نے لے لی ہے؛ کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ بنیک کھلے گا نہیں۔

ایک چھوٹا سا بچہ بھیڑ میں پہیّہ چلا رہا تھا۔ پہیّہ ایک عورت کی ٹانگوں سے ٹکرا گیا۔ وہ فوراً لڑکے پر برس پڑی، "بدتمیز، بے حیا! یہاں کیا کر رہا ہے!" ایک اور عورت بھی شامل ہو گئی اور خوف زدہ لڑکے کو مارنے لگی، "چل بھاگ! یہاں تیرا کیا کام!" ایک اور عورت نے بڑے غضب ناک طنز کے ساتھ پوچھا، "کیوں کیا بنیک میں تیرا بھی روپیہ ہے؟" اُن کے گھٹے گھٹے اور پھٹتے ہوئے غصّے کے سامنے لڑکا بھاگ کھڑا ہؤا۔

تیسرے پہر کو بڑی گرما گرمی تھی۔ ان نئے فوری احکامات کی تفصیلات شام کے اخباروں میں چھپی تھیں مگر بہت مختصر طریقے سے اور سرکاری ہدایات کے مطابق۔ ایک اخبار نے یہ خبر بڑے چونکا دینے والے انداز میں دی تھی،

اور خون جیسی سرخ روشنائی سے موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا، "ہر چیز کا بیڑا ہو گیا!" ایک نازی اخبار نویس نے اپنے پڑھنے والوں کو یاد دلایا تھا کہ کل یعنی ۱۴ر جولائی کو فرانس میں قومی جشن کا دن تھا، اور اس سال فرانسیسی بڑے جوش و خروش سے خوشیاں منائیں گے کیونکہ جرمنی کی تباہی صاف نظر آرہی تھی۔ ایک درزی کی دکان میں جا کے میں نے فلالین کا بنا بنایا پتلون ساڑھے بارہ مارک میں خریدا ـــــ یہ بات گویا انگلستان کے اعتماد کی علامت تھی۔ پھر میں زمین دوز ریل میں بیٹھ کے سیلی سے ملنے کے لئے روانہ ہو گیا۔

جس علاقے میں وہ رہتی تھی وہاں تین تین کمروں کے بہت سے گھر ایک ہی جگہ بنے ہوئے تھے۔ یہ مکانات فن کاروں کی نو آبادی کے طور پر تیار کئے گئے تھے۔ جب میں نے گھنٹی بجائی تو خود سیلی دروازہ کھولنے آئی۔

"آہا، کرس، آؤ سور آؤ!"

"ہلو، سیلی ڈارلنگ!"

"کہو کیسے ہو؟ . . . . دیکھو ذرا دیکھ کے، پیارے، میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے ابھی دو چار منٹ میں مجھے باہر جانا ہے۔"

میں نے اُسے سر سے پیر تک سفید لباس پہنے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ اُس پہ بہت بھلا معلوم ہوتا تھا، لیکن اُس کا چہرہ پہلے سے دُبلا تھا اور کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے اُس کی عمر بڑھ گئی ہو۔ اُس کے بال نئے طرز کے کٹے ہوئے تھے، اور بڑی خوبصورتی سے گھونگر بنائے گئے تھے۔

"بڑے ٹھاٹ میں ہو۔" میں نے کہا۔

"واقعی؟" سیلی اپنے مسرور، خواب ناک اور خود آگاہ انداز میں مسکرانے لگی۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے نشست گاہ میں چلا گیا۔ ایک دیوار تو گویا بالکل کھڑکی تھی، کمرے میں کچھ عنابی رنگ کا لکڑی کا فرنیچر تھا، اور ایک بہت نیچا سا صوفہ جس پر بڑے فوق البھڑک جھالردار تکیے رکھے تھے۔ ایک چھوٹا سا بالوں دار سفید کتا اچھل کے کھڑا ہو گیا، اور بھونکنے لگا۔ سیلی نے اُسے اٹھا لیا اور ایسا منہ بنایا جیسے اُسے بوسہ دے رہی ہو مگر اُسے ہونٹوں سے چھوا نہیں۔

"فریڈی، میرے پیارے، تو کیسا اچھا بھونکتا ہے!" سیلی نے جرمن میں کہا۔ میں نے دیکھا کہ جرمن بولنے میں اُس کا لب و لہجہ پہلے سے بہتر ہے۔
"تمہارا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں۔ گرڈا کا ہے، یعنی اُس لڑکی کا جو میرے ساتھ اس مکان میں رہتی ہے۔"
"کیا تم اُسے بہت دن سے جانتی ہو؟"
"بس یہی دو ایک ہفتے سے۔"
"ہے کیسی؟"
"بُری نہیں ہے۔ بے طرح کنجوس۔ سب چیزوں پر مجھے ہی خرچ کرنا پڑتا ہے۔"
"یہاں تو بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔"
"کیا واقعی؟ ہاں، اچھی خاصی جگہ ہے۔ بہرحال فولینڈورف سٹراسے کے اُس دڑبے سے تو بہتر ہے۔"
"تم چلی کیوں آئیں؟ کیا تمہارا اور فراؤ لین شرڈر کا کچھ جھگڑا ہو گیا؟"

"نہیں، یہ بات تو نہیں ہے۔ بس میں اُن کی باتیں سنتے سنتے تھک گئی۔ وہ تو میرا مغز چاٹ گئیں۔ بلا کی جھک ہے انہیں۔"

"تمہیں تو وہ بہت پسند کرتی ہیں۔"

بیلی نے بے صبری سے کچھ بے جان سے انداز میں ہلکے سے کندھے ہلائے۔ اس گفتگو کے دوران میں مَیں دیکھتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے آنکھیں چرا رہی ہے۔ بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ میں چکچم میں پڑ گیا اور کچھ تھوڑا سا گڑبڑا بھی گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کسی طرح بہانہ بنا کے چل دوں۔

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ بیلی نے جمائی لی اور ٹیلیفون کو گھسیٹ کے اپنی گود میں رکھ لیا:

"ہلو، کون ہے؟ ہاں میں..... نہیں..... نہیں..... مجھے پتہ نہیں..... واقعی بالکل پتہ نہیں! میں اندازہ لگاؤں؟" اُس کی ناک سکڑ گئی۔ "ارون ہے؟ نہیں؟ پال؟ نہیں؟ اچھا ٹھیرو..... ذرا سوچنے دو....."

"اچھا، پیارے، اب مجھے بھاگنا چاہیئے!" جب آخر کار گفتگو ختم ہو گئی تو بیلی نے کہا۔ "مجھے دو گھنٹے تو ویسے ہی دیر ہو چکی ہے!"

"کوئی نیا دوست ہے؟"

لیکن بیلی نے میری مسکراہٹ کو نظر انداز کر دیا۔ اُس نے کچھ بدمزگی کے سے انداز میں سگرٹ جلا لی۔

"مجھے کچھ کاروباری سلسلے میں ایک آدمی سے ملنا ہے۔" اُس نے مختصراً کہا۔

"اور اب ہم پھر کب مل رہے ہیں؟"

"دیکھو اب دیکھوں گی، پیارے .... فی الحال تو میں بڑی مصروف ہوں .... کل تو میں سارا دن دیہات میں رہوں گی، اور شاید پرسوں بھی .... میں تمہیں بتادوں گی... شاید میں بڑی جلدی فرینک فرٹ جاؤں۔"

"وہاں کوئی ملازمت مل گئی ہے؟"

"نہیں۔ یہ بات تو نہیں ہے۔" سیلی کی آواز میں بڑا اختصار تھا، جیسے اس موضوع کو ختم کر دینا چاہتی ہو۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جاڑوں تک فلموں میں کام حاصل کرنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ اب میں پوری طرح آرام کروں گی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ ادھر تم نے بہت سے نئے دوست بنائے ہیں۔"

اب کے بھی سیلی کا انداز مبہم سا ہو گیا، اور اس نے بڑی احتیاط سے اپنے چہرے پر بے ڈھنگاپن طاری کر لیا:

"ہاں، کچھ بنائے تو ہیں .... فراؤلین شرڈر کے یہاں میں نے جو تین مہینے گزارے ہیں شاید یہ اُس کا ردِّ عمل ہے۔ وہاں تو میں کسی سے ملتی جلتی ہی نہ تھی۔"

"خوب"، میں اپنی طعن آمیز مسکراہٹ نہ روک سکا، "تمہاری خاطر مجھے امید ہے کہ تمہارے کسی نئے دوست کا روپیہ قومی بینک میں نہیں ہوگا۔"

"کیوں؟" اُسے فوراً دلچسپی پیدا ہو گئی۔ "اِس بینک میں کیا خرابی ہے؟"

"کیا واقعی تم نے خبر نہیں سُنی؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ اخبار تو میں پڑھتی ہی نہیں، اور آج ابھی تک گھر سے نکلی ہی نہیں ہوں۔"

میں نے اُسے سارے ہنگامے کی خبر سنائی۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو وہ بڑی

گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھی۔

اُس نے بڑی بے چینی سے چیخ کے کہا، "لیکن تم نے یہ ساری باتیں مجھے پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیں؟ ممکن ہے بات بہت بڑھ جائے۔"

"مجھے افسوس ہے سیلی۔ میں نے سوچا تمہیں تو معلوم ہو گا ہی۔۔۔ خاص طور پر اس لئے کہ آج کل تمہارا اٹھنا بیٹھنا کاروباری حلقوں میں ہے ــــ"

لیکن اُس نے اس طعنے کو نظر انداز کر دیا۔ اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے اور وہ اپنے خیالات میں غرق تھی۔

"اگر کوئی سخت بات ہوتی تو ٹیلیفون کر کے مجھے ضرور بتا دیتا"۔۔ آخر کار اُس نے زیرِ لب کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس خیال سے اُس کی پریشانی بہت کچھ دور ہو گئی۔

ہم سڑک کے نکڑ تک ساتھ ساتھ آئے۔ یہاں سیلی نے ایک ٹیکسی لے لی۔

"اتنی دور رہنے میں بھی بڑی پریشانی کا سامنا ہوتا ہے۔" وہ بولی۔ "شاید میں جلدی ہی کار خرید لوں گی۔"

"ہاں، ایک بات تو بتاؤ۔" جب ہم رخصت ہو رہے تھے تو اُس نے کہا "ریوگن میں کیسی گزری؟"

"میں خوب نہایا۔"

"اچھا، خدا حافظ، پیارے۔ پھر کبھی ملوں گی۔"

"خدا حافظ، سیلی۔ خوب مزے اُڑاؤ۔"

اس واقعے کے کوئی ایک ہفتے بعد سیلی نے مجھے فون کیا:

"کرس، کیا تم فوراً آسکتے ہو؟ بڑی ضروری بات ہے۔ ذرا میرے اوپر مہربانی کرو، اور آجاؤ۔"

اس دفعہ بھی میں نے سیلی کو گھر میں اکیلا پایا۔

"کچھ روپیہ کمانا چاہتے ہو، پیارے؟" اُس نے میرا استقبال ان لفظوں سے کیا۔

"ہاں ضرور۔"

"بہت خوب! دیکھو، بات یوں ہے ۔۔۔۔" اُس نے گلابی رنگ کا روئیں دار لباس پہن رکھا تھا، اور اُس کا سانس پھولا جا رہا تھا۔ "میرا ایک ملاقاتی ہے جو رسالہ نکالنے والا ہے۔ یہ بڑی اونچی قسم کا اور فن کارانہ رسالہ ہو گا۔ اس میں جدید قسم کی بہت سی تصویریں ہوا کریں گی، دوائیں، لڑکیوں کے سر، غرض کہ الّم غلّم چیزیں ــــ تم جانتے ہی ہو کہ ایسے رسالے کس قسم کے ہوتے ہیں۔۔۔۔ تو یہ بات ہے کہ ہر پرچے میں ایک خاص ملک لیا جائے گا، اور اُس پر تبصرہ ہوا کرے گا، یعنی وہاں کے رسم و رواج پر مضامین اور ایسی ہی چیزیں ہوا کریں گی۔۔۔۔ اچھا تو پہلا مُلک جس پر اس رسالے میں تبصرہ ہو گا انگلستان ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں انگریز لڑکی پر مضمون لکھ دوں۔۔۔۔ مجھے ذرا بھی معلوم نہیں کہ کیا لکھوں کیا نہ لکھوں۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ تم میرے نام سے مضمون لکھ دو اور روپیہ لے لو ــــ جو آدمی یہ پرچہ نکال رہا ہے میں اُسے ناراض نہیں کرنا چاہتی کیونکہ وہ بعد میں اور طریقوں سے میرے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔۔۔۔"

"اچھا کوشش کروں گا۔"

"بہت اچھا رہے گا!"

"تم مضمون کب چاہتی ہو؟"

"دیکھو، پیارے، یہی تو اصلی بات ہے۔ مجھے مضمون فوراً چاہیئے .... ورنہ پھر کس
کام آئے گا، کیونکہ میں نے چار دن ہوئے وعدہ کیا تھا، اور اُسے آج شام کو ضرور دینا
ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ بہت لمبا ہو۔ یہی پانچ سو لفظوں کے قریب ہو۔"
"اچھا، میں پوری کوشش کروں گا....."
"خوب، بہت عمدہ .... جہاں چاہو بیٹھ جاؤ۔ لو یہ کاغذ ہے۔ تمہارے پاس قلم ہے
اچھا، اور یہ لغت ہے، شاید تمہیں کسی لفظ کے ہجّے نہ معلوم ہوں .... اب میں نہانے
جاتی ہوں۔"
جب پینتالیس منٹ بعد سیلی کپڑے پہن کے اندر آئی تو میں کام ختم کر چکا تھا۔ صاف
بات ہے کہ میں اپنی اس کوشش سے بڑا خوش تھا۔
اُس نے سارا مضمون بڑی احتیاط سے پڑھا، اور اس دوران میں خوبصورت
اور باریک باریک بنی ہوئی بھنوؤں کے درمیان ایک شکن آہستہ آہستہ بڑھتی چلی گئی۔ جب
وہ پڑھ چکی تو اُس نے ٹھنڈا سانس بھر کے مسوّدہ رکھ دیا:
"مجھے بڑا افسوس ہے، کرِس، اس سے بالکل کام نہیں چلے گا۔"
"کام نہیں چلے گا؟" میں واقعی بھونچکا رہ گیا۔
"ویسے تو ادبی حیثیت سے یہ مضمون بڑا اچھا ہے، یہ سب بات تو ہے، ...."
"اچھا تو اس میں کیا خرابی ہے؟"
"اس میں پوری طرح تیزی طرّاری نہیں ہے۔" سیلی کا انداز بالکل فیصلہ کن تھا۔ "یہ
اس قسم کی چیز ہی نہیں ہے جیسی یہ آدمی چاہتا ہے۔"
میں نے اپنے کندھے جھٹکے۔ "مجھے بڑا افسوس ہے سیلی، میں نے اپنی طرف سے

تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن دراصل صحافت مجھ سے نہیں چلتی۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی اور فضا پر کچھ خفگی سی طاری رہی۔ میری خودداری کو بڑی ٹھیس لگی۔

"ارے واہ، مجھے یاد آگیا کہ میرے کہنے سے یہ کام کون کر سکتا ہے!" سیلی نے یکایک اُچھل کر چیختے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلے سے اُس کا خیال کیوں نہیں آیا؟" اُس نے ٹیلیفون پر ہاتھ مارا اور ایک نمبر ملایا، "اوہو، ہلو، کرٹ ڈارلنگ....."

تین منٹ میں اُس نے مضمون کے بارے میں ساری باتیں بتا دیں۔ رسیور کو واپس رکھ کر اُس نے فاتحانہ انداز سے اعلان کیا، "بہت نفیس! وہ ابھی لکھے دیتا ہے...."

وہ مرعوب کن انداز میں رُکی اور بولی، "یہ کرٹ روزنتال تھا۔"

"یہ کون ہے؟"

"تم نے کبھی اُس کا نام نہیں سُنا؟" سیلی چڑ سی گئی۔ وہ کچھ ایسی بننے لگی جیسے اُسے بڑا تعجب ہوا ہو۔ "میں تو سمجھتی تھی کہ تمہیں سینما سے دلچسپی ہے؟ روزنتال ہمارے یہاں کے سینیریو لکھنے والوں میں سب سے بہترین ہے۔ وہ ڈھیروں روپیہ کماتا ہے۔ یہ مضمون تو وہ محض میرے لحاظ سے لکھ رہا ہے.... وہ کہتا ہے کہ حجامت بناتے ہوئے اپنے سکرٹری کو مضمون بول دوں گا اور پھر سیدھا ایڈیٹر کے گھر بھیج دوں گا.... بڑا شاندار آدمی ہے!"

"تمہیں یقین ہے کہ اس مرتبہ مضمون ایڈیٹر کی پسند کا ہوگا؟"

"اور کیا بالکل! کرٹ تو بڑا بے نظیر آدمی ہے۔ وہ ہر کام کر سکتا ہے۔ آج کل اپنی فرصت کے اوقات میں ایک ناول لکھ رہا ہے۔ وہ بے انتہا مشغول رہتا ہے، ناشتے کے درمیان اپنے سکرٹری کو بولتا جاتا ہے، اس طرح یہ ناول لکھا جا رہا ہے۔ ابھی پچھلی دفعہ

اُس نے مجھے چند باب دکھائے تھے۔ سچ کہتی ہوں میں نے آج تک اس سے اچھا ناول نہیں پڑھا۔"

"واقعی؟"

"مجھے تو اسی قسم کے مصنف پسند ہیں۔" سیلی نے کہا۔ وہ بڑی احتیاط سے مجھ سے آنکھیں چرا رہی تھی۔ "اُس کے ارادے بڑے بلند ہیں، اور وہ پورے وقت کام کرتا ہے وہ ہر چیز لکھ سکتا ہے ـــــ جو بھی چاہو ہر چیز، سنیریو، ناول، ڈرامے، نظمیں، اشتہار ..... وہ اس معاملے میں نخرے بالکل نہیں کرتا۔ وہ اُن نوجوانوں کی طرح نہیں ہے جو ایک کتاب لکھ کے آرٹ کے بارے میں باتیں کرنے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا میں ہم سے بڑھ کے مصنف ہے ہی نہیں..... مجھے تو ان لوگوں سے بڑی نفرت ہے....."

مجھے بُرا تو لگا مگر میں ہنسی نہ روک سکا، "تم مجھے اس قدر ناپسند کب سے کرنے لگیں سیلی؟"

"میں ناپسند تو نہیں کرتی" ـــــ لیکن وہ مجھ سے آنکھیں چار نہ کر سکی ـــــ "یہ بات تو نہیں ہے۔"

"اچھا تو بس تمہیں مجھ سے نفرت ہے؟"

"پتہ نہیں کیا ہے.... تم کچھ بدل سے گئے ہو...."

"میں کیسے بدل گیا ہوں؟"

"یہ بتانا تو مشکل ہے.... کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمہارے اندر طاقت ہی نہیں رہی، یا ترقی کرنا چاہتے ہی نہیں۔ تمہیں لکھنے لکھانے کا شوق تو ہے مگر شہرت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ مجھے بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔"

"مجھے بڑا افسوس ہے۔" میں اپنے لہجے میں کچھ ظرافت پیدا کرنا چاہتا تھا مگر

مگر میری آواز ایسے نکلی جیسے میں اپنے اُوپر زور ڈال رہا ہوں۔ سیلی اپنے سیاہ چھوٹے چھوٹے جوتوں کو گھور گھور کے دیکھنے لگی۔

"کرسٹفر! تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ میں عورت ہوں۔ سب عورتیں چاہتی ہیں کہ مرد مضبوط اور حوصلہ مند ہوں اور اپنے پیشے میں ترقی کر رہے ہوں۔ عورت چاہتی ہے کہ مرد سے ماں کی طرح پیش آئے اور اُس کے کمزور پہلوؤں کی حفاظت کرے لیکن مرد میں کوئی مضبوط پہلو بھی تو ہونا چاہیئے جس کی وہ عزّت کر سکے.... اگر کبھی تمہیں کسی عورت سے دلچسپی پیدا ہو تو میں تمہیں صلاح دیتی ہوں کہ اُسے کبھی یہ پتہ نہ چلنے دینا کہ تمہارے اندر کوئی حوصلہ ہی نہیں ہے۔ ورنہ وہ تمہیں حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگیگی۔"

"ہاں، میں سمجھ گیا.... شاید یہی وہ اصول ہے جس کے مطابق تم اپنے دوستوں، میرا مطلب ہے نئے دوستوں، کا انتخاب کرتی ہو؟"

اس پر وہ بگڑ اٹھی۔

"اگر میرے دوستوں کا دماغ کاروباری معاملات میں تیز ہے تو اس میں کسی کا کیا نقصان ہے۔ تمہارا جی چاہے تو خوب مذاق اُڑاؤ۔ اگر اُن کے پاس روپیہ ہے تو انہوں نے اس کے لئے محنت بھی تو کی ہے.... شاید تم اپنے آپ کو اُن سے اچھا سمجھتے ہو؟"

"ہاں سیلی، اب تم پوچھ رہی ہو تو میں صاف ہی کہے دیتا ہوں۔ اگر واقعی وہ ایسے ہی ہیں جیسا میں سمجھتا ہوں تو واقعی میں اُن سے اچھا ہوں۔"

"ہاں یہ بات کہی ہے تم نے کرسٹفر! تم ایسی باتیں ہی تو کرتے ہو۔ اسی سے تو میں تم سے جلتی ہوں۔ تم بڑے خود پسند اور کاہل وجود ہو۔ اگر تم ایسی باتیں کہتے ہو تو انہیں ثابت کر کے بھی تو دکھاؤ۔"

"یہ بات کوئی کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ وہ اوروں سے اچھا ہے؟ اس کے علاوہ میں یہ تھوڑے ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ میں اپنے آپ کو بہتر سمجھتا ہوں — یہ تو سیدھا سادا اپنے حسنِ مذاق کا معاملہ ہے۔"

سیلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے سگرٹ جلالی، اور اُس کے ماتھے پہ ہلکی سی شکن پڑ گئی۔

"تم کہتی ہو کہ میں بدلا ہوا معلوم ہوتا ہوں" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "لو، میں بالکل صاف صاف کہے دیتا ہوں، میں خود تمہارے بارے میں یہی بات سوچ رہا ہوں" معلوم ہوتا تھا کہ سیلی کو یہ بات سن کر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ "اچھا۔ تم یہ سوچ رہے ہو، کرسٹفر؟ شاید تم نہیں ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے پتہ نہیں۔۔۔ یا شاید ہم دونوں میں سے کوئی نہیں بدلا۔ شاید ہم ایک دوسرے کو اُس شکل میں دیکھ رہے ہیں جیسے ہم اصل میں ہیں۔ ہم بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔"

"ہاں، میں نے بھی بعض دفعہ اس پر غور کیا ہے۔"

سیلی نے کچھ سوچنے کے انداز میں سگرٹ پیتے ہوئے اور اپنے جوتوں پر نظریں گاڑے ہوئے کہا: "میں سمجھتی ہوں کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں رہی جتنی پہلے تھی۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔۔۔" میں مسکرانے لگا، سیلی کا اصلی مطلب صاف ظاہر تھا۔ "بہرحال ہمیں اس معاملے میں جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے، یا ہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں، پیارے۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر میں نے کہا کہ اب مجھے چلنا چاہیئے۔ ہم دونوں کچھ سٹپٹا

ہوئے سے تھے اور ضرورت سے زیادہ اخلاق برت رہے تھے۔

"کیا واقعی کافی نہیں پیو گے؟"

"نہیں، بہت بہت شکریہ۔"

"چائے پی لو؟ بڑی عمدہ ہے۔ مجھے تحفے میں ملی ہے۔"

"نہیں، تمہارا بہت شکریہ، سیلی۔ اب مجھے واقعی چلنا چاہیئے۔"

"کیا واقعی جا رہے ہو؟" وہ بولی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دماغ پر سے بوجھ سا اُتر گیا ہے۔ "کسی وقت مجھے فون ضرور کرنا، کرو گے نا؟"

"ہاں، ضرور۔"

جب تک میں مکان سے نکل نہیں گیا اور سڑک پہ تیز تیز قدموں سے چلنے نہیں لگا اُس وقت تک مجھے پتہ نہیں چلا کہ مجھے کیسا غصّہ اور شرم محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ سیلی بھی کیسی کتیا ہے۔ میں اپنے دل میں کہنے لگا کہ میں شروع ہی سے جانتا تھا کہ وہ کیسی ہے، اور آخر ویسی ہی نکلی۔ نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے پہلے سے اس کا علم نہیں تھا۔ صاف بات کیوں نہ کہوں، میں یہ سوچ کر اپنا دل خوش کرتا رہا تھا کہ وہ مجھے بہت پسند کرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر تھا۔ لیکن کیا میں اس کا الزام اس کے سر رکھ سکتا تھا؟ لیکن میں اُسے الزام دے رہا تھا، مجھے اس پہ غصّہ آ رہا تھا۔ اس وقت تو میرا دل اس بات سے خوش ہوتا کہ اُسے اچھّی طرح چابک سے پٹتا ہؤا دیکھوں۔ میرے دماغ میں ایسا مہمل ہیجان برپا تھا کہ میں تعجب کرنے لگا کہیں اس تمام عرصے مجھے سیلی سے عشق تو نہیں رہا۔

لیکن نہیں، یہ عشق نہیں تھا — بلکہ اس سے بھی بدتر چیز یعنی انتہائی سستی اور طفلانہ قسم کی مجروح خود پرستی۔ یہ بات نہیں ہے کہ مجھے اپنے مضمون کے بارے میں اُس کی رائے کی کوئی بڑی پروا تھی — شاید تھوڑی بہت ہے، لیکن بہت ہی تھوڑی۔ مجھے اپنی ادبی حیثیت پر اتنا اعتماد تھا کہ اُس کی کسی بات کا مجھ پر اثر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جو بات مجھے تکلیف دے رہی تھی وہ اُس کی خود مجھ پر تنقید تھی۔ عورتوں میں بہ اعتبارِ صنف یہ عجیب صلاحیت ہوتی ہے کہ مرد میں جتنی بھرتی کی باتیں ہوتی ہیں اُنہیں فوراً نکال کے سامنے لے آتی ہیں! اپنے دل کو یہ سمجھانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا کہ سیلی بارہ برس کی اسکول میں پڑھنے والی لڑکی کی سی ذہنیت رکھتی ہے اور وہی الفاظ استعمال کرتی ہے جو بالکل مضحکہ خیز ہے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے — بس مجھے اتنا معلوم تھا کہ میں اُس کی باتوں کی وجہ سے اپنے آپ کو جعلیا سا محسوس کرنے لگا ہوں۔ خیر، اُس کی مضحکہ خیز وجوہات سے نہ سہی، لیکن ویسے کیا میں واقعی تھوڑا سا جعلیا نہیں ہوں؟ میں اپنی شاگرد لڑکیوں سے فن کاروں کی سی باتیں کرتا ہوں، اور حال ہی میں میں نے دیوان خانے والی اشتراکیت اختیار کر لی ہے۔ تو پھر میں جعلیا ہوں یا نہیں؟ ہاں، ہوں۔ لیکن اُسے ان چیزوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ میں بڑی آسانی سے اُسے مرعوب کر سکتا تھا سب سے ذلّت آمیز بات تو یہی تھی، میں گفتگو کو بالکل شروع ہی سے ٹھیک طرح نہیں چلا سکا تھا۔ میں شرم کے مارے سرخ ہو گیا تھا۔ اور جھگڑ بیٹھا تھا، حالانکہ مجھے تو بڑے وثوق کے ساتھ پختہ کارانہ اور پدرانہ انداز سے بولنا چاہیئے تھا، اور بڑی شاندار اور حیرت انگیز باتیں کرنا چاہیئیں تھیں۔ میں نے اُس کمینے جانور کرٹ سے خود اُسی کے میدان میں مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہی بات سیلی مجھ سے کرانا چاہتی تھی اور اسی کی اُسے

توقع تھی! اتنے مہینوں میں میں نے یہی ایک مہلک غلطی کی تھی — میں نے اُسے یہ دیکھنے کی اجازت دے دی تھی کہ میں صرف نااہل ہی نہیں، حاسد بھی ہوں۔ اور حاسد بھی بڑے مبتذل قسم کا۔ جی چاہتا تھا کہ اپنے ایک لات لگاؤں۔ اس کے خیال ہی سے شرم کے مارے اُوپر سے نیچے تک میرے بدن میں کانٹے چبھنے لگتے تھے۔

بہرحال جو کچھ ہونا تھا وہ ہو ہی چکا تھا۔ اب تو بس ایک بات ہو سکتی تھی، اور وہ یہ کہ ساری بات بھول جاؤں۔ یہ تو خیر طے ہی تھا کہ اب سیلی سے ملنا میرے لئے قطعاً ناممکن ہے۔

اس واقعے کے کوئی دس دن بعد ایک روز صبح کو ایک پستہ قد، زرد رُو، اور سیاہ بالوں والا جوان آدمی مجھ سے ملنے آیا۔ وہ امریکن بولی بڑی تیزی سے بولتا تھا، لیکن اُس کے لہجے میں ایک ہلکی سی اجنبیّت تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میرا نام جورج سینڈرس ہے۔ اُس نے اخبار میں انگریزی پڑھانے کے متعلق میرا اشتہار دیکھا تھا۔

"آپ کب شروع کرنا چاہتے ہیں؟" میں نے اُس سے پوچھا۔ لیکن نوجوان جلدی جلدی اپنا سر ہلانے لگا۔ نہیں، وہ انگریزی پڑھنے نہیں آیا تھا۔ میں کچھ مایوس سا ہو گیا، اور بڑے مہذب طریقے سے انتظار کرنے لگا کہ وہ مجھے اپنے آنے کا سبب بتائے۔ اس بات کی اُسے کوئی جلدی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ مجھے کچھ بتانے کے بجائے اُس نے سگرٹ قبول کر لی، اور بیٹھ کے امریکا کے بارے میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کبھی شکاگو گئے ہیں؟ نہیں؟ آپ نے جیمز شروپ کا نام سنا ہے؟ نہیں سنا؟ نوجوان نے ٹھنڈا سا سانس لیا۔ اُس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے

میرے اور عام طور سے ساری دنیا کے ساتھ بڑے صبر اور ضبط سے کام لے رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ منزلیں وہ اور بھی بہت سے آدمیوں کے ساتھ طے کر چکا ہے۔ اُس نے بتایا کہ جیمز شروپ شکاگو کا ایک بہت بڑا آدمی ہے، وہ بہت سے ہوٹلوں اور سینماؤں کا مالک ہے۔ دیہات میں اُس کے دو بڑے مکان ہیں، اور اُس کی کشتی مچی گن جھیل میں پڑی رہتی ہے۔ اور اُس کے پاس کم سے کم چار موٹریں ہیں۔ اس وقت تک میں نے اُنگلیوں سے میز بجانی شروع کر دی تھی۔ نوجوان کے چہرے پر تکلیف کا احساس جھلکنے لگا۔ اُس نے میرا قیمتی وقت ضائع کرنے کی معافی مانگی اور کہنے لگا کہ میں نے تو مسٹر شروپ کا ذکر صرف اس وجہ سے کیا ہے کہ میرا خیال تھا شاید آپ کو دلچسپی ہو —— اُس کے لہجے میں ہلکی سی سرزنش تھی —— اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر آپ مسٹر شروپ سے واقف ہوتے تو وہ اپنے دوست سینڈرس کی شرافت کی ضرور گواہی دیتے۔ بہرحال..... اب کیا ہو سکتا تھا..... پھر اُس نے پوچھا کہ اچھا آپ مجھے دو سو مارک قرض دے سکتے ہیں؟ اُسے کچھ کاروبار شروع کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی۔ یہ بڑا نایاب موقع تھا، اگر کل صبح تک روپیہ نہ ملا تو بالکل ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اُس کا وعدہ تھا کہ تین دن کے اندر روپیہ واپس کر دوں گا۔ اگر میں اُسے اس وقت روپیہ دے دوں تو وہ شام ہی کو کاغذ لا کے دکھا دے گا کہ اُس نے جتنی باتیں کہی ہیں سب ٹھیک ہیں۔

نہیں؟ اچھا خیر..... معلوم ہوتا تھا کہ اُسے بہت زیادہ تعجب نہیں ہوا۔ وہ فوراً جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا جیسے کوئی تاجر جس نے کسی گاہک پر اپنے قیمتی بیس منٹ بیکار ضائع کئے ہوں۔ بہرحال اُس نے مہذب طریقے سے مجھے جتا دیا کہ نقصان میرا ہی تھا اُس کا نہیں۔ دروازے پہ پہنچ کے وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور پوچھا کہ آپ کچھ فلم ایکٹرسوں

کو تو نہیں جانتے۔ اپنے اصلی کاروبار کے ساتھ ساتھ وہ ایک نئی قسم کا کریم بھی بیچتا پھرتا تھا جو خاص طور سے اس لئے ایجاد کیا گیا تھا کہ اسٹوڈیو کی تیز روشنی میں کھال خشک نہ ہو۔ ہالی وڈ کی تمام بڑی بڑی ایکٹریسیں یہ کریم استعمال کر رہی تھیں۔ لیکن یورپ میں ابھی اس کی شہرت نہیں ہوئی تھی۔ اگر اُسے پانچ چھ ایسی ایکٹریسیں مل جائیں جو اس کریم کو استعمال کریں اور اس کی سفارش کریں تو انہیں نمونے کی شیشیاں مفت ملیں گی اور ہمیشہ آدھی قیمت لی جائے گی۔

ایک لمحے ہچکچانے کے بعد میں نے سیلی کا پتہ بتا دیا۔ میں ٹھیک طرح نہیں بتا سکتا کہ میں نے یہ حرکت کیوں کی۔ کچھ تو یہ بھی ہے کہ میں اس آدمی سے گلو خلاصی حاصل کرنا چاہتا تھا، جس کے چہرے پر یہ آثار نظر آ رہے تھے کہ وہ پھر بیٹھ کے باتیں شروع کرنا چاہتا ہے؛ اور کچھ میں نے جلن کی وجہ سے بھی ایسا کیا۔ اگر سیلی کو گھنٹے دو گھنٹے اس کی بک بک جھک جھک برداشت کرنی پڑی تو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اُس نے خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ اُسے ایسے آدمی پسند ہیں جن کے دل میں حوصلہ ہو۔ اگر یہ کریم واقعی موجود ہوا تو شاید اُسے ایک شیشی بھی مل جائے گی، اور اگر اس آدمی نے دو سو مارک قرض مانگے —— خیر، تو اس سے بھی کوئی ایسا فرق نہیں پڑے گا۔ وہ تو کسی بچے تک کو دھوکا نہیں دے سکتا۔

"ویسے جو چاہو کرو۔" میں نے اُسے تنبیہہ کر دی، "لیکن اُس سے یہ مت کہنا کہ تمہیں میں نے بھیجا ہے۔"

اُس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ فوراً یہ بات مان لی۔ شاید میری اس درخواست کی تشریح اُس نے اپنے طریقے پر کر لی تھی، کیونکہ معلوم ہوتا تھا اُسے یہ بات بالکل عجیب نہیں لگی۔ نیچے جاتے ہوئے اُس نے بڑی خوش اخلاقی سے ہیٹ اتار کر مجھے سلام کیا۔

اگلی صبح تک اس ملاقات کا خیال میرے ذہن سے بالکل اُتر گیا تھا۔

دو چار دن بعد سیلی نے خود مجھے فون کیا۔ ٹیلیفون کا جواب دینے کے لئے مجھے پڑھانے کے بیچ میں اُٹھنا پڑا تھا۔ میں بڑے کھُرّے پن سے پیش آیا۔

"یہ تم ہو، کرسٹفر پیارے؟"

"ہاں، میں ہوں۔"

"تم اسی وقت آکے مجھ سے مل سکتے ہو؟"

"نہیں۔"

"اوہو....." میرے انکار سے سیلی کو بڑا دھکا لگا۔ ذرا سی دیر خاموشی رہی، پھر اُس نے ایسی عاجزی کے لہجے میں کہا جو اُس کی عادت کے بالکل خلاف تھا، "معلوم ہوتا ہے تم بے انتہا مشغول ہو؟"

"ہاں، مشغول ہوں۔"

"اچھا.... اگر میں تم سے ملنے آجاؤں تو تم بُرا نہیں مانو گے؟"

"کیا کام ہے؟"

"پیارے" — سیلی کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بالکل بے بس ہو رہی ہے — "میں فون پر نہیں بتا سکتی.... بڑی اہم بات ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے" — میں نے یہ جملہ انتہائی ناخوشگوار لہجے میں کہا — "کوئی اور مضمون ہے کیا؟"

بہرحال میرے منھ سے یہ جملہ نکلتے ہی ہم دونوں کو ہنسنا پڑا۔

"کرس، تم بالکل جانور ہو!" یسلی خوش ہو کر گھنٹیوں کی سی آواز میں ہنسی، لیکن پھر اُس نے یکایک اپنے آپ کو روک لیا، "نہیں، پیارے ——— اب کے میں قسم کھا کے کہتی ہوں بہت ہی اہم بات ہے۔ بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ رُکی، اور پھر مرعوب کن انداز میں بولی، "اور تمہیں ایک آدمی ہو جو میری مدد کر سکتے ہو۔"

"اچھا..." میں آدھے سے زیادہ پگھل چکا تھا، "ایک گھنٹے میں آجاؤ۔"

"اچھا، پیارے، میں بالکل شروع سے سناتی ہوں۔ سناؤں نا؟... کل صبح ایک آدمی نے مجھے فون کیا اور پوچھا کہ آپ سے ملنے آسکتا ہوں یا نہیں۔ اُس نے کہا تھا کہ بہت ہی اہم کام ہے۔ چونکہ اُسے میرا نام اور سب باتیں معلوم تھیں اس لئے میں نے کہہ دیا کہ ہاں، ضرور، فوراً آجایئے... چنانچہ وہ آگیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کا نام ریکاڈسکی ——— پال ریکاڈسکی ——— ہے، اور وہ یورپ میں میٹرو گولڈن میئر کا نمائندہ ہے، اور مجھے اپنی کمپنی میں رکھنے کے لئے آیا ہے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کی کمپنی اٹلی میں ریویرا کے ساحل پہ ایک مزاحیہ فلم بنا رہی ہے اور ایک ایسی ایکٹرس کی تلاش میں ہے جو انگریزی بولتی ہو۔ وہ بڑے قابلِ یقین انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے یہاں تک بتا ڈالا کہ ڈائریکٹر کون ہے، کیمرہ مین کون ہے، آرٹ ڈائریکٹر کون ہے اور مکالمے کس نے لکھے ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک آدمی کا نام بھی پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ لیکن اس بات سے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوا، بلکہ اس سے تو اُس کی باتیں اور بھی زیادہ سچی معلوم ہونے لگیں، کیونکہ زیادہ تر آدمی تو کوئی ایسا نام انتخاب کرتے جو اخباروں میں چھپتا رہتا ہے.... خیر، اب وہ بولا کہ میں آپ سے مل ہی لیا ہوں اور مجھے یقین ہے

کہ آپ اس کام کے لئے بالکل ٹھیک ہیں، اگر آپ امتحان میں پوری اُتریں تو میں آپ سے اس جگہ کا وعدہ کرتا ہوں.... چنانچہ میں بڑی خوش ہوئی، اور پوچھا کہ امتحان کب ہوگا. اُس نے کہا کہ ابھی دو ایک دن تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ اُوفا والوں سے مل کے انتظام کرنا ہے..... پھر ہم ہالی وڈ کے بارے میں باتیں کرنے لگے، اور اُس نے مجھے طرح طرح کی کہانیاں سنائیں ـــ میرا خیال ہے کہ یہ کہانیاں ایسی ہو سکتی ہیں جو اُس نے فلمی رسالوں میں پڑھی ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی تھیں نہیں ـــ پھر اس نے مجھے بتایا کہ فلموں میں طرح طرح کی آوازیں کس طرح پیدا کی جاتی ہیں، اور حیرت انگیز شعبدے کیسے دکھائے جاتے ہیں. اُس کی باتیں بے انتہا دلچسپ تھیں. اُس نے ضرور بہت سے اسٹوڈیو دیکھے ہوں گے..... خیر جب ہم ہالی وڈ کے بارے میں باتیں کر چکے تو اس نے امریکہ کا ذکر شروع کر دیا، اور اپنی ملاقاتیوں، ڈاکوؤں اور نیویارک کی باتیں سنانے لگا. اُس نے بتایا کہ وہ امریکہ سے ابھی تازہ تازہ آیا ہے، اور اُس کا سارا سامان ہیمبرگ میں چنگی خانے میں پڑا ہے. اصل میں میں اپنے دل میں سوچ رہی تھی کہ یہ عجیب بات ہے کہ یہ شخص ایسے بے ڈھنگے کپڑے پہنے ہوئے ہے. لیکن جب اُس نے یہ بات بتائی تو میں نے سوچا کہ پھر تو واقعی ٹھیک ہے..... اچھا، کرس، وعدہ کرو کہ اب جو بات میں سنانے والی ہوں اُس پر نہیں ہنسو گے، ورنہ میں بالکل نہیں سنا سکوں گی ـــ اب اُس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مجھ سے محبت جتانی شروع کر دی. پہلے تو مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ آدمی کاروباری باتوں کے ساتھ ساتھ دل لگی کا بھی خیال رکھتا ہے، لیکن پھر تھوڑی دیر بعد میں نے کچھ زیادہ اعتراض نہیں کیا. وہ کچھ روسی قسم کا تھا، اور اچھا لگتا تھا.... اور اُس کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ اُس نے

مجھے اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی. چنانچہ ہم ریسٹورنٹ پہنچے اور ایسا نفیس کھانا کھایا کہ میں نے تو اپنی عمر میں بہت ہی کم کھایا ہوگا (یہ ایک تسلّی ضرور ہے) جب بل آیا تو وہ بولا "ہاں پیاری، ایک بات ہے، کل تک کے لئے تم تین سو مارک مجھے قرض دے سکتی ہو؟ میرے پاس ڈالر کے نوٹ ہیں، اور مجھے بینک میں انہیں تبدیل کرانا ہے؛ خیر میں نے روپیہ دے دیا. بدقسمتی یہ دیکھو کہ اُس دن میرے پاس بہت روپیہ تھا..... پھر وہ بولا، "آؤ تمہارے فلمی معاہدے کی خوشی میں ایک بوتل شیمپین پئیں؛ میں راضی ہوگئی. معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک میں نشے میں دھت ہو چکی تھی، کیونکہ جب اُس نے مجھ سے اپنے ساتھ رات بسر کرنے کو کہا تو میں فوراً مان گئی. ہم اوگس بورگر اسٹراسے کے اُن چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں سے ایک میں چلے گئے ——— اُس کا نام تو یاد نہیں رہا. لیکن میں اُسے آسانی سے ڈھونڈ سکتی ہوں ..... یہ انتہائی گندی جگہ تھی..... بہرحال مجھے اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں کہ رات کیا ہوا. کہیں آج صبح جاکے مجھے اتنا ہوش آیا کہ ٹھیک طرح سمجھ سکوں. وہ ابھی سو ہی رہا تھا. مجھے تعجب ہونے لگا کہ معاملہ کہیں گڑ بڑ تو نہیں ہے..... میں نے اُس کے اندر والے کپڑوں کو پہلے اچھی طرح نہیں دیکھا تھا، انہیں دیکھ کر تو مجھے دھکّا سا لگا. کسی اہم فلمی آدمی سے تو یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ اپنے کپڑوں کے نیچے ریشمی چیزیں پہنتا ہوگا، لیکن اس کا زیرجامہ وغیرہ تو عجیب ہی کپڑے کا تھا جیسے اونٹ کے بال یا کوئی اور چیز. اس کا زیرجامہ تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یوحنّا پیغمبر کا ہو. اور اُس کی ٹائی کیا تھی، اچھا خاصا ٹین کا ٹکڑا تھا صرف اتنی ہی بات نہیں تھی کہ اُس کے کپڑے میلے کچیلے ہوں، بلکہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ جب یہ کپڑے نئے تھے اس وقت بھی کچھ ایسے اچھے نہیں تھے..... میں سوچ ہی رہی تھی کہ بستر سے اٹھ کے اُس کی جیبوں کی تلاشی لوں، لیکن اتنے میں وہ جاگ گیا اور پھر موقع

نہیں رہا۔ چنانچہ ہم نے ناشتہ منگا لیا..... پتہ نہیں کہ شاید وہ سوچ رہا ہو کہ میں اب تک اس پہ بے طرح فریفتہ ہو چکی ہوں اور کسی بات کا خیال ہی نہیں کروں گی، یا پھر وہ مجھے برابر فریب دلاتے رہنے کی تکلیف نہیں اٹھانا چاہتا تھا، بہر حال آج صبح وہ ایک بالکل ہی نیا آدمی دکھائی دے رہا تھا —— بالکل معمولی قسم کا غنڈا۔ اُس نے مربّا چھری پہ سے چاٹ چاٹ کے کھایا، بلکہ زیادہ تو بستر کی چادر پہ گرتا گیا۔ اور اُس نے انڈوں کی زردی پچڑ پچڑ کرکے پی۔ مجھے بے اختیار اُس پہ ہنسی آگئی۔ اس پہ وہ ناراض ہو گیا..... پھر وہ بولا کہ مجھے تو بیئر چاہیئے۔ میں نے کہا کہ اچھا، دفتر کو فون کر دو اور منگا لو۔ سچی بات ہے کہ مجھے تو اُس سے ڈر سا لگنے لگا تھا۔ اُس کی ناک بھوں چڑھ گئی تھی جیسے کوئی غار میں رہنے والا وحشی ہو۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ آدمی پاگل ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ جہاں تک ہو اسے بہلائے رکھنا چاہیئے ..... خیر، اُس نے سمجھا کہ میں نے بڑی اچھی تجویز پیش کی ہے۔ اُس نے فون اٹھا لیا اور بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اُسے بڑا تاؤ آیا، کیونکہ اُس نے بتایا کہ ہوٹل والے کمروں میں بیئر بھیجنے سے انکار کرتے ہیں۔ اب مجھے خیال ہوتا ہے کہ وہ یونہیں فون ہاتھ میں لیے ہوئے تھا اور اپنے آپ ہی اپنے آپ باتیں کر رہا تھا، لیکن اُس نے یہ کھیل بڑی خوش اسلوبی سے کھیلا، اور اُس وقت تو میں اتنی سٹ پٹائی ہوئی تھی کہ ایسی باتوں کا زیادہ خیال ہی نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید اب وہ مجھے قتل کر دے گا، کیونکہ اُسے اپنی بیئر نہیں مل سکی تھی ..... لیکن اُس نے بڑے سکون سے کام لیا۔ کہنے لگا کہ میں کپڑے پہن کے نیچے جاتا ہوں اور خود لاتا ہوں۔ میں نے کہا اچھا جاؤ..... میں نے بڑی دیر انتظار کیا، لیکن وہ نہیں لوٹا۔ آخر میں نے گھنٹی بجائی، اور خادموں سے پوچھا کہ اُسے باہر جاتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔ اُس نے کہا، ہاں، وہ تو گھنٹہ بھر ہوا بل ادا کرکے چلے بھی گئے..... وہ کہہ گئے

تھے کہ آپ کے آرام میں خلل نہ ڈالا جائے؛ مجھے بڑا تعجب ہؤا اور میں نے بس اتنا کہا کہ اچھا شکریہ..... مذاق کی بات یہ ہے کہ اس وقت تک میں بالکل فیصلہ کر چکی تھی کہ یہ آدمی پاگل ہے، اور میں نے شبہ تک نہیں کیا کہ کہیں وہ فریبی اور ٹھگ نہ ہو. شاید وہ چاہتا بھی یہی تھا..... لیکن وہ ایسا پاگل نہیں نکلا، کیونکہ جب میں نے اپنے بٹوے میں دیکھا تو معلوم ہؤا کہ وہ میرا سارا روپیہ لے کے چمپت ہو گیا ہے، اور میں نے رات اُسے جو تین سو مارک دیئے تھے اُن میں سے باقی بچا ہؤا روپیہ بھی..... اصل میں جلن مجھے اس بات سے ہو رہی ہے کہ وہ شرطیہ یہ سوچ رہا ہے کہ میں شرم کے مارے پولیس میں رپٹ نہیں لکھواؤں گی. میں اُسے دکھا دوں گی کہ اُس کی رائے غلط ہے ——"

"کیوں سیلی، اس آدمی کی شکل صورت کیسی تھی؟"

"کوئی تمہارے سے قد کا ہوگا. زرد رُو، سیاہی مائل، اُس کے چہرے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی پیدائش امریکہ کی نہیں ہے. اُس کے لہجے میں بھی اجنبیت تھی۔"

"کچھ تمہیں یاد ہے، اُس نے شروپ نام کے آدمی کا ذکر تو نہیں کیا، جو شکاگو میں رہتا ہے؟"

"ذرا ٹھیرو..... ہاں، کیا تھا! اُس کے بارے میں تو اُس نے بہت باتیں کی تھیں. ..... لیکن کرس، تمہیں کیسے معلوم ہے؟"

"دیکھو بات یوں ہے..... سنو سیلی مجھے تمہارے سامنے ایک بڑا خوفناک اعتراف کرنا ہے..... پتہ نہیں تم مجھے کبھی معاف بھی کرو گی یا نہیں....."

اُسی دن تیسرے پہر کو ہم تھانے گئے.

وہاں جو کچھ گفت وشنید ہوئی وہ ایسی پریشان کن تھی کہ جس کی مجھے توقع بھی نہیں تھی کم سے کم اپنی بات تو میں کہتا ہوں۔ سیلی کو بے چینی محسوس ہوئی ہو تو مجھے پتہ نہیں لیکن اس نے پلکوں کی جنبش تک سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اُس نے پولیس کے دونوں عینک والے افسروں کو واقعے کی پوری تفصیلات ایسے بے جھجک ہو کے سنائیں کہ معلوم ہوتا تھا وہ کسی کھوئے ہوئے کتّے یا بس میں بھولی ہوئی چھتری کا معاملہ لے کے آئی ہے۔ یہ دونوں افسر ظاہر ہے کہ بال بچّوں والے تھے۔ پہلے تو انہیں ان باتوں پر کچھ حیرت سی ہوئی۔ وہ سرخ روشنائی میں بار بار قلم ڈبونے لگے، اور لکھنے سے پہلے اپنی کہنیاں گول مول گھمانے لگے جیسے چند خیالات کو اپنے دماغ میں گھسنے سے روک رہے ہوں۔ وہ بڑی ترشروئی اور روکھے پن سے پیش آتے۔

"اب کچھ اس ہوٹل کے بارے میں۔" زیادہ عمر والے افسر نے سخت لہجے میں کہا "میرا خیال ہے کہ وہاں جانے سے پہلے آپ کو معلوم تھا کہ یہ خاص قسم کا ہوٹل ہے؟"

"تو کیا آپ کا مطلب ہے کہ ہم برسٹل ہوٹل جاتے؟" سیلی کا لہجہ بڑا ملائم اور معقولیت آمیز تھا۔ "اگر ہم جاتے بھی تو وہ سامان کے بغیر ہمیں گھسنے تھوڑے ہی دیتے۔"

"اچھا تو آپ کے پاس سامان نہیں تھا؟" کم عمر والا افسر فاتحانہ انداز میں اس بات پر جھپٹ پڑا، جیسے یہ کوئی انتہائی اہم بات ہو۔ اُس کا تانبے کی تختی کے سے رنگ کا پولیس والوں جیسا ہاتھ کاغذ کے لکیروں دار تختے پر بڑے وقار کے ساتھ چل پڑا۔ اُس کے موضوع نے اُسے ایسا متاثر کیا تھا کہ اُس نے سیلی کے اس فی البدیہہ جملے کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی:

"جب کوئی آدمی مجھے کھانے کی دعوت دیتا ہے تو میں عام طور سے سوٹ کیس بھر کے نہیں لے جاتی۔"

زیادہ عمر والے افسر نے فوراً بات پکڑ لی: "اچھا تو جب آپ ریسٹورنٹ میں تھیں اُس وقت اس نوجوان نے آپ کو اپنے ساتھ ـــــ یعنی اپنے ساتھ ہوٹل چلنے کی دعوت دی؟"

"بلکہ اور کھانے کے بعد۔"

"محترم خاتون،" زیادہ عمر والا افسر کرسی کے تکیے سے کمر لگا کے بیٹھ گیا اور طعن و تشنیع کرنے والے باپ کا سا انداز اختیار کر لیا، "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اجنبیوں کی ایسی دعوتیں قبول کرنا آپ کا عام دستور تو نہیں ہے؟"

سیلی بڑے شیریں انداز میں مسکرائی۔ وہ معصومیت اور صاف گوئی کا مجسمہ معلوم ہو رہی تھی: "لیکن دیکھئے نا، وہ اجنبی تھوڑے ہی تھا، وہ تو میرا منگیتر تھا۔"

یہ سن کر تو وہ دونوں ایک جھٹکے کے ساتھ سیدھے ہو گئے۔ کم عمر والے افسر نے اپنے صاف شفاف صفحے پر ایک چھوٹا سا دھبّہ بھی لگا لیا ـــــ شاید پولیس کے محکمے کے بے داغ کاغذات میں یہی ایک داغ تھا۔

"فراؤلین بولنز، گویا آپ کا مطلب ہے" ـــــ کھرّے پن کے باوجود زیادہ عمر والے افسر کی آنکھ میں ایک چمک تھی ـــــ "گویا آپ کا مطلب ہے کہ ایک دن تیسرے پہر کی تھوڑی سی واقفیت کے بعد ہی آپ کا اس آدمی سے رشتہ ہو گیا؟"

"ہاں بالکل۔"

"کیا یہ بات کچھ غیر معمولی نہیں ہے؟"

"ہاں ہے تو۔" سیلی نے سنجیدگی سے تائید کی۔ "لیکن آپ جانتے ہیں کہ آج کل کوئی لڑکی کسی مرد کو انتظار میں ڈالے رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ اگر وہ اُس سے

ایک دفعہ پوچھے اور لڑکی انکار کر دے تو ممکن ہے وہ کہیں اور کوشش شروع کر دے، آج کل عورتوں کی ویسے ہی کثرت ہے ——"

یہ سُن کر زیادہ عمر والا افسر ضبط نہ کر سکا اور پھٹ پڑا۔ کرسی پیچھے کھینچ کر وہ اتنا ہنسا، اتنا ہنسا کہ اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا۔ کہیں ایک منٹ کے بعد جا کر اُس سے بات ہوئی۔ کم عمر والے افسر نے زیادہ تہذیب سے کام لیا۔ اُس نے ایک بڑا سا رومال نکالا اور ناک صاف کرنے کا بہانہ کرنے لگا۔ لیکن ناک کی صفائی ترقی کر کے چھینک بن گئی اور پھر قہقہہ۔ ذرا سی دیر میں اُس نے بھی سیلی کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنے کی کوشش چھوڑ دی۔ اس کے بعد جتنی باتیں ہوئیں اُن میں ایک عجیب مزاحیہ ڈرامے کی سی بے تکلفی تھی، اور ساتھ ہی ساتھ کچھ لگاوٹ کی بھونڈی اور بھاری بھرکم باتیں بھی ہوتی جاتی تھیں۔ خصوصاً زیادہ عمر والا افسر تو خاصی جرأت سے کام لینے لگا۔ میرا خیال ہے کہ دونوں کو میری موجودگی کا افسوس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بس وہ خود ہوں اور سیلی۔

"بالکل فکر نہ کیجیے فراؤ لین بولز۔" رخصت کے وقت انہوں نے اُس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "چاہے سارے برلن کو اُلٹ پلٹ کرنا پڑے، لیکن اُس آدمی کو پکڑ کے لائیں گے!"

"خوب!" جب ہم اتنی دور نکل آئے کہ وہ لوگ ہماری آواز نہ سن سکیں تو میں نے تحسین آمیز انداز میں کہا، "تم ان لوگوں سے سلٹنا خوب جانتی ہو!"

سیلی خوابناک انداز میں مسکرائی۔ وہ اپنے آپ سے بہت خوش تھی۔ "تمہارا کیا مطلب ہے، پیارے؟ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

"تم بھی جانتی ہو اور میں بھی ـــــ انہیں اس طرح ہنسانا، اُن سے کہنا کہ وہ تمہارا منگیتر تھا! واقعی تمہیں الہام ہو رہا تھا!"

لیکن سیلی کو ہنسی نہیں آئی۔ اس کے بجائے اُس کا رنگ سُرخ ہو گیا اور وہ اپنے پیروں کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کے چہرے کا انداز عجیب مضحکہ خیز، مجرمانہ اور بچوں کا سا ہو گیا:

"کرس، یہ بات اتفاق سے بالکل ٹھیک تھی ـــــ"

"ٹھیک تھی!"

"ہاں، پیارے۔" اب سیلی پہلی مرتبہ کچھ گڑبڑائی۔ وہ بڑی تیز بولنے لگی۔ "میں صبح تمہیں بتا نہیں سکی۔ یہ جتنی باتیں ہوتی ہیں اس کے بعد یہ چیز انتہائی احمقانہ معلوم ہوتی۔ ... جب ہم ریسٹورنٹ میں تھے تو اُس نے مجھ سے شادی کرنے کو کہا تھا، اور میں نے بھی حامی بھر لی تھی..... بات یہ ہے کہ میں نے سوچا یہ آدمی فلم کمپنی میں ہے' اور اسے چٹ منگنی پٹ بیاہ کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ ہالی وڈ میں تو یہ بات بڑی عام ہے... اور چونکہ وہ امریکن تھا، اس لئے میں نے سوچا کہ ہم جب چاہیں گے بڑی آسانی سے طلاق لے لیں گے..... اور یہ چیز مجھے کامیاب ایکٹرس بنانے کے لئے بڑی کار آمد ہوتی ـــــ میرا مطلب ہے کہ اگر وہ واقعی فلم کمپنی میں ہوتا ـــــ کیوں' نہ ہوتی؟..... اگر انتظام ممکن ہوتا تو آج ہماری شادی ہو جاتی..... اب تو یہ بات سوچ کے بھی ہنسی آتی ہے ـــــ"

"لیکن سیلی!" میں خاموش کھڑا رہ گیا، اور اُس کی طرف تکنے لگا۔ آخر مجھے ہنسنا پڑا: "خوب..... میں نے اپنی عمر میں ایسا عجیب و غریب آدمی نہیں دیکھا جیسی تم ہو!"

سیلی ہی ہی ہی ہی ہنسنے لگی جیسے کوئی شریر بچہ جس نے غیر ارادی طور پر اپنے بڑوں کو ہنسا دیا ہو: "میں ہمیشہ تم سے کہتی رہی ہوں کہ میں تھوڑی سی پاگل ہوں، نہیں کہتی رہی شاید اب تمہیں اعتبار آجائے ــــ"

کہیں ہفتے بھر کے بعد جا کے پولیس نے ہمیں کوئی خبر دی۔ ایک دن صبح کو دو جاسوس مجھ سے ملنے آئے۔ ہم نے جو حلیہ بتایا تھا اُس سے ملتا جلتا ایک آدمی ہاتھ آگیا تھا اور اُس کی نگرانی ہو رہی تھی۔ پولیس کو اُس کا پتہ معلوم تھا، لیکن اُسے گرفتار کرنے سے پہلے مجھ سے شناخت کرانا چاہتی تھی۔ جاسوسوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ ہمارے ساتھ فوراً کلائسٹ اسٹراسے کے ایک شراب خانے چل سکتے ہیں؟ وہ تقریباً ہر روز وہاں اس وقت ضرور ہوتا تھا۔ پولیس والوں نے کہا کہ بس بھیڑ میں اُس کی طرف اشارہ کر کے آپ فوراً واپس چلے آیئے گا، اس میں کوئی جھگڑا نہیں ہوگا نہ آپ کو کوئی پریشانی اُٹھانی پڑے گی۔

مجھے یہ بات پسند نہیں آئی، لیکن اب اس سے بچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جب ہم شراب خانے پہنچے تو بہت بھیڑ تھی، کیونکہ یہ دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ اس نوجوان پہ میری نظر فوراً پڑ گئی؛ وہ تختے کے قریب چائے کی دیگ کے قریب کھڑا تھا اور اُس کے ہاتھ میں پیالی تھی۔ اس طرح اکیلا اور اپنی حفاظت سے بے خبر کھڑا ہوا وہ بڑا قابلِ رحم معلوم ہو رہا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ میلا کچیلا اور بہت ہی کم عمر، بالکل لڑکا سا نظر آرہا تھا۔ میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ وہ آدمی یہاں نہیں ہے۔ لیکن اس سے کیا فائدہ ہوتا؟ پولیس والے اُسے بہر حال پکڑ ہی لیتے۔ "ہاں، وہی ہے،" میں نے جاسوسوں کو بتایا۔

"وہ رہا۔" انھوں نے جواب میں سر ہلایا۔ میں فوراً مڑا اور سڑک پر جلدی جلدی چلنے لگا میں اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کر رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ اب پولیس کی کبھی مدد نہیں کروں گا۔

دو چار دن بعد سیلی مجھے باقی کہانی سنانے آئی۔ "مجھے اُس سے ملنا پڑا..... اُس کی حالت ایسی خراب تھی کہ میں اپنے آپ کو بالکل جانور محسوس کرنے لگی۔ اُس نے بس اتنا کہا کہ میں تو تمھیں اپنا دوست سمجھتا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اُس سے کہہ دوں تم روپیہ رکھ لو، لیکن روپیہ تو وہ خرچ کر ہی چکا تھا.... پولیس والوں نے بتایا کہ وہ امریکہ جا تو چکا ہے، لیکن امریکن نہیں ہے، بلکہ پولینڈ کا باشندہ ہے..... ایک اچھی بات یہ ہے کہ اُس پر مقدمہ نہیں چلے گا۔ اُسے ایک ڈاکٹر دیکھنے آیا تھا اور اُسے اب پاگل خانے بھیجا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ وہاں اُس سے اچھا سلوک ہو گا...."

"تو واقعی وہ پاگل تھا؟"

"ہاں، تھا تو۔ مگر بہت تھوڑا سا....." سیلی مسکرانے لگی۔ "لیکن اس میں میرے لئے کوئی بڑی تعریف کی بات نہیں ہے، کیوں ہے؟ اور کرس تمھیں معلوم ہے اُس کی عمر کیا تھی؟ تم اندازہ نہیں لگا سکتے!"

"میرا تو خیال ہے کہ یہی کوئی بیس سال کا ہو گا۔"

"سولہ سال کا!"

"نہیں، بالکل غلط!"

"میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں.... اُس پہ مقدمہ چلتا تو معاملہ بچوں کی عدالت میں

پیش ہوتا!"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ "تمہیں پتہ ہے، سیلی" میں نے کہا، "مجھے تمہاری جو بات خاص طور سے پسند ہے وہ یہ ہے کہ تمہیں دھوکا دینا بڑا آسان ہے۔ جو لوگ کبھی دھوکا نہیں کھاتے بڑے خشک اور بے رنگ ہوتے ہیں۔"

"اچھا تو میں ابھی تک تمہیں پسند ہوں، کرس پیارے؟"

"ہاں، سیلی۔ تم اب بھی مجھے پسند ہو۔"

"مجھے ڈر تھا کہ تم مجھ سے ناراض ہو گئے —— یعنی اُس دن کے بارے میں۔"

"میں ناراض تو تھا۔ اور بہت زیادہ۔"

"لیکن اب تو نہیں ہو؟"

"نہیں..... اب تو نہیں ہوں؟"

"معافی مانگنا یا پوری بات سمجھانے کی کوشش کرنا تو بالکل بے فائدہ ہے...... میں بعض دفعہ کچھ ایسی ہی ہو جاتی ہوں..... تم تو سمجھتے ہی ہو، کیوں، سمجھتے ہو نا کرس؟"

"ہاں،" میں نے کہا۔ "خیال تو ہے۔"

اُس دن کے بعد سے لے کر اب تک میں نے اُسے نہیں دیکھا۔ کوئی پندرہ دن بعد کا ذکر ہے کہ میں سوچ ہی رہا تھا اب تو سیلی کو فون کر کے دیکھنا چاہیئے، اتنے میں پیرس سے ایک کارڈ آیا: "کل رات یہاں پہنچ گئی۔ ٹھیک طرح خط کل کو لکھوں گی۔ بہت بہت پیار۔" مگر اس کارڈ کے بعد کوئی خط نہیں آیا۔ پھر اس واقعے کے مہینے بھر

بعد ایک کارڈ روم سے آیا جس میں کوئی پتہ نہیں لکھا تھا۔ "دو ایک دن میں خط لکھونگی" کارڈ میں لکھا تھا۔ اس بات کو چھ سال ہو گئے۔

چنانچہ اب میں اُسے خط لکھ رہا ہوں۔

سیلی، اگر کبھی ایسا اتفاق ہوا اور یہ سطریں تمہاری نظر سے گزریں تو اسے خراجِ تحسین سمجھ کے قبول کر لینا۔ تمہیں، اور اپنی دونوں کی دوستی کو میں اس سے زیادہ پُرخلوص اور کیا ہدیہ پیش کر سکتا ہوں!

اور مجھے ایک اور کارڈ بھیج دینا۔

جزیرۂ ریوگن میں

(موسم گرما، ۱۹۳۱ء)

میں صبح سویرے اُٹھ بیٹھتا ہوں اور شب خوابی کے لباس ہی میں جا کے برآمدے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ کھیتوں پر جنگل کے لمبے لمبے سائے پڑ رہے ہیں۔ چڑیاں اضطراب انگیز اور ناگہانی شدّت کے ساتھ بول رہی ہیں جیسے الارم والی گھڑیاں بج رہی ہوں۔ برچ کے درخت بوجھ کے مارے دیہاتی سڑک کی ریتلی اور لیکھوں والی مٹی پر جھکے ہوئے ہیں۔ ایک ہلکا سا بادل جھیل کے کنارے درختوں کی قطار سے اُوپر اُٹھتا چلا آ رہا ہے۔ ایک سائیکل والا آدمی اپنے گھوڑے کی نگرانی کر رہا ہے جو راستے کے قریب گھاس کے ایک ٹکڑے پر چر رہا ہے۔ گھوڑے کا پیر رسّی میں اُلجھ گیا ہے۔ وہ آدمی اُسے چھڑانا چاہتا ہے۔ وہ گھوڑے کو دونوں ہاتھوں سے دھکّا دیتا ہے، لیکن گھوڑا ہلتا تک نہیں۔ اب ایک بوڑھی عورت شال میں لپٹی ہوئی ایک چھوٹے سے لڑکے کے ساتھ ٹہلتی ہوئی آتی ہے۔ لڑکا سیاہ رنگ کے ملاحوں جیسے کپڑے پہنے

ہوئے ہے، اُس کا رنگ بالکل زرد ہے اور گلے میں پٹی بندھی ہوئی ہے۔ وہ دونوں بڑی جلدی مڑ جاتے ہیں۔ ایک آدمی سائیکل پر گزرتا ہے اور گھوڑے والے سے کچھ پکار کے کہتا ہے۔ صبح کی خاموشی میں اُس کی آواز خوب گونجتی ہے اور بالکل صاف سنائی دیتی ہے مگر لفظ سمجھ میں نہیں آتے۔ ایک مرغا اذان دیتا ہے۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے سائیکل چرچراتی ہے۔ باغ کے کنج میں جو سفید میز اور کرسیاں رکھی ہیں اُن پر اوس کے قطرے چمک رہے ہیں، اور بنفشئی رنگ کے بھاری بھاری پھولوں سے نیچے ٹپک رہے ہیں۔ ایک اور مُرغا اذان دیتا ہے، اُس کی آواز زیادہ زور کی ہے اور قریب سے آئی ہے۔ اور مجھے خیال ہوتا ہے کہ میرے کان میں سمندر یا بہت دور کی گھنٹیوں کی آواز آ رہی ہے۔

بائیں طرف دور گاؤں جنگل کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ گاؤں میں بس بورڈنگ ہاؤس ہی بورڈنگ ہاؤس ہیں جو ساحلی عمارتوں کے مختلف نمونوں کے مطابق بنے ہوئے ہیں — نقلی قسم کا عربی انداز، بیویریا کا پرانا طرز، تاج محل کا نمونہ، سترھویں صدی کے طرز کے تراشے ہوئے کام کے چھجوں والا کڑیوں کا گھر۔ جنگل کے اُدھر سمندر ہے۔ گاؤں میں سے گزرے بغیر ایک پیچیدہ راستے سے سمندر تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ راستہ یکایک ریتلی پہاڑیوں کے کنارے پہنچا دیتا ہے جس کے نیچے ساحل ہے، اور بالٹک کا اتھلا اور نیم گرم سمندر تقریباً آ آ کے پیروں کو چومتا ہے۔ جھیل کا یہ کنارہ بالکل ویران پڑا رہتا ہے۔ سرکاری طور پر جو نہانے کا گھاٹ بنا ہوا ہے وہ چٹانوں کے اُدھر ہے۔ بابے کے اسٹینڈرڈ رسٹورنٹ کے پیاز کی شکل کے سفید گنبد ایک کلومیٹر کے فاصلے پر گرمی کی سیّال لہروں کے پیچھے تھرتھراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

جنگل میں خرگوش، سانپ اور ہرن رہتے ہیں۔ کل صبح میں نے دیکھا کہ ایک کتّا کھیتوں

اور درختوں میں ایک ہرن کا پیچھا کر رہا ہے۔ کتا ہرن کو نہیں پکڑ سکا، حالانکہ وہی زیادہ تیز دوڑتا معلوم ہو رہا تھا اور بڑی حسین لمبی لمبی چھلانگیں مارتا ہوا جا رہا تھا، اور ہرن زمین پر بڑی وحشیانہ قسم کے تند و تیز جھٹکے کھاتا ہوا اچھل رہا تھا، جیسے کوئی بڑا سایہ یا نوجادو کے اثر سے چلنے لگا ہو۔

اس مکان میں میرے علاوہ دو اور آدمی مقیم ہیں۔ ان میں سے ایک نوانگریز ہے جس کا نام پیٹر ولکنسن ہے اور میری ہی سی عمر کا ہے۔ دوسرا ایک مزدور طبقے کا جرمن لڑکا ہے جس کا نام اوٹو نوواک ہے۔ اُس کی عمر سولہ یا سترہ سال کی ہے۔

انگریز کو میں بڑی بے تکلفی سے پیٹر کہتا ہوں۔ پہلے دن شام کو ہی ہم شراب کے نشے میں دُھت ہو گئے تھے اور بڑی جلدی دوست بن گئے تھے۔ وہ دُبلا پتلا، گہرے سُرخ رنگ کا، اور اعصابی مزاج ہے۔ وہ سینگ کی کمانیوں والی عینک لگاتا ہے۔ جب وہ کچھ جوش میں ہوتا ہے تو اپنے ہاتھ گھٹنوں کے بیچ میں گاڑ دیتا ہے اور انہیں زور زور سے دبانے لگتا ہے۔ اُس کی کنپٹیوں کی رگیں اُبھر آتی ہیں۔ وہ دبی دبی سی اعصابی ہنسی کے مارے کانپنے لگتا ہے، یہاں تک کہ اوٹو چڑ کر اُسے جھڑک دیتا ہے۔

اوٹو کا چہرہ کچھ ایسا ہے جیسے بہت پکا ہوا آڑو۔ اُس کے بال خوبصورت اور گنجان ہیں، اور اُس کے ماتھے تک آتے ہیں۔ اُس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی، چمکتی ہوئی اور شرارت سے لبریز ہیں۔ مسکرانے میں اُس کا جبڑا دور تک کھل جاتا ہے، اور اُس کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ پھر آدمی سے آگے بات ہی نہیں ہوتی۔ اُس کی مسکراہٹ میں اتنی معصومیت ہے کہ اُس کے حقیقی ہونے میں بھی شک ہوتا ہے۔ جب وہ مسکراتا ہے تو اُس کے آڑو جیسے روئیں والے رخساروں میں دو بڑے بڑے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ آجکل وہ بڑی تندہی سے میری خوشامد

میں مصروف ہے، میرے لطیفوں پر ہنستا ہے اور موقع ملتے ہی فوراً میری طرف چالاکی سے آنکھ مارتا ہے جیسے میرے دل کی بات سمجھتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ وہ سمجھتا ہے پیٹر سے اس کے معاملات میں میں اُس کا ساتھی بن جاؤں گا۔

آج صبح ہم سب مل کر نہائے۔ پیٹر اور اوتو ریت کا بڑا سا قلعہ بنانے میں مصروف رہے۔ میں لیٹا پیٹر کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُسے دھوپ میں بڑا مزا آرہا ہے۔ وہ بڑی محنت سے کام کر رہا تھا اور اپنا بچوں والا پھاوڑا ایسے وحشی پن سے چلا رہا تھا جیسے کسی مسلح نگراں کی نظروں کے سامنے کام کرنے والا مجرم۔ حالانکہ صبح بہت گرمی تھی لیکن وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکا۔ وہ اور اوتو پانی میں تیرے، کھدائی کی، کشتی لڑے، بھاگے دوڑے، یا پھر ریت پر ربڑ کی فٹ بال کھیلتے رہے۔ یوں تو پیٹر بالکل دبلا پتلا سوکھا سا ہے مگر ہے چست و چالاک۔ معلوم ہوتا ہے کہ اوتو کے ساتھ کھیلوں میں وہ اپنا بھرم صرف قوتِ ارادی کی انتہائی شدید کوشش سے قائم رکھتا ہے۔ پیٹر کی قوتِ ارادی اور اوتو کے جسم میں مقابلہ ہوتا ہے۔ اوتو بس جسم ہی جسم ہے، پیٹر محض دماغ ہی دماغ اوتو بغیر کسی خاص کوشش کے پانی کی طرح حرکت کرتا ہے۔ اُس کی حرکات و سکنات میں کسی خونخوار اور شاندار جانور کا سا غیر شعوری اور وحشیانہ حسن ہے۔ پیٹر اپنے سخت اور بے ڈھنگے جسم کو اپنی بے رحم قوتِ ارادی کے کوڑے سے پیٹ پیٹ کر چلاتا ہے۔ اوتو کو اپنے اوپر بے انتہا ناز ہے۔ پیٹر نے اُسے ایک سینہ چوڑا کرنے کا آلہ خرید دیا ہے۔ اس سے وہ دن بھر بڑے انہماک کے ساتھ ورزش کرتا رہتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں پیٹر کو ڈھونڈنے اُن لوگوں کے سونے کے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ اوتو بالکل اکیلا ہے اور آئینے کے سامنے اس آلے سے کشتی لڑ رہا ہے۔ "دیکھو کرسٹوف!" اُس نے ہانپتے

ہوئے کہا، "دیکھا۔ میں بھی کرسکتا ہوں! دیکھو پانچوں اسپرنگ ہیں!" اُس کی عمر کے لحاظ سے واقعی اوڈو کے کندھے اور اُس کا سینہ بڑا شاندار ہے ــــ مگر اس کا جسم کچھ تھوڑا سا مضحکہ خیز ہے۔ اُس کے بالائی حصّۂ جسم کی حسین اور پختہ لکیریں یکایک پتلی ہوتی چلی جاتی ہیں اور اُس کے چھوٹے چھوٹے مہمل سُرینوں اور لکڑی جیسی ادھ کچّی ٹانگوں سے مل جاتی ہیں۔ سینہ چوڑا کرنے والے آلے سے یہ کشمکش اُس کے بالائی حصّے کو روز بروز بھاری بنائے چلی جارہی ہے۔

آج شام اوڈو پر دھوپ کا ہلکا سا اثر تھا۔ وہ سر کے درد کی وجہ سے بڑی جلدی سونے چلا گیا۔ پیٹر اور میں ٹہلتے ہوئے گاؤں جا پہنچے۔ بویریا کے کیفے میں جہاں بینڈ اتنا شور وغل مچاتا ہے جیسے جہنّم کا دروازہ کھل گیا ہو، پیٹر نے میرے کان میں چیخ چیخ کے اپنی آپ بیتی سُنائی۔

پیٹر کے خاندان میں چار آدمی ہیں، اور وہ سب سے چھوٹا ہے۔ اُس کے دو بہنیں ہیں اور دونوں کی شادی ہوچکی ہے۔ ایک بہن دیہات میں رہتی ہے اور شکار کھیلتی ہے دوسری بہن سوسائٹی میں بہت ہر دلعزیز ہے، اور بہت دعوتیں کرتی رہتی ہے۔ پیٹر کا بڑا بھائی سائنس دان اور سیّاح ہے۔ وہ کئی مہموں کے ساتھ کانگو، نیو ہیبرائیڈیز، اور گریٹ بیریئر ریف جاچکا ہے۔ وہ شطرنج کھیلتا ہے۔ اُس کی آواز ساٹھ سال کے بڈّھے کی سی ہے، اور جہاں تک پیٹر کو علم ہے اُسے جنسی تجربہ کبھی حاصل نہیں ہوا۔ اپنے خاندان میں آج کل پیٹر کی بول چال صرف شکار کھیلنے والی بہن سے ہے، لیکن اُن کی ملاقات شاذونادر ہی ہوتی ہے، کیونکہ پیٹر کو اپنے بہنوئی سے نفرت ہے۔

جب پیٹر لڑکا تھا تو بڑا نرم و نازک تھا۔ وہ ابتدائی اسکول میں نہیں پڑھا۔ لیکن جب وہ تیرہ سال کا ہوا تو اُس کے باپ نے اُسے ایک پبلک اسکول بھیج دیا۔ اس معاملے میں اُس کے باپ اور ماں کا جھگڑا ہو گیا، جو اُس وقت تک جاری رہا جب تک کہ پیٹر کی اپنی ماں کی ہمّت افزائی سے اختلاجِ قلب شروع نہیں ہو گیا اور دوسری ٹرم کے بعد اُسے اسکول سے ہٹا نہیں لیا گیا۔ وہاں سے ایک دفعہ رہائی پانے کے بعد پیٹر کو اپنی ماں سے نفرت ہو گئی، کیونکہ ماں کے لاڈ پیار نے اُسے ڈرپوک بنا دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ بیٹا اُسے معاف نہیں کر سکتا۔ چونکہ اُس کی اولاد میں پیٹر ہی ایک ایسا تھا جس سے اُسے محبّت تھی اس لئے وہ خود بیمار ہو گئی اور تھوڑے دن بعد مر گئی۔

اب پیٹر کی عمر اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ اُسے اسکول بھیجنا بیکار تھا۔ چنانچہ مسٹر ولکنسن نے گھر پہ ایک استاد رکھ لیا۔ یہ استاد بڑا مذہبی نوجوان تھا اور اس کا ارادہ پادری بننے کا تھا۔ سردیوں میں بھی وہ ٹھنڈے پانی سے نہاتا تھا۔ اُس کے بال بڑے جمے ہوئے اور جبڑا یونانی قسم کا تھا۔ مسٹر ولکنسن کو شروع ہی سے یہ آدمی پسند نہیں آیا، اور بڑے بھائی نے اُس پہ فقرے کسنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ پیٹر بڑی شدت سے استاد کی طرفداری کرنے لگا۔ وہ دونوں تفریح کے لئے پیدل جھیلوں والے علاقے میں جاتے۔ وہ اس بنجر زمین کے بے رنگ مناظر کے درمیان عشائے ربّانی پہ بحث کرتے۔ اس ضمنی گفتگو کا نتیجہ ناگزیر طور پر ایک بڑی پیچیدہ جذباتی اُلجھن کی شکل میں نکلا جو ایک دن شام کو اناج کی کوٹھڑی میں خوفناک جھگڑے کے دوران میں یکایک سلجھ گئی۔ اگلے دن صبح کو استاد چلا گیا اور اس کے لئے دس صفحے کا لمبا چوڑا خط چھوڑ گیا۔ پیٹر خودکشی کے متعلق غور کرتا رہا۔ بعد میں اُسے کسی ذریعے سے معلوم ہوا کہ استاد نے مونچھیں رکھ لی ہیں اور آسٹریلیا چلا گیا ہے۔

چنانچہ پیٹر کو ایک اور استاد مل گیا، اور آخر وہ آکسفورڈ جا پہنچا۔

اُسے اپنے کاروبار اور بھائی کے سائنس دونوں سے نفرت تھی۔ چنانچہ وہ موسیقی اور ادب کو ایک مذہبی عقیدے کی طرح پوجنے لگا۔ پہلے سال تو اُسے آکسفورڈ بہت پسند آیا۔ وہ چار کی دعوتوں میں جاتا تھا اور ہمت کر کے بولتا بھی تھا۔ یہ دیکھ کر اُسے بڑی حیرت اور خوشی ہوتی تھی کہ لوگ اُس کی باتیں واقعی سُن رہے ہیں۔ لیکن جب اس بات کو کچھ دن گزر گئے تو اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی باتیں سن کر لوگ کچھ گڑبڑا سے جاتے ہیں۔ پیٹر کہنے لگا، "نہ معلوم کیا بات تھی، مگر میں ہمیشہ غلط قسم کی بات کہا کرتا تھا۔"

اب اُس کے گھر کا حال سنئے کہ اِس دوران میں وہاں کیا ہو رہا تھا۔ مے فیئر کے اس زبردست مکان میں چار غسل خانے اور موٹروں کے لئے تین گیرج تھے، اور کھانے پینے کے لئے ہمیشہ ضرورت سے زیادہ رہتا تھا۔ مگر ولکنسن خاندان آہستہ آہستہ ریزہ ریزہ ہوا جا رہا تھا جیسے کوئی گلی سڑی چیز۔ مسٹر ولکنسن کو گُردوں کا عارضہ تھا۔ وہ وسکی بہت پیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ "آدمیوں کو برتنا" مجھے خوب آتا ہے۔ انہیں ہر وقت غصہ آتا رہتا تھا اور کچھ حکیم میں رہتے تھے۔ اُن کی حالت تھوڑی سی قابلِ رحم تھی۔ اُن کے بچے اُن کے قریب سے گزرتے تو وہ چڑچڑے بڈھے کتے کی طرح غرّاتے اور پھاڑ کھانے کو دوڑتے۔ کھانے کے وقت کوئی آدمی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے آنکھیں بچاتے رہتے تھے اور کھانا ختم ہوتے ہی جلدی جلدی اُوپر جا کے اپنے بے تکلف دوستوں کو نفرت اور طنز سے بھرے ہوئے خط لکھتے تھے۔ صرف ایک پیٹر ایسا تھا جس کا کوئی دوست نہیں تھا جو اُسے خط لکھے۔ وہ اپنے قیمتی مگر بے ہنگم سامان سے مزیّن سونے کے کمرے میں اپنے آپ کو بند کر لیتا اور پڑھتا رہتا۔

اور اب آکسفرڈ میں بھی یہی حال ہوگیا۔ پیٹر اب بجائے کی دعوتوں میں نہیں جاتا تھا وہ سارا دن کام کرتا رہتا تھا۔ امتحانوں سے کچھ دن پہلے اُسے اعصابی دورہ پڑا۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ رہنے کی جگہ اور دلچسپیاں بالکل بدل دو۔ پیٹر کے باپ نے اُسے تفریح طبع کے لئے ڈیون شائر میں چھ مہینے تک کھیتی باڑی میں لگائے رکھا۔ پھر انہوں نے کاروبار کا ذکر شروع کر دیا۔ مسٹر ولکنسن کوشش کے باوجود اپنے دوسرے بچوں میں اپنی آمدنیوں کے ذریعے سے یونہیں جھوٹ موٹ کی دلچسپی بھی پیدا نہیں کر سکے تھے۔ وہ سب اپنی اپنی دنیاؤں میں رہتے تھے اور ناقابل تسخیر تھے۔ اُن کی ایک بیٹی کی شادی ایک نواب سے ہونے والی تھی، دوسری بیٹی اکثر پرنس آف ویلز کے ساتھ شکار کھیلا کرتی تھی۔ اُن کا بڑا بیٹا شاہی جغرافیائی انجمن کے سامنے مقالے پڑھتا تھا۔ صرف پیٹر کے پاس اپنے وجود کا کوئی جواز نہیں تھا۔ دوسرے بچوں کی حرکات خود غرضانہ تھیں، لیکن وہ اتنا تو جانتے تھے کہ چاہتے کیا ہیں۔ پیٹر کی باتیں بھی خود غرضانہ تھیں، مگر اُسے بالکل پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ لیکن بالکل ٹھیک وقت پیٹر کا ماموں مرگیا۔ یہ ماموں کینڈا میں رہتا تھا۔ اُس نے پیٹر کو بچپن ہی میں دیکھا تھا اور اُسے بہت پسند کیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنا سارا روپیہ اُس کے نام چھوڑ مرا تھا۔ روپیہ زیادہ تو نہیں تھا، مگر آرام سے زندگی بسر کرنے کو کافی تھا۔

وہ پیرس چلا گیا، اور موسیقی سیکھنے لگا۔ اُس کے استاد نے اس سے کہا کہ تم دوسرے درجے کے معمولی موسیقی دان سے زیادہ اور کچھ نہیں بن سکتے۔ لیکن اس پر وہ اور بھی زیادہ محنت کرنے لگا۔ وہ صرف سوچنے سے بچنے کے لئے کام کرتا تھا۔ اُس پر پھر اعصابی دورہ پڑا، لیکن اتنے زور کا نہیں جیسے پہلے پڑ چکا تھا۔ اب اُسے یقین ہوگیا کہ میں جلدی ہی

پاگل ہوجاؤں گا۔ وہ اپنے گھر والوں سے ملنے لنڈن پہنچا تو دیکھا وہاں صرف اس کے باپ ہیں پہلے دن شام کو دونوں میں خوب زور کا جھگڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے بالکل نہیں بولے۔ ہفتے بھر تک دونوں بالکل خاموش رہے اور خوب دبا دبا کے کھانا کھاتے رہے اب پیٹر پر قتل کا ہلکا سا جنون سوار ہوا۔ اُس کے باپ کی گردن پر ایک مہاسا تھا، ناشتے کے دوران میں وہ اس پر سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ وہ روٹی کاٹنے کی چھری سے کھیلنے لگا۔ یکایک اُس کے چہرے کا بایاں حصہ پھڑکنے لگا، اور اتنا زیادہ پھڑکا کہ اُسے ہاتھ سے اپنا رخسار ڈھک لینا پڑا اُسے یقین تھا کہ میرے باپ نے سب کچھ دیکھ لیا ہے مگر جان بوجھ کے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ رہے ہیں — بلکہ ارادی طور پر اُس کے ذہن کو تکلیف دے رہے ہیں۔ آخر پیٹر سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ اچھل پڑا اور بھاگ کے کمرے سے، بلکہ گھر سے بھی باہر نکل گیا اور باغ میں جا پہنچا۔ وہاں وہ بھیگی ہوئی گھاس پر منھ کے بل گر پڑا۔ اور دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔ ڈر کے مارے وہ ہل تک نہیں رہا تھا۔ پاؤ گھنٹے کے بعد چہرے کا پھڑکنا بند ہو گیا۔

اُسی دن شام کو وہ ٹہلتا ہوا ریجنٹ اسٹریٹ نکل گیا اور ایک رنڈی کو ساتھ لے لیا۔ وہ دونوں اُس لڑکی کے کمرے میں پہنچے اور گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ اُس نے لڑکی کو اپنے گھر کے سارے حالات سنائے، اُسے دس پونڈ دیئے اور بوسہ تک لئے بغیر اُسے چھوڑ کر چلا آیا اگلے دن صبح کو اس کی بائیں ران پر ایک عجیب و غریب قسم کا دانہ نکل آیا۔ ڈاکٹر بالکل نہ سمجھ سکا کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اُس نے ایک مرہم بتا دیا۔ دانہ ہلکا پڑ گیا، لیکن پچھلے مہینے جا کے غائب ہوا ہے۔ ریجنٹ اسٹریٹ کے واقعے کے تھوڑے ہی دن بعد پیٹر کی بائیں آنکھ میں بھی کچھ تکلیف شروع ہو گئی۔

کچھ دن وہ تحلیلِ نفسی کے کسی ماہر سے مشورہ لینے کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر

میں اُس نے فرائٹ کے ایک بہت بڑے راسخ العقیدہ پیرو کو انتخاب کیا جس کی آواز چڑچڑی اور نیند میں ڈوبی ہوئی سی تھی اور پیر بہت بڈھے بڑے تھے۔ پہلی ہی نظر میں پیٹر نے اُسے بُرا ناپسند کیا اور اُسے بتا بھی دیا۔ فرائٹ کا پیرو ایک کاغذ پر ساری باتیں لکھتا رہا، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے بُرا نہیں مانا۔ بعد میں پیٹر کو پتہ چلا کہ اُسے چینی آرٹ کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔ اُن کی ملاقات ہفتے میں تین دفعہ ہوتی تھی اور ملاقات پر دو گنیاں خرچ ہوتی تھیں۔

چھ مہینے بعد اُس نے فرائٹ کے اس پیرو کو چھوڑ دیا اور ایک نئے ماہر کے پاس جانا شروع کر دیا۔ یہ ایک فن لینڈ کی عورت تھی جس کے بال سفید تھے اور بے تکلفی سے بڑی مزے دار باتیں کرتی تھی۔ پیٹر نے دیکھا کہ اُس سے باتیں کرنے میں اُسے بڑی آسانی ہوتی ہے۔ اُس نے جو کچھ بھی کیا تھا، کہا تھا، سوچا تھا، یا جتنے خواب دیکھے تھے، سب باتیں اپنی پوری لیاقت سے کام لیتے ہوئے اُسے سنا دیں۔ بعض وقت جب اُس کی ہمت پست ہوتی تو وہ اُسے ایسی کہانیاں سنا دیتا جو بالکل جھوٹ تھیں، یا نفسیات کی کتابوں میں سے لی گئی تھیں۔ بعد میں وہ اس دروغ گوئی کا اعتراف کر لیتا، اور وہ بحث کرتے کہ یہ مقاصد بڑے دلچسپ تھے۔ بعض نہ تریں راتیں ایسی آتیں کہ پیٹر کوئی خواب دیکھ لیتا، اور اس سے انہیں اگلے کئی ہفتوں کے لئے گفتگو کا ایک موضوع مل جاتا۔ نفسیاتی تحلیل دو سال تک جاری رہی، اور کبھی مکمل نہیں ہوئی۔

اس سال پیٹر فن لینڈ کی خاتون سے اُکتا گیا۔ اُس نے برلن کے ایک بڑے اچھے آدمی کا نام سنا۔ تو پھر اسے بھی کیوں نہ آزمایا جائے؟ اور کچھ نہ سہی تو تھوڑی سی تبدیلی رہیگی۔ پھر اس میں بچت بھی تھی۔ برلن والا آدمی ایک دفعہ کے صرف پندرہ مارک لیتا تھا۔

"اور تم اب بھی اُس کے پاس جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ..... ، " پیٹر مسکرایا۔ " اتنے پیسے ہی نہیں "

پچھلے مہینے یہاں آنے کے دو ایک دن بعد پیٹر نہانے کے لئے وان سی گیا۔ پانی ابھی تک ٹھنڈا تھا، اور بہت ہی کم لوگ وہاں آتے تھے۔ پیٹر نے ایک لڑکا دیکھا جو ریت پر اکیلے فلا بازیاں کھا رہا تھا۔ بعد میں لڑکا اُس کے پاس آیا اور دیا سلائی مانگی۔ پھر دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔ یہ لڑکا اوٹو نوواک تھا۔

"جب میں نے اوٹو کو تحلیلِ نفسی کے ماہر کے بارے میں بتایا تو وہ ششدر رہ گیا، اور بولا، " ارے، تم اُسے بس اپنی باتیں سننے کے پندرہ مارک روزانہ دیتے ہو! لاؤ مجھے دس مارک ہی دو، میں دن تو دن، رات بھر تم سے باتیں کیا کروں گا!" ہنسی کے مارے پیٹر کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے، اُس کا چہرہ بالکل سرخ ہو گیا اور وہ اپنے ہاتھ مروڑنے لگا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ جب اوٹو نے تحلیلِ نفسی کے ماہر کی جگہ اپنی خدمات پیش کیں تو وہ صرف مضحکہ خیز باتیں نہیں کر رہا تھا۔ بہت سے جانور صفت لوگوں کی طرح اُس میں بھی فطری طور پر علاج کی قوتیں موجود ہیں، اور جب چاہے انہیں استعمال کر سکتا ہے۔ ایسے وقت وہ جس طریقے سے پیٹر کا علاج کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور کبھی خطا نہیں کرتا۔ مثلاً پیٹر میز کے سامنے کمر جھکائے پژمردہ سا بیٹھا ہے، اُس کے نیچے کی طرف خمیدہ منہ پر طفلانہ خوف کی شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی بیش قیمت اور پیچیدہ تربیت کی مکمل تصویر ہے۔ اتنے میں اوٹو اندر آتا ہے، مسکرانے لگتا ہے، اُس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں، وہ ایک کرسی الٹ دیتا ہے، پیٹر کی کمر پر تھپیڑ مارتا ہے، اپنے ہاتھ ملتا ہے اور احمقوں کی طرح کہتا ہے، "ہاں ہاں ..... بالکل ہٹیلا بنے ہوئے ہو!" اور ایک لمحے

کے اندر پیٹر کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ اُس کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور وہ بالکل فطری طریقے سے بیٹھ جاتا ہے۔ اُس کے منہ پر سے وہ سختی بھی غائب ہو جاتی ہے اور اُس کی آنکھوں کی وحشت بھی دُور ہو جاتی ہے۔ جب تک یہ جادو کا سا اثر قائم رہتا ہے اُس کی حالت بالکل معمولی آدمیوں کی سی ہوتی ہے۔

پیٹر نے مجھے بتایا ہے کہ اوٹو سے ملاقات ہونے سے پہلے وہ جراثیم سے اتنا ڈرتا تھا کہ اگر کسی بلی کو چھو لیتا تو کاربولک صابن سے اپنے ہاتھ دھوتا۔ آجکل وہ اکثر اوٹو ہی کے گلاس میں پانی پی لیتا ہے، اس کا اسفنج استعمال کرتا ہے اور ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھا لیتا ہے۔

کُور ہاؤس اور جھیل والے کیفے میں ناچ شروع ہو گیا ہے۔ پہلے ناچ کا اعلان دو دن ہوئے ہم نے اُس وقت دیکھا تھا جب ہم گاؤں کے بڑے بازار میں شام کو ٹہلنے جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اوٹو اشتہار کو مغموم سی نظروں سے دیکھ رہا ہے، اور پیٹر نے بھی اُس کی یہ حرکت دیکھ لی ہے۔ مگر دونوں میں سے کسی نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔

کل کا دن ٹھنڈا اور نم آلود تھا۔ اوٹو نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک کشتی کرائے پہ لے لیں اور جھیل میں مچھلیوں کا شکار کھیلنے چلیں۔ پیٹر اس تجویز سے بہت خوش ہوا اور فوراً راضی ہو گیا۔ لیکن ہم پون گھنٹے تک پھوار میں بیٹھے انتظار کرتے رہے اور کوئی مچھلی نہ لگی تو پیٹر کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ جب ہم کنارے کو واپس جا رہے تھے تو اوٹو پتوار سے پانی اڑانے لگا۔ پہلے تو اس وجہ سے کہ وہ ٹھیک طرح کشتی کھے نہیں سکتا تھا، پھر پیٹر کو چڑانے کے لئے۔ پیٹر کو بڑا غصہ آیا اور وہ اوٹو کو گالیاں دینے لگا۔ اوٹو منہ پھلا کے

بیٹھ گیا۔

کھانے کے بعد اوٹو نے بتایا کہ میں کورہا ؤس میں ناچنے جا رہا ہوں۔ پیٹر نے ایک لفظ نہیں کہا اور بڑے مشتبہ انداز میں خاموش بیٹھا رہا۔ اُس کے منہ کے کنارے لٹک آئے۔ اوٹو کو یا تو واقعی اُس کی ناراضگی کا احساس ہی نہیں ہوا یا اُس نے دیدہ و دانستہ اسے نظرانداز کر دیا، اور یہ فرض کر لیا کہ معاملہ طے ہو گیا۔

جب وہ باہر چلا گیا تو پیٹر اور میں دونوں اُوپر میرے سرد کمرے میں بیٹھ گئے اور کھڑکی پر بارش کی پٹ پٹ سننے لگے۔

"میں سمجھتا ہی تھا کہ بات چل نہیں سکتی۔" پیٹر نے افسردگی سے کہا۔ "شروعات تو ہو ہی گئی۔ تم خود دیکھ لو گے۔"

"بیوقوفی کی باتیں کر رہے ہو پیٹر۔ کس بات کی شروعات ہے؟ بالکل فطری بات ہے کہ کبھی نہ کبھی تو پیٹر کا دل ناچنے کو چاہے گا ہی۔ اُس پر ایسا قبضہ مت جماؤ۔"

"میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں۔ اپنی عادت کے مطابق میں بالکل غیر معقول باتیں کر رہا ہوں .... بہرحال شروعات تو ہو ہی گئی ....."

یہ دیکھ کر خود مجھے تعجب ہوا کہ واقعات نے میری بات صحیح ثابت کر دکھائی۔ اوٹو دس بجے سے پہلے کورہا ؤس سے واپس آ گیا۔ اُسے بڑی مایوسی ہوئی تھی وہاں بہت کم آدمی تھے، اور بینڈ بہت خراب تھا۔

"میں اب کبھی نہیں جاؤں گا۔" اُس نے نڈھال سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اب میں ہر روز شام کو یہیں تمہارے اور کرسٹوفر کے ساتھ رہا کروں گا۔ جب ہم تینوں ساتھ ساتھ بیٹھتے ہیں تو بڑا مزا رہتا ہے۔"

کل صبح ہم لوگ ساحل پہ اپنے ریت کے قلعے میں لیٹے تھے کہ اتنے میں ایک پستہ قد، حسین بالوں، نیولے جیسی نیلی آنکھوں اور چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا آدمی ہمارے پاس آیا اور ہم سے اپنے ساتھ ایک کھیل میں شامل ہو جانے کو کہا۔ اوٹو کو اجنبیوں سے بڑی شدید دلچسپی تھی۔ چنانچہ اُس نے فوراً منظور کر لیا۔ اب پیٹر اور میں دو ہی باتیں کر سکتے تھے، یا تو بداخلاقی برتیں اور انکار کر دیں یا اوٹو کی پیروی کریں۔

پستہ قد آدمی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ برلن کے ایک اسپتال میں ڈاکٹر ہے اس کے بعد اُس نے فوراً ہی کمان سنبھال لی، اور ہر ایک کو مختلف جگہوں پر مقرر کرنے لگا کہ تم یہاں کھڑے ہو اور تم یہاں۔ اس معاملے میں اُس نے بڑی سختی برتی — میں نے تھوڑا سا قریب آجانے کی کوشش کی تاکہ مجھے اتنی دور گیند نہ پھینکنی پڑے، یہ دیکھتے ہی اُس نے فوراً حکم دے کے مجھے پیچھے ہٹا دیا۔ پھر پتہ چلا کہ پیٹر بالکل غلط طریقے سے گیند پھینک رہا ہے یہ بات ثابت کرنے کے لئے ڈاکٹر نے کھیل روک دیا۔ پہلے تو اس میں پیٹر کو بڑا مزا آیا، مگر تھوڑی دیر بعد وہ چڑ سا گیا۔ اُس نے بڑی بدتمیزی سے جواب دیا، مگر ڈاکٹر پہ ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ "آپ اپنے بدن کو اتنا سخت کیوں رکھتے ہیں،" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہی تو غلطی ہے۔ بدن بالکل ڈھیلا چھوڑ دیجئے — اس طرح — سمجھے آپ؟ پھر کوشش کیجئے۔ میں آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھے رہوں گا، دیکھوں گا کہ واقعی آپ بدن ڈھیلا چھوڑتے بھی ہیں یا نہیں۔۔۔۔ نہیں، اب کے ڈھیلا نہیں چھوڑا!"

معلوم ہوتا تھا کہ اُسے بڑی خوشی ہوئی جیسے پیٹر کی ناکامیابی اُس کے تعلیمی طریقوں کی بڑی زبردست فتح ہو۔ اُس کی آنکھیں اوٹو کی آنکھوں سے ملیں۔ اوٹو مسکرانے لگا جیسے

سب کچھ سمجھ گیا ہو۔

ڈاکٹر سے ہماری ملاقات نے پیٹر کی طبیعت کو دن بھر کے لئے بدمزہ کر دیا۔ اُسے ستانے کے لئے اوٹو یہ دکھانے کی کوشش کرنے لگا کہ مجھے ڈاکٹر بہت پسند آیا ہے۔ "میں ایسے ہی آدمی کو دوست بنانا چاہتا ہوں،" اُس نے پیٹر کو جلانے کے لئے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے اصلی کھلاڑی! پیٹر، تمہیں بھی کھیلوں میں حصّہ لینا چاہیئے! پھر تمہارا جسم بھی ایسا ہی ہو جائے گا جیسا اُس کا ہے!"

اگر پیٹر کا مزاج ذرا درست ہوتا تو شاید وہ اس بات پر مسکرانے لگتا۔ لیکن اس وقت تو اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی: "اگر تمہیں ڈاکٹر ایسا ہی پسند ہے تو جاؤ ڈاکٹر کے ساتھ چلے جاؤ!"

اوٹو اُسے چڑانے کے لئے ہنسنے لگا: "اُس نے ابھی مجھ سے چلنے کو کہا نہیں!"

کل شام اوٹو کورہاؤس میں ناچنے کے لئے گیا تھا، اور بہت رات گئے واپس آیا۔

آجکل گاؤں میں گرمیاں گذارنے کے لئے بہت سے آدمی آئے ہوئے ہیں۔ گھاٹ کے قریب جو نہانے والا ساحل ہے وہاں جھنڈیوں کی قطاریں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں، اور یہ جگہ زمانۂ متوسّط کی چھاؤنی سی لگنے لگی ہے۔ ہر خاندان کے پاس بید کی چھتری دار زبردست کرسی ہے، اور ہر کرسی پر چھوٹی سی جھنڈی اُڑتی رہتی ہے۔ ہیمبرگ، ہینوور، ڈریسڈن، اور قومی جماعت، جمہوری جماعت اور نازی جماعت کے جھنڈے بھی۔ ہر کرسی کے چاروں طرف ریت کا اونچا سا پشتہ ہوتا ہے جس پر اُن کرسیوں کے مالکوں نے صنوبر کے پھلوں سے طرح طرح کے کتبے لکھ رکھے ہیں: "آرام گاہ،" "والٹر خاندان،" "استھال ہیلم،"

"ہائل ہٹلر!" بہت سے قلعوں پر نازی سواستیکا بھی لگی ہوئی ہے۔ کل صبح میں نے ایک پانچ سال کا بچّہ دیکھا جو بالکل ننگا تھا اور اکیلا کندھے پر سواستیکا والا جھنڈا رکھے یہ گیت گاتا ہوا فوجیوں کی طرح مارچ کرتا جا رہا تھا: "جرمنی سب ملکوں سے بلند و برتر ہے۔"

پستہ قد ڈاکٹر کو یہ ماحول بہت پسند ہے۔ ہر روز صبح کو اپنا تبلیغی فرض پورا کرنے وہ ہمارے قلعے پہنچتا ہے۔ "آپ لوگوں کو واقعی دوسرے ساحل پر چلنا چاہیئے۔" وہ ہم سے کہتا ہے۔ "وہاں بڑی دلگی رہتی ہے۔ میں آپ کی ملاقات کئی اچھّی اچھّی لڑکیوں سے کراؤں گا یہاں لوگ واقعی بڑے شاندار قسم کے ہیں۔ میں اُن کی خوبیاں جانتا ہوں، آخر کو ڈاکٹر ہوں نا۔ کل میں ہڈنسی گیا تھا۔ وہاں بس یہودی ہی یہودی تھے، اور کوئی نہیں تھا! یہاں واپس آکے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں نورڈک نسل کے لوگ تو دکھائی دیتے ہیں!"

"چلو دوسرے ساحل پر چلیں۔" اوٹو نے ہمیں اُکسایا۔ "یہاں تو بڑی بے لطفی رہتی ہے کوئی ہے ہی نہیں یہاں۔"

"تم چاہو تو چلے جاؤ۔" پیٹر نے طعن آمیز غصّے کے ساتھ جواب دیا۔ "میں تو وہاں کچھ ٹھیک نہیں رہوں گا۔ میری دادی میں تو تھوڑا سا اسپینی خون تھا۔"

لیکن ڈاکٹر ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ہم اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ کم و بیش صاف صاف لفظوں میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کر دیتے ہیں، لیکن ان باتوں سے وہ اور اُلٹا ہمارے اُوپر فریفتہ ہوتا ہے۔ اوٹو ہمارے راز افشا کر کر کے ہمیں اُس کے ہاتھوں میں پھنسواتا رہتا ہے ایک دن ڈاکٹر ہٹلر کا ذکر بڑے جوش و خروش سے کر رہا تھا۔ اوٹو کہنے لگا۔ "ڈاکٹر صاحب کرسٹوفر کو سمجھانا بالکل بیکار ہے، یہ تو کمیونسٹ ہیں!"

معلوم ہوتا تھا کہ یہ سن کر ڈاکٹر کو بڑی خوشی ہوئی۔ اُس کی نیولے جیسی نیلی آنکھیں فتح

کے احساس سے چمکنے لگیں۔ اُس نے بڑے پیار سے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"لیکن آپ کمیونسٹ نہیں ہو سکتے! بالکل نہیں ہو سکتے!"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" میں نے سرد مہری سے دور ہٹتے ہوئے پوچھا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے چھوئے، اس سے مجھے بڑی نفرت ہے۔

"کیونکہ کمیونزم جیسی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایک ذہنی دھوکا ہے۔ ایک ذہنی بیماری۔ لوگ صرف تصوّر کرتے ہیں کہ ہم کمیونسٹ ہیں، لیکن وہ درحقیقت ہوتے نہیں۔"

"پھر کیا ہیں؟"

لیکن وہ سُن ہی نہیں رہا تھا۔ بلکہ نیولے جیسی ظفرمندانہ مسکراہٹ سے میری طرف گھور رہا تھا۔

"پانچ سال پہلے میں بھی آپ ہی کی طرح سوچتا تھا، لیکن ذہنی اسپتال میں کام کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ کمیونزم محض ذہنی دھوکا ہے۔ اصل میں لوگوں کو ضبطِ نفس اور نظام کی ضرورت ہے۔ سمجھ لیجئے کہ یہ باتیں ایک ڈاکٹر کہہ رہا ہے، میں اپنے تجربے سے یہ ساری باتیں جانتا ہوں۔"

آج صبح سب لوگ میرے کمرے میں نہانے جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ کمرے کی فضا میں بڑا ہیجان تھا کیونکہ پیٹر اور اوٹو کے درمیان ناشتے سے پہلے انہیں کے کمرے میں ایک عجیب مبہم قسم کا جھگڑا شروع ہوا تھا جو ابھی تک جاری تھا۔ میں اُن کی باتیں زیادہ توجہ سے نہیں سن رہا تھا اور ایک کتاب کے ورق الٹ رہا تھا۔ یکایک پیٹر نے اوٹو کے منہ پر دونوں طرف بڑے زور کے دو تھپڑ دیئے۔ اس کے بعد وہ فوراً گتھم گتھا ہو گئے اور کمرے بھر میں

لڑکھڑاتے ہوئے دھکا پیل کرنے لگے اور کرسیاں دھڑا دھڑ گرنے لگیں۔ میں انہیں لڑتے ہوئے دیکھتا رہا، اور اپنے ہاتھ پیر بچاتا رہا۔ تماشہ تھا تو بڑی ہنسی کا، مگر ساتھ ہی ساتھ ناخوشگوار بھی تھا، کیونکہ غصّے نے اُن کے چہروں کو بدصورت اور عجیب و غریب بنا دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اوٹو نے پیٹر کو زمین پر گرا دیا اور اُس کی بانہہ مروڑنے لگا۔ "بولو، چکھ لیا مزا؟" وہ پوچھے جا رہا تھا۔ پھر وہ مسکرانے لگا؛ اُس وقت وہ بڑا مکروہ معلوم ہو رہا تھا اور عداوت نے اُس کی شکل مسخ کر دی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اوٹو میرے وہاں موجود ہونے سے خوش ہے، کیونکہ میری موجودگی سے پیٹر کی اور زیادہ تذلیل ہوئی ہے۔ چنانچہ میں ہنس پڑا گویا یہ ساری لڑائی محض مذاق میں ہوئی تھی، اور کمرے سے نکل گیا۔ میں جنگل میں ٹہلتا ہلیے جا پہنچا، اور نہاتا ہوا ساحل سے بہت دور نکل گیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کئی گھنٹے تک ان دونوں میں سے کسی کا بھی منہ نہ دیکھوں۔

اگر اوٹو پیٹر کو ذلیل کرنا چاہتا ہے تو پیٹر بھی اپنے طریقے سے اوٹو کو ذلیل کرنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اوٹو کو مجبور کر کے اپنی قوّتِ ارادی کے سامنے جھکا دے، اور اوٹو بالکل جبلّی طور سے اس طرح جھک جانے سے انکار کرتا ہے۔ اوٹو کسی جانور کی طرح فطری اور صحت مندانہ طریقے پر خودغرض ہے۔ اگر کمرے میں دو کرسیاں ہوں تو وہ بے جھجک زیادہ آرام دہ کرسی پر بیٹھ جاتا ہے، کیونکہ پیٹر کے آرام کا لحاظ کرنے کا تو اُسے کبھی خیال تک نہیں آتا۔ پیٹر کی خودغرضی اتنی ایماندارانہ نہیں ہے، بلکہ زیادہ مہذّب اور زیادہ گمراہ ہے اگر اس سے مناسب طریقے سے التجا کی جائے تو وہ ہر قسم کی قربانی کر سکتا ہے، چاہے یہ بات کتنی ہی غیر معقول اور غیر ضروری کیوں نہ ہو۔ لیکن جب اوٹو زیادہ اچھی کرسی پر اس طرح بیٹھ جاتا ہے جیسے اُس کا حق ہو تو اس حرکت میں پیٹر کو فوراً ایک دعوتِ جنگ نظر

آتی ہے جسے قبول کرنے سے وہ انکار نہیں کر سکتا. میرا خیال ہے کہ ان دونوں کے مخصوص مزاجوں کے ساتھ تو اس صورتِ حال سے رہائی بالکل ناممکن ہے. پیٹر مجبور ہے کہ اوڈو کو اپنے سامنے جھکانے کے لیئے جدوجہد کرتا رہے. جب آخر کار اُس کی یہ جدوجہد ختم ہو جائیگی تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ اُسے اوڈو سے کوئی دلچسپی نہیں رہی.

اُن کے تعلقات کا اصلی تخریبی پہلو یہ ہے کہ ان تعلقات میں بنفسہٖ اکتاہٹ اور کوفت کا عنصر موجود ہے. یہ بالکل فطری بات ہے کہ پیٹر اکثر اوڈو سے اُکتا جاتا ہے ——— ایک بھی چیز ایسی نہیں ہے جس سے دونوں کو برابر کی دلچسپی ہو ——— لیکن جذباتی وجوہات سے پیٹر کبھی قبول نہیں سکتا کہ ہاں، میں اُکتا گیا ہوں. اوڈو کے لیئے بہانہ بنانے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے. وہ بڑی صفائی سے کہہ دیتا ہے: "یہاں تو بڑی کوفت ہوتی ہے!" ایسے وقت میں ہمیشہ یہ تماشہ دیکھتا ہوں کہ پیٹر تلملا اٹھتا ہے اور اُس کے چہرے پر درد کا احساس چھا جاتا ہے. لیکن دراصل اوڈو کو اتنی زیادہ کوفت نہیں ہوتی جتنی خود پیٹر کو. اُسے پیٹر کی صحبت میں واقعی مزا آتا ہے، اور وہ بڑی خوشی سے دن بھر اس کے ساتھ رہ سکتا ہے. اکثر جب اوڈو گھنٹہ بھر تک رُکے بغیر بے کار بک بک کرتا چلا جاتا ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ پیٹر کا جی چاہ رہا ہے وہ خاموش ہو جائے اور اُس کے پاس سے چل دے لیکن پیٹر کی نظروں میں اس بات کا اعتراف مکمّل شکست کے مترادف ہوگا. چنانچہ وہ ہنسنے اور اپنے ہاتھ ملنے لگتا ہے، اور مجھ سے خاموش نظروں میں التجا کرتا ہے کہ وہ جو اپنے آپ کو دھوکا دے کر یہ سمجھاتا رہتا ہے کہ اوڈو بڑا مزیدار اور دلچسپ آدمی ہے، تو میں اس کام میں اُس کی مدد کروں.

جب میں نہانے کے بعد جنگل میں سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ گورے رنگ کا پستہ قد نیولے جیسا ڈاکٹر میری طرف آ رہا ہے۔ اب اس کا موقع نہیں رہا تھا کہ پلٹ جاؤں میں نے انتہائی خوش اخلاقی اور سرد مہری سے اُسے سلام کیا۔ ڈاکٹر نے نکر اور سوئٹر پہن رکھا تھا۔ اُس نے بتایا کہ میں جنگل میں دوڑ رہا تھا۔ "لیکن اب تو سوچتا ہوں کہ لوٹ چلوں،" وہ کہنے لگا۔ "آئیے آپ بھی میرے ساتھ تھوڑا سا دوڑیے۔"

"معاف کیجیے گا، میں دوڑ نہیں سکتا۔" میں نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "کل میرے ٹخنے میں ذرا سی موچ آگئی ہے۔"

جب میں نے اُس کی آنکھوں میں فتح کی چمک دیکھی تو جی چاہا کہ دانتوں سے زبان کا قیمہ کر کے رکھ دوں۔ "اچھا، آپ کے ٹخنے میں موچ آگئی ہے؟ لائیے ذرا دیکھوں تو!" نفرت کے مارے میں نے پیچ و تاب تو بہت کھایا۔ مگر اُس کی اُنگلیوں کے ٹھوکے برداشت کرنے پڑے۔ "مگر آپ کا ٹخنا تو بالکل ٹھیک ہے۔ ذرا بھی خرابی نہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

راستے میں ڈاکٹر مجھ سے پیٹر اور راڈو کے بارے میں سوال پوچھنے لگا۔ ہر نکیلی اور مستفسرانہ چوٹ کے بعد وہ سر گھما کر میری طرف دیکھتا تھا۔ تجسّس کے مارے اُس کی بُری حالت ہو رہی تھی۔

"ذہنی شفا خانے میں کام کرنے سے میں نے یہ سبق سیکھا ہے کہ اس قسم کے لڑکے کی مدد کرنا بالکل بے کار ہے۔ آپ کے دوست بڑے فیّاض اور پُرخلوص ہیں، لیکن وہ بڑی زبردست غلطی کر رہے ہیں۔ اس قسم کا لڑکا ہمیشہ اپنی اصلی حالت کو لوٹ جاتا ہے۔ البتہ علمی نقطۂ نظر سے وہ مجھے بڑا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر یکایک پگڈنڈی کے بیچ میں رُک کے کھڑا ہوگیا جیسے کوئی بہت ہی اہم بات کہنے والا ہو، میری توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کے لئے ذراسی دیر خاموش رہا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا: "اُس کا سر مجرموں کا سا ہے!"

"کیا آپ کی رائے میں مجرموں کے سے سر والے آدمیوں کو مجرم بننے کے لئے یوں ہی چھوڑ دینا چاہیئے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ میں تو نظام کا قائل ہوں۔ ان لڑکوں کو محنت گاہوں میں رکھنا چاہیئے۔"

"اچھا، جب یہ لڑکے وہاں پہنچ جائیں گے تو پھر آپ ان کا کیا بنائیں گے؟ آپ کہتے ہیں کہ اُن کا مزاج بدلا ہی نہیں جا سکتا۔ تو پھر میرا خیال ہے کہ آپ اُنہیں عمر بھر قید رکھیں گے؟"

ڈاکٹر خوش ہو کر ہنسنے لگا جیسے اُس پر فقرہ کسا گیا تھا مگر وہ پھر بھی اس سے لطف لے سکتا تھا۔ اُس نے بڑے پیار سے میرے بازو پر ہاتھ رکھ دیا:

"آپ تو مثالیت پرست ہیں! یہ نہ خیال کیجیئے گا کہ میں آپ کا نقطۂ نظر نہیں سمجھتا۔ مگر یہ نقطۂ نظر غیر علمی ہے، بالکل غیر علمی۔ آپ اور آپ کے دوست اوٹو جیسے لڑکوں کو نہیں سمجھتے۔ اُنہیں تو میں ہی خوب سمجھتا ہوں۔ ہر ہفتے ایسے ایک دو لڑکے میرے شفاخانے میں آتے ہیں، اور مجھے گلے کے غدود وغیرہ کی خرابیوں کی وجہ سے اُن کا آپریشن کرنا پڑتا ہے۔ تو سمجھے نا آپ، میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں!"

"یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ آپ اُن کے حلق اور کانوں سے واقف ہیں۔"

شاید میری جرمن اتنی اچھی نہیں تھی کہ اس آخری فقرے کا مطلب ٹھیک طرح ادا

کر سکوں، بہرحال ڈاکٹر نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ "میں اس قسم کے لڑکے سے اچھی طرح واقف ہوں۔" اُس نے دہرایا۔ "یہ بڑی انحطاط پذیر قسم ہے۔ ایسے لڑکوں کو آپ آدمی نہیں بنا سکتے۔ اُن کے حلق کے غدود ہمیشہ خراب ہوتے ہیں۔"

پیٹر اور اوٹو میں چھوٹے موٹے جھگڑے برابر ہوتے رہتے ہیں، مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُن کے ساتھ رہنا مجھے ناگوار گزرنے لگا ہے۔ آجکل میں اپنا نیا ناول لکھنے میں بہت مشغول ہوں۔ چونکہ میں اُسی کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں اس لئے اکیلا بڑی دور ٹہلنے چلا جاتا ہوں۔ بلکہ اب تو میں اکثر انہیں اکیلا چھوڑ کے چل دینے کے بہت بہانے بناتا رہتا ہوں۔ یہ بات ذرا خود غرضی کی بھی ہے، کیونکہ جب میں اُن کے ساتھ ہوتا ہوں تو موضوع بدل کر یا کوئی مذاق کر کے جھگڑے کو وہیں کا وہیں ختم کر دیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ پیٹر کو میرا یہ فرار بہت ناگوار گزرتا ہے۔ ابھی اُس دن کی بات ہے کہ وہ بڑے طعن آمیز انداز میں کہنے لگا، "تم تو بالکل تارک الدنیا راہب ہو۔ اپنے غور و فکر کے لئے ہمیشہ دنیا سے الگ جا کے بیٹھتے ہو۔ ایک دفعہ میں گھاٹ کے قریب کیفے میں بیٹھا با جا سُن رہا تھا کہ اتنے میں پیٹر اور اوٹو سامنے سے گزرے۔ "اچھا تو تم یہاں چھپے ہوئے ہو!" پیٹر چیخ اُٹھا۔ میں نے دیکھا کہ کم سے کم اس وقت پیٹر کو واقعی مجھ سے نفرت ہو گئی ہے۔

ایک دن شام کو ہم سب بڑے بازار میں جا رہے تھے جو گرمی گزارنے کے لئے یہاں آنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ اوٹو نے انتہائی پر عناد مسکراہٹ کے ساتھ پیٹر سے کہا، "یہ کیا ہے کہ جس طرف میں دیکھتا ہوں اُسی طرف تم دیکھتے ہو؟" اوٹو نے بڑی بات کہہ دی تھی کیونکہ جب کبھی اوٹو کسی لڑکی کی طرف دیکھنے کے لئے سر گھماتا تھا تو پیٹر کی آنکھیں جبلّی

رقابت کے ساتھ بالکل مشین کی طرح اُس کی نظروں کا پیچھا کرتی تھیں۔ ہم فوٹوگرافر کی دکان کے سامنے سے گزرے جہاں دن بھر کی کھینچی ہوئی ساحل کی تصویریں ہر روز لگا دی جاتی ہیں۔ اوڈو ایک نئی تصویر کے سامنے رُک کے اُسے بڑے غور سے دیکھنے لگا جیسے اس تصویر کا موضوع انتہائی دلکش ہو۔ میں نے دیکھا کہ پیٹر کے ہونٹ سکڑ گئے۔ وہ اپنے آپ سے جدوجہد کر رہا تھا مگر وہ اپنے رقیبانہ تجسس کا مقابلہ نہ کر سکا اور خود بھی رُک گیا۔ یہ تصویر ایک لمبی داڑھی والے موٹے سے بڈھے کی تھی جو برلن کا جھنڈا ہلا رہا تھا۔ پیٹر کو اپنے جال میں پھنستا ہوا دیکھ کر اوڈو طعن آمیز انداز سے ہنسنے لگا۔

رات کے کھانے کے بعد اوڈو بلا ناغہ کورہاؤس یا جھیل کے قریب والے کیفے میں ناچنے چلا جاتا ہے۔ اب تو وہ پیٹر کی اجازت لینے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتا۔ اُس نے اپنا یہ حق مضبوطی سے جما لیا ہے کہ اپنی شام جس طرح چاہے گا گزارے گا۔ عموماً میں اور پیٹر بھی گاؤں چلے جاتے ہیں۔ ہم گھاٹ کی سلاخوں پہ دیر تک جھکے رہتے ہیں، اور بالکل نہیں بولتے چالتے۔ سیاہ پانی میں کورہاؤس کی روشنیوں کا عکس ایسا لگتا ہے جیسے سستے جواہرات۔ بس ہم اس عکس کو تکتے رہتے ہیں اور اپنے اپنے خیالات میں غرق رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم کیفے میں چلے جاتے ہیں اور پیٹر شراب پی پی کر مست ہو جاتا ہے ــــ جب وہ اپنے ہونٹوں تک گلاس اُٹھاتا ہے تو اُس کا زاہدِ خشک والا منھ بدمزگی اور نفرت کے احساس سے سکڑنے سا لگتا ہے۔ میں کچھ نہیں بولتا، حالانکہ کہنے کی بہت سی باتیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ پیٹر چاہتا ہے میں اوڈو کے بارے میں کوئی بات کہہ کے اُسے بھڑکا دوں تاکہ ایک دفعہ جی بھر کے بگڑ چکنے کے بعد اُس کے ذہن کو سکون مل جائے۔ مگر میں کچھ نہیں کہتا اور ہم شراب پیتے رہتے ہیں ــــ اور کتابوں اور ناٹکوں وغیرہ کے بارے میں بے ربط باتیں

کرتے رہتے ہیں۔ بعد میں جب ہم گھر لوٹتے ہیں تو پیٹر کے قدم آہستہ آہستہ تیز ہوتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ہم گھر میں داخل ہوتے ہیں تو وہ مجھے چھوڑ کے اوپر اپنے سونے کے کمرے میں بھاگ جاتا ہے۔ اکثر ہم ساڑھے بارہ یا پون بجے سے پہلے نہیں لوٹتے، مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ اوٹو ہم سے پہلے وہاں موجود ہو۔

ریلوے اسٹیشن کے قریب ہیمبرگ کے غریب طبقے کے بچوں کے لئے ایک مکان ہے جہاں وہ گرمی کی چھٹیوں میں آ کے رہتے ہیں۔ وہاں ایک اُستانی سے اوٹو کی ملاقات ہو گئی ہے وہ دونوں ہر روز شام کو اکھٹے ناچنے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ لڑکی چھوٹے چھوٹے بچوں کی قطار کے ساتھ مکان کے سامنے سے گزرتی ہے۔ بچے کھڑکیوں کی طرف دیکھتے ہیں، اور اگر اتفاق سے اوٹو باہر جھانک رہا ہو تو وہ ایسے فقرے چُست کرنے لگتے ہیں جو اُن کی عمر کے لحاظ سے نامناسب ہیں۔ وہ اپنی نوجوان استانی کے بازو کو ٹہوکے دے دے کے اور نوچ نوچ کے اُسے اُوپر کی طرف دیکھنے پر اکساتے ہیں۔
ایسے موقعوں پر وہ لڑکی شرمیلے انداز میں مسکراتی رہتی ہے اور اوٹو کی طرف چوری چھپے ایک نظر ڈالتی ہے۔ اس وقت پیٹر پردوں کے پیچھے سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور دانت پیس پیس کر بڑبڑانے لگتا ہے، "کُتیا.... کُتیا..... کُتیا....." اُسے ان دونوں کی دوستی سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی ایذا رسانی کے اس طریقے سے۔ جب ہم جنگل میں ٹہلنے جاتے ہیں تو بچوں سے ہمیشہ ضرور مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ بچے چلتے ہوئے چڑیوں جیسی تیز اور باریک آواز میں قومی گیت گاتے رہتے ہیں۔ دور ہی سے اُن کی آواز سن کر ہمیں اُن کے آنے کا پتہ چل جاتا ہے اور ہم جلدی سے دوسری طرف مڑ جاتے ہیں۔

پیٹر کہا کرتا ہے کہ یہ تو بالکل کپتان ہُک اور مگر مچھ کا سا قصّہ ہے۔

پیٹر نے بڑا طوفان اٹھایا۔ چنانچہ اوٹو نے اپنی دوست سے کہہ دیا ہے کہ بچّوں کی قطار کو ہمارے مکان کی طرف نہ لائے۔ لیکن اب وہ ہمارے ساحل پر ہمارے قلعے سے تھوڑی دُور کے فاصلے سے نہلانے لگے ہیں۔ جس دن صبح کو بچّے پہلی دفعہ وہاں آ کے نہلائے اُس روز اوٹو کی نگاہ بار بار اُس طرف اُٹھتی رہی۔ پیٹر کو بھی اس کا احساس تھا اور اُس پر دن بھر مغموم سی خاموشی طاری رہی۔

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے پیٹر؟" اوٹو کہنے لگا۔ "تم مجھ سے اتنی بُری طرح کیوں پیش آ رہے ہو؟"

"تم سے بُری طرح پیش آ رہا ہوں؟" پیٹر وحشت ناک طریقے سے ہنسنے لگا۔

"اچھا، معلوم ہو گیا۔" اوٹو اچھل کے کھڑا ہو گیا۔ "میں سمجھ گیا کہ میرا یہاں رہنا تمہیں پسند نہیں۔" اور وہ ہمارے قلعے کا پُشتہ پھلانگ کر ساحل پر بچّوں اور اُستانی کی طرف بڑے دلکش انداز میں دوڑنے لگا، اور اپنے جسم کی اس طرح نمائش کرنے لگا کہ وہ اچھے سے اچھا معلوم ہو۔

کل شام کو رہاؤس میں بہت زور کا ناچ تھا۔ اس وقت اوٹو کچھ غیر معمولی طور پر فیاض ہو رہا تھا۔ اُس نے پیٹر سے وعدہ کر لیا کہ مجھے پون بجے سے زیادہ دیر نہیں ہو گی۔ چنانچہ میں نے اُس سے کہا کہ میرے کمرے میں آ جاؤ اور یہیں انتظار کرو۔

میں کام کرتا رہا، پیٹر پڑھتا رہا۔ گھنٹے آہستہ آہستہ گزرتے رہے۔ یکایک میں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ سوا دو بج چکے ہیں۔ پیٹر کرسی ہی پر سو گیا تھا۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے جگاؤں یا نہ جگاؤں، کہ اتنے میں اوٹو کے زینے پر چڑھنے کی آواز آئی۔ اُس کے قدموں کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ نشے میں دُھت ہے۔ اُسے اپنے کمرے میں کوئی نہ ملا تو اُس نے دھڑ سے میرا دروازہ کھولا۔ پیٹر چونک کے سیدھا ہو گیا۔
اوٹو مسکراتا ہوا دروازے سے لگ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے کچھ شرابیوں کے انداز میں مجھے سلام کیا۔ "کیا تم اب تک پڑھ رہے ہو؟" اُس نے پیٹر سے پوچھا۔

"ہاں۔" پیٹر نے بڑے ضبط کے ساتھ جواب دیا۔

"کیوں؟" اوٹو احمقانہ انداز میں مسکرایا۔

"کیونکہ میں سو نہیں سکا۔"

"کیوں نہیں سو سکے؟"

"تم خود بھی جانتے ہو۔" پیٹر نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

اوٹو نے بڑی بدتمیزی سے جمائی لی۔ "مجھے نہیں معلوم، اور نہ مجھے پروا ہے...... خواہ مخواہ پریشان مت کرو۔"

پیٹر کھڑا ہو گیا۔ "سوئر!" اُس نے اوٹو کے منہ پر زور سے چانٹا رسید کرتے ہوئے کہا۔ اوٹو نے مدافعت کی بالکل کوشش نہیں کی۔ اُس نے اپنی چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھوں سے پیٹر کی طرف بڑی انتقامی نظروں سے دیکھا۔ "اچھی بات ہے!" اُس کی آواز صاف نہیں نکل رہی تھی۔ "کل میں برلن چلا جاؤں گا۔" وہ لڑکھڑاتے ہوئے واپس جانے کے لئے مڑ گیا۔

"اوٹو، یہاں آؤ۔" پیٹر بولا۔ میں نے دیکھا کہ غصے کے مارے اب وہ رو دینا ہی چاہتا ہے۔ وہ زینے تک اوٹو کے ساتھ ساتھ گیا۔ "یہاں آؤ۔" اُس نے سختی سے حکم

دیتے ہوئے کہا۔

"بس مجھے چھوڑ دو۔" اوٹو نے کہا۔ "میں تم سے تنگ آگیا ہوں۔ اب میں سونا چاہتا ہوں کل میں برلن واپس جا رہا ہوں۔"

آج صبح پھر سے امن و امان قائم ہوگیا ہے ـــــ مگر بلا قیمت نہیں۔ اوٹو کی پشیمانی نے اپنے خاندان کے متعلق ایک جذباتی شکل اختیار کر لی ہے۔ "یہاں میں مزے اڑا رہا ہوں، اور مجھے اُن کا خیال تک نہیں آتا..... بچاری اماں کو خچر کی طرح کام کرنا پڑتا ہے اُن کے پھیپھڑے خراب ہو چکے ہیں..... ہم انہیں کچھ روپیہ بھیج دیں، کیوں پیٹر؟ پچاس مارک بھیج دیں....." اوٹو کی فیاضی نے اُسے اپنی ضرورتوں کا بھی خیال دلا دیا۔ فراؤ نوواک کو جو روپیہ بھیجا جا رہا ہے اُس کے علاوہ پیٹر نے باتیں بنا کے اوٹو سے ایک نئے سُوٹ کا آرڈر بھی دلوا دیا ہے، جس پر ایک سو اسّی مارک خرچ ہوں گے ـــــ اور ساتھ ہی ایک جوڑا جُوتا، ایک ڈریسنگ گاؤن اور ایک ہیٹ بھی۔

اِس تمام خرچ کے بدلے میں اوٹو نے اپنی خوشی سے وعدہ کیا کہ استانی سے تعلقات منقطع کر لوں گا (اب ہمیں پتہ چلا ہے کہ وہ بہر صورت کل جزیرے سے جا رہی ہے)۔

رات کے کھانے کے بعد وہ سڑک پر نمودار ہوئی، اور مکان کے باہر اِدھر سے اُدھر ٹہلتی رہی۔

"اسے انتظار کرنے دو۔ تھک کے خود چلی جائے گی۔" اوٹو نے کہا۔ "میں اُس سے ملنے نہیں جاؤں گا۔"

لڑکی انتظار کرتے کرتے بے تاب ہوگئی تو جرأت سے کام لے کے سیٹی بجانے لگی۔ یہ دیکھ کے اوٹو مسرت سے پاگل ہوگیا۔ اُس نے کھڑکی کھول دی، بازو ہلا ہلا کے اِدھر سے

سے اُدھر ناچنے لگا اور اُستانی کا طرح طرح سے منہ چڑانے لگا۔ یہ عجیب وغریب تماشہ دیکھ کر وہ ایسی حیران ہوئی کہ گُم سُم کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"بس یہاں سے چل دو!" اوٹو نے پکار کے کہا۔ "جاؤ۔ یہاں سے!"

لڑکی مڑی، اور آہستہ آہستہ رات کے اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ اس وقت وہ بڑی قابلِ رحم معلوم ہو رہی تھی۔

"اُس سے رخصت تو ہو لیتے۔" پیٹر نے کہا۔ اُس نے رقیب کی شکست تو اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لی تھی، چنانچہ بلند ہمتی سے کام لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

لیکن اوٹو نے بات نہیں مانی۔

"ان سڑی بُسی لڑکیوں سے فائدہ ہی کیا ہے؟ روز رات کو مجھے تنگ کرنے آجاتی تھیں کہ چلو، ہمارے ساتھ ناچو..... اور میری عادت تو تم جانتے ہی ہو، پیٹر — میں بڑی جلدی کہنا مان جاتا ہوں..... میں نے واقعی بڑی بدتمیزی کی کہ تمہیں اکیلا چھوڑ چھوڑ کے جاتا رہا، لیکن کرتا بھی کیا؟ سارا قصور ان لوگوں کا تھا....."

اب ہماری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے۔ اوٹو کے عزائم کی زندگی بڑی مختصر ثابت ہوئی۔ بس پیٹر اور میں تقریباً دن بھر اکھٹے بیٹھے رہتے۔ اُستانی چلی گئی ہے اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ اوٹو کا ہمارے ساتھ نہانے کا ارادہ بھی۔ اب وہ ہر روز صبح کو گھاٹ کے قریب والے ساحل پر چلا جاتا ہے اور رات کو جن لوگوں کے ساتھ ناچتا ہے اس وقت اُن کے ساتھ گیند کھیلتا ہے اور عشق بازی کرتا ہے۔ لیپتہ قد ڈاکٹر بھی غائب ہوگیا ہے اور اب پیٹر اور میں آزاد ہیں کہ جتنے غیر ورزشی طریقے سے

چاہیں نہائیں اور دھوپ میں لیٹیں۔

رات کے کھانے کے بعد ناچ کے لئے اوٹو کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے مجھے پیٹر کے قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے کہ وہ زینہ طے کر رہا ہے، اور اُس کے قدم اتنے تیز اور ہلکے پھلکے ہیں کہ اُن سے ذہنی سکون کا اظہار ہوتا ہے —— کیونکہ ایک یہی وقت ہے جب پیٹر اوٹو کی سرگرمیوں سے دلچسپی لینے کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے۔ جب وہ میرا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو میں فوراً کتاب بند کر دیتا ہوں۔ تھوڑی دیر ہوئی میں گاؤں سے مٹھائی خرید کر واپس لوٹا ہوں۔ پیٹر اس ہلکی سی اور جھوٹی امید کے ساتھ اوٹو کو خدا حافظ کہتا ہے کہ شاید آج رات وہ ٹھیک وقت پر واپس آجائے گا: "اچھا تو ساڑھے بارہ بجے آرہے ہو......"

"ایک بجے۔" اوٹو سودا چکاتا ہے۔

"اچھی بات ہے۔" پیٹر مان جاتا ہے۔ "ایک بجے۔ لیکن دیر مت لگانا۔"

"نہیں پیٹر، دیر نہیں ہوگی۔"

جب ہم باغ کا دروازہ کھول کر سڑک سے ہوتے ہوئے جنگل میں پہنچتے ہیں تو اوٹو چھجے پر سے ہماری طرف ہاتھ ہلاتا ہے۔ میں بڑی احتیاط سے پیپرمنٹ کی مٹھائی کوٹ کے نیچے چھپا لیتا ہوں کہ وہ کہیں دیکھ نہ لے۔ مجرمانہ انداز سے ہنستے ہوئے اور پیپرمنٹ چباتے ہوئے ہم جنگل کے راستے سے بابے کی طرف چل پڑتے ہیں۔ ہم آج کل شام کا وقت بابے میں گزارتے ہیں۔ یہ جگہ ہمیں اپنے گاؤں سے زیادہ پسند ہے۔ یہاں صرف ایک پتلی سی سڑک ہے، جس کے دونوں کناروں پر درختوں کے درمیان نیچی نیچی چھتوں والے مکان ہیں۔ یہاں کا منظر بڑا رومانی اور نوآبادیوں کا سا ہے۔ یہ جگہ کہیں دور جنگلوں میں کھوئی ہوئی الٹی سیدھی

بستی کی طرح ہے جہاں لوگ کسی غیر موجود سونے کی کان کی تلاش میں آئے ہوں اور راستہ بھول کر زندگی بھر کے لئے یہیں رہ پڑے ہوں۔

وہاں کے چھوٹے سے رسٹورنٹ میں ہم آئس کریم کھاتے ہیں اور نوجوان ویٹر سے بات چیت کرتے ہیں۔ ویٹر کو جرمنی سے نفرت ہے، اور وہ امریکہ جانا چاہتا ہے۔ "یہاں تو بالکل فرصت نہیں ملتی۔" گرمیوں میں اُسے ذرا بھی چھٹی نہیں ملتی، اور جاڑوں میں کمائی بالکل نہیں ہوتی۔ باہر کے زیادہ تر لڑکے نازی ہیں۔ کبھی کبھی دو لڑکے رسٹورنٹ میں آجاتے ہیں، اور بڑی خوش مزاجی سے سیاسی بحثیں کرنے لگتے ہیں۔ وہ ہمیں اپنی میدانی ورزشوں اور فوجی کھیلوں کا حال سناتے ہیں۔

"تم لوگ جنگ کی تیاریاں کر رہے ہو۔" پیٹر غصے میں آکر کہتا ہے، حالانکہ اُسے سیاست سے ذرا بھی دلچسپی نہیں لیکن ان موقعوں پر وہ خاصا گرم ہو جاتا ہے۔

"معاف کیجیے،" ایک لڑکا تردید کرتا ہے، "آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔ فیوہرر جنگ نہیں چاہتے۔ ہمارا مقصد تو امن اور صلح ہے مگر باعزّت۔ پھر بھی اتنی بات ضرور ہے ....." وہ حسرتناک انداز سے کہتا ہے، اور اُس کا چہرہ چمک اُٹھتا ہے۔ "جنگ بھی اچھی چیز ہو سکتی ہے! قدیم یونانیوں ہی کو دیکھیے!"

"قدیم یونانی زہریلی گیس استعمال نہیں کرتے تھے۔" میں اعتراض کرتا ہوں۔

لڑکے اس حیلے کو بڑی حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اُن میں سے ایک بڑی تمکنت سے جواب دیتا ہے، "یہ تو محض طریقِ کار کا سوال ہے۔"

ساڑھے دس بجے ہم یہاں کے زیادہ تر باشندوں کے ساتھ آخری ٹرین کی آمد کا تماشا دیکھنے اسٹیشن جاتے ہیں۔ گاڑی عام طور سے خالی ہوتی ہے، اور تاریک جنگلوں میں کھڑکھڑاتی

اپنی درشت گھنٹی بجاتی چلی جاتی ہے۔ آخر گھر جانے کا وقت آجاتا ہے۔ اس دفعہ ہم سڑک سے لوٹتے ہیں۔ گھاس کے میدان کے پار جھیل کے قریب والے کیفے کا روشن دروازہ نظر آتا ہے، جہاں اوٹو ناچنے جاتا ہے۔

"آج رات تو جہنم کی روشنیاں خوب چمک رہی ہیں۔" پیٹر کو اس فقرے کا بڑا شوق ہے۔

پیٹر کی رفاقت بے خوابی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ نیند کی گولیاں کھانے لگا ہے لیکن اُسے اعتراف ہے کہ ان کا اثر شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ البتہ اگلے دن ناشتے کے بعد ان کے اثر سے وہ اونگھنے ضرور لگتا ہے۔ اکثر ساحل پہ ہمارے قلعے میں وہ گھنٹے دو گھنٹے کے لئے سو جاتا ہے۔

آج صبح موسم بڑا ٹھنڈا اور بے رنگ تھا۔ سمندر کا رنگ سیپی کا سا بھورا ہو رہا تھا۔ میں نے اور پیٹر نے ایک کشتی کرائے پر لے لی، اور اُسے کھینتے ہوئے گھاٹ سے بہت دور نکل گئے۔ پھر ہم نے کشتی کو یونہیں بہنے کے لئے چھوڑ دیا۔ پیٹر نے سگرٹ جلا لی۔ دفعتاً وہ کہنے لگا:

"پتہ نہیں یہ بات اسی طرح کب تک چلے گی ....."

"جب تک تم چلنے دو گے۔"

"ہاں ..... کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری حالت تو کچھ منجمد ہو کے رہ گئی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ کوئی خاص سبب تو دکھائی نہیں دیتا کہ اوٹو اور میں کبھی آئندہ ایک دوسرے سے ایسا برتاؤ نہیں کیا کریں گے جیسا آجکل کرتے ہیں ....." وہ ذرا سا رکا اور

پھر بولا، "ہاں اگر میں اُسے وپیڈیپانا بند کر دوں تو اور بات ہے۔"

"پھر تمہارے خیال میں کیا ہو گا؟"

پیٹر پانی میں یونہی انگلیاں چلانے لگا، "وہ مجھے چھوڑ کے چلا جائے گا۔"

کئی منٹ تک کشتی کے بہنے کی آواز آتی رہی۔ پھر میں نے پوچھا، "تمہارا کیا خیال ہے وہ تمہاری کچھ پروا کرتا ہے یا نہیں؟"

"شروع میں تو شاید کرتا تھا..... مگر اب نہیں۔ اب تو ہمارے درمیان بس روپے کا رشتہ ہے۔"

"کیا تمہیں اب بھی اس کی پروا ہے؟"

"نہیں..... پتہ نہیں۔ شاید..... کبھی کبھی مجھے اب بھی اُس سے نفرت ہو جاتی ہے ——— شاید اس سے پروا کرنے نہ کرنے کا کچھ پتہ چل سکے۔"

"ہو تو سکتا ہے۔"

بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پیٹر نے اپنی انگلیاں رومال سے خشک کر لیں۔ اُس کا منھ بار بار پھڑک رہا تھا۔

"اچھا۔" آخر کار وہ بولا۔ "تم کیا صلاح دیتے ہو، اب میں کیا کروں؟"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

پیٹر کا منھ پھر پھڑکا۔

"میرا تو خیال ہے بس اُسے چھوڑنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر یہی اچھا ہے کہ چھوڑ دو۔"

"فوراً؟"

"جتنی جلدی ہو اُتنا ہی اچھا ہے۔ اُسے کوئی عمدہ سا تحفہ دے دو، اور آج ہی تیسرے پہر برلن واپس بھیج دو۔"

پیٹر نے سر ہلایا اور افسردگی سے مسکرانے لگا۔

"یہ نہیں کر سکتا۔"

پھر بہت دیر تک خاموشی رہی۔ آخر پیٹر کہنے لگا، "مجھے بڑا افسوس ہے کرسٹفر..... مجھے معلوم ہے کہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں بھی یہی کہتا....... لیکن مجھ سے یہ نہیں ہو گا۔ جب تک کہ کوئی نئی بات نہ ہو معاملہ جیسا چل رہا ہے ویسا ہی چلتا رہے گا۔ بہرحال اب بات زیادہ دن تک چل نہیں سکتی..... مجھے معلوم ہے کہ میں بڑا کمزور واقع ہوا ہوں......"

"مجھ سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں ہلکی سی خفگی کے احساس کو چھپانے کے لئے مسکرانے لگا، "میں کوئی تمہاری نفسیاتی تحلیل تھوڑے ہی کر رہا ہوں!"

میں نے پتواریں اٹھا لیں اور کشتی کو کنارے کی طرف کھینے لگا۔ جب ہم گھاٹ کے پاس پہنچے تو پیٹر نے کہا، "اب خیال آتا ہے تو بڑی مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے لیکن جب میں پہلی دفعہ اوٹو سے ملا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ اب ہم عمر بھر ساتھ ساتھ رہیں گے۔"

"بہت خوب!" اوٹو کے ساتھ عمر بسر کرنے کے خیال سے میری آنکھوں کے سامنے ایک مضحکہ خیز جہنم کی تصویر پھر گئی۔ میں زور سے ہنس پڑا۔ پیٹر بھی ہنسنے لگا، اور اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں میں دبا لیا۔ اُس کا چہرہ گلابی سے سُرخ ہو گیا اور سرخ سے اُودا۔ اُس کی رگیں اُبھر آئیں۔ جب ہم کشتی سے نکلے تو ابھی تک برابر ہنسے جا رہے تھے۔

باغ میں مکان دار ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ "بڑا ہی افسوس ہے! وہ ہمیں دیکھتے ہی بولا "آپ لوگ بہت دیر میں آئے!" اُس نے چراگاہوں کے پار جھیل کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے دیکھا کہ درختوں کی قطار کے اُوپر سے دھواں اُٹھ رہا ہے اور گاڑی اسٹیشن سے جا رہی ہے "آپ کے دوست کو کوئی بہت ضروری کام نکل آیا اور انہیں فوراً برلن جانا پڑا۔ میرا خیال تھا کہ آپ لوگ ایسے وقت سے آجائیں گے کہ انہیں رخصت کر آئیں۔ بڑا افسوس ہے!"

اس دفعہ میں اور پیٹر دونوں بھاگتے ہوئے اُوپر پہنچے۔ پیٹر کا کمرہ بالکل اُلٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ ساری درازیں اور الماریاں کھلی پڑی تھیں۔ میز کے بیچ میں ایک پرچہ اوٹو کے ٹیڑھے بھینگے خط میں لکھا ہوا تھا:

"پیارے پیٹر، معاف کرنا، اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ چنانچہ میں گھر جا رہا ہوں۔
اوٹو کی طرف سے پیار
خفا مت ہونا "

میں نے دیکھا کہ یہ خط اوٹو نے پیٹر کی نفسیات کی کتابوں میں سے ایک، یعنی "لذّت کے اُصول سے آگے"، کا اوپر والا ورق پھاڑ کر لکھا تھا۔

"اچھا ..... !" پیٹر کا منھ پھڑکنے لگا۔ میں نے ڈرتے ہوئے اُس کی طرف ایک نظر ڈالی۔ مجھے امید تھی کہ وہ پھٹ پڑے گا، لیکن اس کے برخلاف وہ تو بالکل پُرسکون معلوم ہوتا تھا۔ ایک لمحے کے بعد وہ الماریوں کے پاس پہنچا اور درازیں دیکھنے لگا۔ "کچھ زیادہ نہیں لے گیا،" اپنی تفتیش کے بعد اُس نے اعلان کیا، "بس میری دو ٹائیاں، تین قمیصیں ـــــ خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ میرے جوتے اُس کے ٹھیک نہیں آتے! ـــــ اچھا اور دیکھیں..... کوئی دو سو مارک ....." پیٹر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ "مجموعی طور سے

کچھ زیادہ نہیں گیا!

"تمہارا کیا خیال ہے؟ اُس نے جانے کا یکایک فیصلہ کیا تھا یا پہلے سے ارادہ تھا؟"
کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے میں نے پوچھا۔

"شاید یکایک ہی فیصلہ کیا ہوگا۔ اُس کے مزاج سے تو یہی امید ہے..... اب مجھے یاد آتا ہے کہ صبح میں نے اُسے بتایا تھا کہ ہم کشتی میں سیر کرنے جا رہے ہیں —— اور اُس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم لوگ دیر تک باہر رہو گے یا جلدی آجاؤ گے....."

"اچھا....."

میں پیٹر کے بستر پر بیٹھ گیا —— اور میرے دل میں یہ عجیب خیال آیا کہ آخر اوٹو نے ایک ایسی بات تو کی جس کی میں عزت کرتا ہوں۔

پیٹر پاگلوں کی طرح خوش خوش تھا، اور اُس کی یہ حالت بہت دیر تک جاری رہی دوپہر کے کھانے کے وقت وہ مغموم ہوگیا اور بالکل خاموش بیٹھ گیا۔

"اب مجھے بھی چل کے سامان باندھنا چاہیئے۔" جب ہم کھانا کھا چکے تو اُس نے کہا۔

"تو پھر تم بھی چلے؟"

"ہاں۔"

"برلن؟"

پیٹر مسکرانے لگا۔ "نہیں، کرسٹفر، ڈرو مت! صرف انگلستان......"

"اچھا....."

"ایک ٹرین ہے جو مجھے بہت رات گئے ہیمبرگ پہنچا دے گی۔ شاید میں سیدھا ہی

چل دوں گا..... میں محسوس کر رہا ہوں کہ جب تک میں اس کم بخت مُلک سے نہ نکل جاؤں مجھے سفر ہی کرتے رہنا پڑے گا.....»

اب کوئی بات کہنے کی تھی ہی نہیں۔ میں خاموشی سے سامان باندھنے میں اُس کی مدد کرتا رہا۔ جب پیٹر حجامت کا شیشہ بیگ میں رکھ رہا تھا تو اُس نے پوچھا، «تمہیں یاد ہے کہ اوٹو نے سر کے بل کھڑے ہو کے اِسے کس طرح توڑ ڈالا تھا؟»

«ہاں، یاد ہے۔»

جب ہم سامان باندھ چکے تو پیٹر اپنے کمرے کے چھجّے پر نکل گیا، «آج رات یہاں باہر بڑی سیٹیاں بجیں گی۔» وہ بولا۔

میں مسکرانے لگا۔ «مجھے نیچے جا کے انہیں تسلّی دینا پڑے گی۔»

پیٹر ہنس پڑا۔ «ہاں، تم ضرور تسلّی دو گے!»

میں اُس کے ساتھ اسٹیشن گیا۔ خوش قسمتی سے انجن ڈرائیور کو بڑی جلدی تھی۔ گاڑی نے صرف دو منٹ انتظار کیا۔

«جب تم لنڈن پہنچ جاؤ گے تو کیا کرو گے؟» میں نے پوچھا۔

پیٹر کے منھ کے کونے جھک گئے۔ اُس نے میری طرف نفسیاتی مریضوں کی طرح مسکرا کے دیکھا۔ «شاید نفسیاتی تحلیل کا کوئی نیا ماہر ڈھونڈوں گا۔»

«اچھا، دیکھو اُس سے فیس کم کرا لینا!»

«ضرور۔»

جب گاڑی چلی تو وہ اپنا ہاتھ ہلانے لگا۔ «اچھا، خدا حافظ، کرسٹفر۔ تمہاری اخلاقی مدد کا شکریہ!»

پیٹر نے مجھ سے خط لکھنے یا اپنے گھر آنے کو بالکل نہیں کہا۔ شاید وہ اس جگہ سے متعلق ہر آدمی کو بھول جانا چاہتا ہے، میں اُسے الزام بھی نہیں دے سکتا۔

آج شام میں اُس کتاب کے ورق الٹ رہا تھا جسے میں آج کل پڑھ رہا ہوں۔ اس کتاب میں مجھے اوٹو کا ایک اور پرچہ رکھا ہوا ملا۔
"پیارے کرسٹفر، کہیں تم بھی مجھ سے خفا نہ ہو جاتا۔ تم تو پیٹر کی طرح احمق نہیں ہو جب تم برلن پہنچ جاؤ گے تو میں تم سے آ کے ملوں گا، کیونکہ میں جانتا ہوں تم کہاں رہتے ہو۔ میں نے تمہارے ایک خط پر پتہ دیکھ لیا تھا۔ پھر بڑی مزیدار باتیں ہوں گی۔

تمہارا پیارا دوست

اوٹو"

نہ معلوم کیوں، میرے دل میں خیال آیا کہ اُس سے اتنی آسانی سے گلو خلاصی نہیں ہو گی۔

دراصل میں اب دو ایک دن میں برلن جانے ہی والا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ اگست کے آخر تک یہیں رہوں گا، اور شاید اپنا ناول بھی ختم کر لوں گا، لیکن یکایک یہ جگہ بڑی سُونی معلوم ہونے لگی ہے۔ مجھے پیٹر اور اوٹو، اور اُن کی روزانہ دانتا کِل کِل بے طرح یاد آتی ہے، بلکہ اتنی تو مجھے اُمید بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اب تو اوٹو کے ساتھ ناچنے والی عورتیں بھی شام کے دھندلکے میں مغموم صورت بنائے ہوئے میری کھڑکی کے نیچے آ کے نہیں کھڑی ہوتیں۔

نوواک لوگ

واسر ٹور سٹرا سے کے سرے پر پتھر کا ایک بڑا سا محراب دار دروازہ تھا، جو پرانے برلن کی یادگار ہے۔ اس کے اُوپر رنگ سے ہتھوڑے اور درانتی کے نشان اور نازی صلیبیں بنی ہوئی تھیں، اور دیواریں پھٹے ہوئے اشتہاروں سے ڈھکی ہوئی تھیں جو نیلاموں یا مختلف جرائم کے بارے میں تھے۔ یہ سڑک بڑی گندی تھی، اور کنکروں کی بنی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ روتے ہوئے بچّے مٹی میں لوٹ رہے تھے۔ اُونی سویٹر پہنے ہوئے نوجوان سائیکلوں پر سوار کچھ تذبذب میں اِدھر سے اُدھر چکّر لگا رہے تھے اور دودھ کے برتن لئے وہاں سے گزرنے والی لڑکیوں پر آوازے کس رہے تھے۔ کھڑنجے پر ایک اُچھلنے کے کھیل کے لئے جسے "جنّت اور زمین" کہتے ہیں، کھریا سے لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ سڑک کے آخر میں گرجا کی عمارت تھی جیسے کوئی لمبا سا سُرخ اور خطرناک طور پہ تیز آلہ۔ فراؤ نواک خود دروازہ کھولنے آئیں۔ جیسا میں نے انہیں آخری مرتبہ دیکھا تھا اب وہ اُس سے بھی زیادہ بیمار نظر آرہی تھیں، اور اُن کی آنکھوں کے نیچے بڑے بڑے نیلے حلقے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہی ہیٹ اور خارشس کی کھال کا سا پُرانا کالا کوٹ پہن رکھا تھا۔ پہلے تو وہ مجھے پہچان نہیں سکیں۔

"آداب، فراؤ نواک۔"

شروع میں تو اُن کے چہرے سے بڑا سخت شک و شبہ ٹپک رہا تھا، لیکن آہستہ آہستہ

اُن کے چہرے کی کیفیت بدل گئی اور استقبال کی ملائم اور لڑکیوں جیسی مسکراہٹ چمکنے لگی۔

"ارے یہ تو ہرکرسٹوف ہیں! اندر آجایئے، ہرکرسٹوف! آیئے بیٹھ جایئے۔"

"شاید آپ کہیں باہر جا رہی تھیں؟"

"نہیں نہیں، ہرکرسٹوف، میں تو ابھی آئی ہوں۔ بس ایک منٹ ہوا ہے۔" مجھ سے ہاتھ ملانے سے پہلے وہ اپنے ہاتھ جلدی جلدی کوٹ سے پونچھ کر صاف کر رہی تھیں۔ "آج میرے کام پہ جانے کا دن ہے۔ میرا کام کہیں ڈھائی بجے ختم ہوتا ہے، اسی وجہ سے کھانے کو اتنی دیر ہو جاتی ہے۔"

وہ الگ ہٹ گئیں تاکہ میں اندر آجاؤں۔ میں نے دھکّا دے کر دروازہ کھولا۔ اتفاق سے دروازے کے پیچھے چولھے پہ فرائنگ پین رکھا تھا۔ دروازے کے جھٹکے سے اُس کا دستہ مڑ گیا۔ اس چھوٹے سے باورچی خانے میں ہم دونوں کے لئے بھی جگہ مشکل ہی سے تھی۔ سستی چربی میں تلے ہوئے آلوؤں کی بُو سارے مکان میں پھیلی ہوئی تھی، جس سے دم گھٹا جاتا تھا۔

"آیئے، بیٹھ جایئے، ہرکرسٹوف۔" انہوں نے میری خاطر مدارات کرتے ہوئے دہرایا۔ "بڑی گندگی پھیلی ہوئی ہے، معاف کیجیے گا۔ مجھے بڑے سویرے جانا پڑتا ہے اور میری گریٹے ہو تو گئی ہے بارہ سال کی مگر ہے بڑی کاہل وجود۔ جب تک اُس کے سر پہ نہ کھڑے رہو، کام کر کے ہی نہیں دیتی۔"

بیٹھنے کے کمرے کی چھت ترچھی تھی جس پر نمی کے پُرانے دھبے تھے۔ کمرے میں ایک بڑی سی میز، چھ کرسیاں، ایک الماری اور دو آدمیوں کے سونے کے دو بڑے بڑے پلنگ تھے۔ یہاں سامان اتنا ٹھنسا ہوا تھا کہ بھنچ بھنچ کے اور ترچھے ہو ہو کے نکلنا پڑتا تھا۔

"گریٹے!" فراؤ نوواک نے پکارا۔ "کہاں ہو؟ چلو ادھر آؤ!"

"وہ تو باہر گئی ہے۔" اندر کے کمرے سے اوٹو کی آواز آئی۔

"اوٹو! یہاں آؤ، دیکھو کون آیا ہے!"

"کاہے کو تنگ کر رہی ہو، میں گراموفون ٹھیک کر رہا ہوں۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔"

"فرصت نہیں ہے! نکما کہیں کا! اماں سے یوں نہیں بولتے ہوں گے! نکلو کمرے سے، سُنا کچھ؟"

اُنہیں فوراً خود بخود غصہ آ گیا۔ اور ایسا شدید کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اُن کا چہرہ ایسا پتلا، تلخ اور درم آلود ہو گیا کہ منھ پر بس ناک ہی ناک نظر آتی تھی۔ اُن کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں ہے، فراؤ نوواک۔" میں نے کہا۔ "بلایئے نہیں، جب جی چاہے گا اپنے آپ آ جائے گا۔ اُس وقت اُسے اور بھی زیادہ تعجب ہوگا۔"

"بڑا اچھا بیٹا ملا ہے مجھے! مجھ سے اس طرح بولتا ہے۔"

انہوں نے اپنا ہیٹ اتار لیا تھا اور ڈوری کے تھیلے میں سے میلے کچیلے بنڈل نکال رہی تھیں۔ "یا اللہ۔" وہ بگڑیں، "یہ بچی کہاں گئی؟ ہر وقت سڑک پہ رہتی ہے۔ ایک دفعہ چھوڑ سینکڑوں دفعہ کہہ چکی ہوں۔ بچے تو اب پروا کرتے ہی نہیں۔"

"آپ کے پھیپھڑے کی کیسی حالت ہے، فراؤ نوواک؟"

اُنہوں نے ٹھنڈا سا سانس لیا۔ "بعض دفعہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے بہت خراب ہو گیا ہے۔ اس جگہ بڑی جلن ہونے لگتی ہے۔ اور جب میں کام ختم کرتی ہوں تو ایسی تھکن معلوم ہوتی ہے کہ کھانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ جب میں واپس آتی ہوں تو بڑی چڑچڑی باتیں کرتی ہوں..... معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کو بھی اطمینان نہیں ہے۔ وہ جاڑوں

میں مجھے سینے ٹوریم بھیجنے کو کہہ رہا ہے ۔ میں وہاں پہلے بھی جا چکی ہوں ۔ لیکن وہاں جانے کے لئے بیسیوں آدمی انتظار کرتے رہتے ہیں ..... پھر اس زمانے میں ویسے بھی مکان میں بڑی سیلن ہو جاتی ہے ۔ چھت پہ وہ دھبّے دیکھ رہے ہیں نا آپ ؟ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ جب چھت ٹپکتی ہے تو ہمیں نیچے کوئی برتن رکھنا پڑتا ہے ۔ مکان داروں کو اُوپر کی کوٹھڑیاں رہنے کو کرائے پر دینے کا حق تو نہیں ہے، انسپکٹر انہیں بار بار سزا دے چکا ہے لیکن کیا بھی کیا جائے ؟ کہیں نہ کہیں تو رہنا ہے ہی ۔ ہم نے مکان کی تبدیلی کے لئے سال بھر ہوا درخواست دی تھی اور ابھی تک وعدہ ہی وعدہ ہو رہا ہے کہ اچھا انتظام ہو جائے گا ۔ لیکن اور بہت سے لوگ ہیں جن کی حالت ہم سے بھی خراب ہے ..... اُس دن میرے شوہر اخبار میں انگریزوں اور اُن کے پونڈ کے بارے میں پڑھ رہے تھے ۔ کہتے ہیں کہ پونڈ کی قیمت گرتی جا رہی ہے ۔ میری سمجھ میں تو یہ باتیں آتی نہیں ۔ آپ کا تو کچھ نقصان نہیں ہوا ہر کرسٹوف ؟ "

" اصل بات یہ ہے فراؤ نوواک ، کہ آج جو میں آپ سے ملنے آیا ہوں تو اس کی تھوڑی سی وجہ یہ بھی ہے ۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی سستے سے کمرے میں چلا جاؤں یہاں آس پاس کوئی ایسا کمرہ آپ کی نظر میں تو نہیں ہے ؟ "

" نہیں ، ہر کرسٹوف ، مجھے بڑا افسوس ہے ! " وہ واقعی حیران و ششدر رہ گئی تھیں ۔ " لیکن آپ اس محلّے میں تو نہیں رہ سکتے ـــــ آپ تو بڑے آدمی ہیں ! نہیں، یہ محلّہ آپ کے لئے ٹھیک نہیں ہے ۔ "

" ان باتوں کا مجھے اتنا خیال نہیں جتنا آپ سمجھتی ہیں ۔ میں تو بس ایک پُرسکون سا صاف ستھرا کمرہ چاہتا ہوں جس کا کرایہ یہی کوئی بیس مارک ماہوار ہو ۔ چاہے کتنا ہی چھوٹا

ہو، اس کی کوئی بات نہیں ہے۔ دن بھر تو میں گھر سے باہر رہتا ہوں۔"

اُنہوں نے شک آمیز انداز میں سر ہلایا۔" اچھا، ہر کرسٹوف، دیکھئے سوچوں گی۔ شاید کوئی سوجھ جائے ....."

"اماں کھانا تیار ہو گیا کہ نہیں؟" اوٹو قمیص پہنے ہوئے اندر والے کمرے کے دروازے میں نمودار ہوا، اور پوچھا۔" میرا تو بھوک سے دم نکلا جا رہا ہے۔"

"صبح سے تو میں تمہارے لئے محنت مزدوری کرتی پھر رہی ہوں، کھانا کیسے تیار ہو جاتا! واہ رے نکمے"!" فراؤ نوواک نے خوب زور سے چیختے ہوئے کہا۔ پھر رُکے بغیر بڑا دل میں گھر کرنے والا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا،" دیکھتے نہیں کون آیا ہے؟"

"کون ..... کرسٹوف ہیں!" اوٹو نے حسب معمول فوراً اداکاری شروع کر دی تھی۔ اُس کا چہرہ آہستہ آہستہ انتہائی مسرت سے ایسے چمک اُٹھا جیسے سورج نکل آیا ہو۔ مسکرانے کی وجہ سے اُس کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔ وہ اچھل کے آگے آیا، اور ایک ہاتھ میری گردن میں ڈال کے میرا ہاتھ دبانے لگا۔" ارے یار کرسٹوف، اتنے دن کہاں چھپے رہے؟" اُس کی آواز حسرت ناک اور طعن آمیز ہو گئی۔" ہم سب تمہیں بڑا یاد کرتے ہیں۔ تم ہم سے ملنے کیوں نہیں آئے؟"

"ہر کرسٹوف بڑے مشغول آدمی ہیں۔" فراؤ نوواک نے اوٹو کو ملامت کرتے ہوئے کہا۔" ان کے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ تم جیسے نکموں کے پیچھے پیچھے بھاگے پھریں۔" اوٹو مسکرایا، اور میری طرف آنکھ ماری۔ پھر اُس نے مڑ کر فراؤ نوواک کو ڈانٹا۔

"اماں، تم بیٹھی کیا سوچ رہی ہو؟ کرسٹوف اتنی دیر سے بیٹھے ہیں اور تم نے کافی کی ایک پیالی کو بھی نہ پوچھا؟ اتنے زینے چڑھ کے آئے ہیں، پیاس لگی ہو گی!"

"شاید تمہارا مطلب یہ ہے، اوٹو، کہ تمہیں پیاس لگ رہی ہے۔ یہی بات ہے نا؟ نہیں، شکریہ، فراؤ نوواک، میں کچھ نہیں پیوں گا ـــــ واقعی۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ کو کھانا پکانے کو دیر ہو۔ اب میں آپ کا زیادہ ہرج نہیں کروں گا..... ادھر دیکھو اوٹو، ذرا میرے ساتھ آؤ اور کوئی کمرہ ڈھونڈنے میں مجھے مدد دو۔ میں ابھی تمہاری امّاں سے کہہ رہا تھا کہ میں اس محلّے میں رہنے آ رہا ہوں.... کافی تم میرے ساتھ باہر چل کے پی لینا۔"

"ارے کرسٹوف ـــــ تم یہاں رہنے والے ہو، اس محلّے میں!" اوٹو مارے جوش کے ناچنے لگا۔ "اوہو امّاں، بڑا مزا رہے گا! مجھے بڑی خوشی ہے!"

"جاؤ تم ہر کرسٹوف کے ساتھ چلے جاؤ اور مکان ڈھونڈو۔" فراؤ نواک نے کہا۔ "کھانا تو ابھی گھنٹے بھر سے پہلے تیار نہیں ہو گا۔ یہاں تو تم میرا ہرج کر رہے ہو۔ آپ، کو نہیں کہہ رہی ہوں، ہر کرسٹوف۔ لوٹ کے یہیں آ جائیے گا، اور ہمارے ساتھ جو رُوکھا سوکھا ٹکڑا میسّر ہے کھا لیجئے گا۔ آئیں گے نا آپ؟"

"فراؤ نوواک، آپ کی بڑی نوازش ہے مگر آج تو میں نہیں آ سکتا۔ مجھے جلدی گھر واپس پہنچنا ہے۔"

"امّاں، جانے سے پہلے مجھے روٹی کا ذرا سا ٹکڑا تو دے دو۔" اوٹو نے بڑی عاجزی سے گڑگڑا کے درخواست کی۔ "پیٹ ایسا خالی ہے کہ میرا سر لٹّو کی طرح گھوم رہا ہے۔"

"اچھا لو۔" فراؤ نوواک نے روٹی کا ایک ٹکڑا کاٹ کر جلن میں اُس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "لیکن شام کو تم سینڈوچ بناؤ گے، گھر میں کچھ نہ نکلے تو پھر مجھے الزام مت دینا..... خدا حافظ، ہر کرسٹوف۔ آپ نے بڑی مہربانی کی کہ اتنی دور ہم سے ملنے آئے۔ اگر آپ واقعی اس محلّے میں رہنے لگیں تو یہاں آیا ضرور کیجئے گا..... البتہ یہ بات ہے کہ

یہاں آپ کو کوئی چیز پسند نہیں آئے گی. آپ کو ایسی چیزوں کی عادت کہاں ہے."

اوٹو میرے پیچھے پیچھے مکان سے نکلنے ہی والا تھا کہ انہوں نے اُسے پکار کے بُلا لیا. میں نے سنا کہ اُن میں بحث ہو رہی ہے. پھر دروازہ بند ہو گیا. میں آہستہ آہستہ پانچوں زینے اُترتا ہوا صحن میں جا پہنچا. حالانکہ آسمان پہ ایک بادل کے اُوپر سے سورج چمک رہا تھا لیکن صحن بڑا تاریک اور سیلا ہوا تھا. ٹوٹی ہوئی بالٹیاں، بچہ گاڑیوں کے پہیے، اور سائیکلوں کے ٹائر کے ٹکڑے اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے کنوئیں میں گری ہوئی چیزیں.

اوٹو دو ایک منٹ گزر جانے کے بعد زینے پر کھٹ کھٹ کرتا ہوا نیچے آیا.

"اماں تم سے کہہ نہیں سکیں،" اُس نے ہانپتے ہوئے مجھے بتایا. "انہیں ڈر تھا کہ کہیں تم بُرا نہ مان جاؤ..... لیکن میں نے کہا کہ تم تو یقیناً ہمارے ساتھ رہنا پسند کرو گے: ہمارے یہاں تو تم جو چاہو کرو، اور یہ بھی جانتے ہو کہ ہر چیز صاف ستھری ہے. کسی اور مکان میں رہے تو وہاں کھٹمل بھرے ہوں گے..... ہاں، کہہ دو کرسٹوف! بڑا مزا رہے گا! میں اور تم پیچھے والے کمرے میں سویا کریں گے. تم لوٹار کا پلنگ لے لینا، وہ کچھ نہیں کہے گا. وہ گریٹے کے ساتھ بڑے پلنگ پہ لیٹ جایا کرے گا..... صبح کو جتنی دیر تک چاہے بستر پہ پڑے رہا کرنا. اگر تم چاہو گے تو تمہارا ناشتہ میں لا دیا کروں گا..... تم تو ہمارے یہاں آؤ گے ہی. آؤ گے نا؟"

چنانچہ معاملہ طے ہو گیا.

جب میں نوواک لوگوں کے گھر رہنے پہنچا تو میری پہلی شام اچھا خاصا تہوار ثابت

ہوئی۔ میں پانچ بجے کے بعد اپنے دو سوٹ کیس لے کر پہنچا تو دیکھا کہ فراؤ نوواک ابھی سے شام کا کھانا پکا رہی ہیں۔ اوٹو نے میرے کان میں بتایا کہ آج خاص طور سے پھیپھڑے کا قیمہ پکا ہے۔

"آپ کو جیسے کھانے کی عادت ہے ویسا تو یہاں ملے گا نہیں،" فراؤ نوواک بولیں۔ "ہمارا کھانا آپ کو زیادہ پسند تو نہیں آئے گا لیکن ہم اپنی سی کوشش ضرور کریں گے۔" وہ سرتاپا مسکراہٹ بنی ہوئی تھیں اور سارے جوش کے پھولے نہیں سماتی تھیں۔ میں بھی مسکرائے چلے جا رہا تھا۔ میں دراصل بڑا سٹپٹایا ہوا تھا، اور کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے یہاں مخل ہو رہا ہوں۔ آخر میں کمرے کے فرنیچر پہ چڑھتا ہوا جا کے اپنے پلنگ پہ بیٹھ گیا۔ سامان کھولنے کی جگہ بالکل نہیں تھی، بلکہ دکھائی تو یہ دیتا تھا کہ کپڑے رکھنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ کمرے کی میز پہ گریٹے سگرٹ کے کارڈوں سے کھیل رہی تھی اور پانی میں بھگو بھگو کے کاغذوں پہ تصویریں اُتار رہی تھی۔ وہ بارہ سال کی بھدیسل سی لڑکی تھی گو اُس میں ایک میٹھا میٹھا سا حُسن بھی تھا مگر اُس کے کندھے بالکل گول تھے اور وہ موٹی بے حد تھی۔ میری موجودگی کی وجہ سے اُسے اپنی ذرا ذرا سی بات کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بدن توڑ مروڑ رہی تھی، مصنوعی انداز سے مسکرا رہی تھی اور بالغ عمر والوں کی سی سُریلی آواز بنا بنا کے پکارے جا رہی تھی، "اماں! آؤ دیکھو کیسے خوبصورت پھول ہیں!"

"مجھے اتنی فرصت کہاں ہے کہ تمہارے پھول دیکھتی پھروں۔" فراؤ نوواک نے آخر تنگ آ کے کہا۔ "بیٹی ہٹھنی کی ہٹھنی ہو گئی اور میں اکیلی چولھے میں سر مار رہی ہوں!"

"بالکل ٹھیک ہے اماں!" اوٹو بھی ہنستے ہوئے شامل ہو گیا اور پیچ کے بدلا۔ وہ

بڑا صالح اور نیک بن کے غصّے سے گریٹے کی طرف بڑھا۔ "تم امّاں کا ہاتھ کیوں نہیں بٹاتیں؟ ذرا بتاؤ تو مجھے۔ اتنی موٹی تو ہوگئیں، دن بھر بیٹھی رہتی ہو اور ذرا ہاتھ نہیں ہلاتیں۔ اٹھو اس کرسی سے، فوراً۔ سن رہی ہو؟ ان گندے کارڈوں کو رکھ دو، نہیں تو میں آگ میں جھونک دوں گا!"

اُس نے ایک ہاتھ سے کارڈوں پہ جھپٹّا مارا، اور دوسرے ہاتھ سے گریٹا کے منھ پر ایک چانٹا دیا۔ گریٹے کے بالکل چوٹ نہیں لگی، لیکن اُس نے فوراً تھیٹر کے سے انداز میں بڑے زور کی چیخ ماری "آہ، اوٹو، میرے بڑی زور سے لگا ہے!" اُس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور انگلیوں میں سے میری طرف جھانکنے لگی۔

"ارے، بچّی سے مت بولو!" فراؤ نوواک نے باورچی خانے میں سے پکار کے کہا۔ "یہ تو بتاؤ تم ہوتے کون ہو۔ بڑے چلے ہیں اُسے کاہلی کا طعنہ دینے! گریٹے، یہ رونا بند کرو نہیں تو میں اوٹو سے کہہ کے اچھی طرح پٹواؤں گی۔ کوئی بات تو ہو رونے کی! تم دونوں تو مجھے پاگل کئے دے رہی ہو۔"

"لیکن امّاں!" اوٹو بھاگا بھاگا باورچی خانے میں پہنچا، اور اُن کی کمر میں ہاتھ ڈال کے بوسے لینے لگا، "بچاری امّاں، پیاری امّاں۔" اُس نے بڑی رقّت کے ساتھ محبّت بھرے لہجے میں کچھ گنگنانے کے انداز میں کہا، "تمہیں اتنی محنت کرنا پڑتی ہے اور اوٹو تمہارے ساتھ ایسی بُری طرح پیش آتا ہے، لیکن وہ تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا — بس وہ تو نرا بیوقوف ہے۔ بولو امّاں کل تمہیں کوئلے لا دوں؟ پھر تو خوش ہو جاؤ گی؟"

"چھوڑ مجھے، دھوکے باز کہیں کے!" فراؤ نوواک نے ہنستے ہوئے اور اُس سے جد و جہد کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہاری چکنی چپڑی باتوں کی ضرورت نہیں ہے! ایسی

ہی تو تمہیں بڑی پروا ہے اپنی بڈھی اماں کی! چھوڑ دو، مجھے چین سے کام کرنے دو۔"
"اودو بڑا لڑکا نہیں ہے۔" جب اُس نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ مجھ سے کہنے لگیں۔
"بس اتنی بات ہے کہ کسی کام میں اُس کا دل نہیں لگتا۔ میرے لوٹار کا بالکل الٹ ہے بیٹا ہو تو بس لوٹار جیسا۔ اُس میں ذرا بھی غرور نہیں۔ جو کام بھی ہو کرنے کو تیار رہتا ہے۔ جب اُس کے پاس کچھ روپیہ جمع ہو جاتا ہے تو اپنے اوپر خرچ نہیں کرتا۔ سیدھا میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے 'لو یہ لو اماں۔ جاڑوں کے لئے اپنے واسطے گرم جوتے خرید لو۔" فراؤ نوواک نے میری طرف ہاتھ بڑھایا جیسے روپیہ دے رہی ہوں۔ اودو کی طرح اُن میں یہ عادت تھی کہ جو چیز بیان کر رہی ہوں اُسے اشاروں سے ادا بھی کرتی جاتی تھیں۔
"لوٹار ایسا ہے، لوٹار ویسا ہے،" اودو نے بگڑ کر بیچ میں بات کاٹی۔ "بس ہر وقت لوٹار ہی کا ذکر ہے۔ لیکن ذرا یہ تو بتاؤ اماں کہ اُس دن بیس مارک کا نوٹ تمہیں کس نے دیا تھا؟ لوٹار تو مہینے بھر میں بھی بیس مارک نہیں کما سکتا۔ اچھا اگر تم ایسی ہی باتیں کرو گی تو پھر تمہیں اور روپیہ نہیں ملے گا، چاہے میرے قدموں پہ سر رکھو، تب بھی نہیں ملے گا۔"
"بدمعاش لڑکے۔" وہ پھر فوراً لڑنے کو تیار ہو گئیں۔ "تجھے شرم نہیں آتی ہر کرسٹوف کے سامنے ایسی باتیں کر رہا ہے! اگر اُسے معلوم ہوتا کہ بیس مارک کہاں سے ملتے ہیں —— بیس مارک کیا اس سے بھی زیادہ —— تو وہ ایک منٹ بھی تیرے ساتھ اس مکان میں نہ ٹھہرتا۔ اور بات بھی واقعی ٹھیک ہوتی! ذرا اپنی دیدہ دلیری تو دیکھ —— کہتا ہے کہ میں نے روپیہ دیا ہے! تو خود ہی جانتا ہے کہ اگر تیرے باپ لفافہ نہ دیکھ لیتے ......"
"بالکل ٹھیک!" اودو نے چیخ کے کہا، اور بندر کی طرح ماں کا منھ چڑا چڑا کے ناچنے لگا۔
"یہی تو میں چاہتا تھا! کرسٹوف کے سامنے قبول لو کہ تم نے روپیہ چرایا تھا! تم چور ہو۔ تم چور ہو!"

"ارے تو، شرم نہیں آتی!" فراؤ نوواک نے لپک کے ایک دیگچی کا ڈھکنا اٹھا لیا۔ میں اچھل کے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا کہ کہیں میرے نہ آ لگے۔ میں ایک کرسی کے اوپر سے کود کے وہیں بیٹھ گیا۔ گریٹے نے خوشی اور ڈر کے مارے ایک بناوٹی سی چیخ ماری۔ اتنے میں دروازہ کھلا۔ ہر نوواک اپنے کام سے واپس آ گئے تھے۔

وہ چھوٹے قد اور گٹھے ہوئے جسم کے طاقتور آدمی تھے۔ اُن کی مونچھیں تنی ہوئی، بال بہت اونچے کٹے ہوئے اور بھنویں گھنی تھیں۔ انہوں نے منظر کو دیکھ کر ایک غراہٹ کی سی لمبی آواز نکالی جو تھوڑی سی ڈکار بھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سمجھ نہیں سکے یہاں ہو کیا رہا ہے یا شاید انہوں نے کوئی پرواہی نہیں کی، فراؤ نوواک نے اُن کی بصیرت افروزی کے لئے کچھ نہیں بتایا۔ بس چپکے سے کیل پر ڈھکنا ٹانگ دیا۔ گریٹے اپنی کرسی سے اچھلی اور بازو پھیلا کر اُن کی طرف دوڑی "ابّا! ابّا!!"

ہر نوواک اُس کی طرف دیکھ کے مسکرائے اور اُن کے تمباکو کے دھوئیں سے زرد وہ تین دانت کھل گئے۔ انہوں نے جھک کے بڑی احتیاط اور چابک دستی سے کچھ تحسین آمیز تجسس کے ساتھ گریٹے کو اٹھا لیا جیسے کوئی قیمتی گلدان ہو۔ اُن کا پیشہ فرنیچر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا تھا۔ پھر انہوں نے بڑے تلطف کے ساتھ میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کام میں انہوں نے عجلت سے کام نہیں لیا اور نہ مجھے خوش کرنے کی بے تابی یا کاوش کا ثبوت دیا۔

"فرمایئے، جناب!"

"ابّا، ہر کرسٹوف ہمارے یہاں رہنے آئے ہیں، تمہیں ان کے آنے سے خوشی ہوئی کہ نہیں؟" گریٹے نے اپنے باپ کے کندھے پر بیٹھے ہوئے اپنی میٹھی اور سُریلی آواز میں

بالکل لنلناتے کے انداز میں کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سن کر ہر نوواک میں نئی طاقت آگئی، اور وہ مجھ سے بڑی گرم جوشی سے دوبارہ ہاتھ ملانے لگے اور میری کمر تھپکنے لگے۔

"خوشی ہوئی؟ ہاں، بہت خوشی ہوئی!" انھوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیئے بڑے زور زور سے سر ہلایا۔ "انگریز؟ آنگلے؟ ہا ہا ہا۔ بالکل ٹھیک ہے! ہاں میں فرانسیسی بولتا ہوں۔ اب تو بہت کچھ بھول گیا۔ جنگ میں سیکھی تھی۔ میں مغربی محاذ پر سارجنٹ تھا۔ میں بیسیوں قیدیوں سے بات چیت کیا کرتا تھا۔ اچھے آدمی تھے۔ بالکل ایسے ہی تھے جیسے ہم......"

"تم پھر پی آئے ہو!" فراؤ نوواک نے بدمزگی سے کہا۔ "ہر کرسٹوف کیا خیال کریں گے!"

"کرسٹوف بُرا نہیں مانتے بُرا نتے ہو، کرسٹوف؟" ہر نوواک نے میرا کندھا تھپتھپایا۔

"یہ کرسٹوف، کرسٹوف کیا کہہ رہے ہو! ہر کرسٹوف کہو! شریف آدمیوں کو بھی نہیں پہچانتے؟"

"آپ مجھے کرسٹوف ہی کہیئے، مجھے یہی پسند ہے،" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے! کرسٹوف بالکل ٹھیک ہے! سب گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں..... آرڑاں، روپیہ — سب ایک سے ہیں! ہا ہا ہا!"

اوٹو نے میرا دوسرا بازو پکڑ لیا۔ "کرسٹوف تو گھر کے ہی سے آدمی ہیں!"

تھوڑی ہی دیر میں ہم لوگ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ کھانے میں ڈھیروں قیمہ، کالی روٹی، کافی، اور اُبلے ہوئے آلو تھے۔ میں نے فراؤ نوواک کو ہفتے بھر کے کھانے کے دس مارک پیشگی دے دیئے تھے۔ انہیں جو اتنا روپیہ خرچ کرنے کو ملا تو انھوں نے ایسی ناعاقبت اندیشی برتی کہ اتنے آلو اُبال لیئے جو درجن بھر آدمیوں کو کافی ہوں۔ وہ ایک بڑی سی کڑھائی میں

سے آلو نکال نکال کے میری رکابی میں ڈھیر لگاتی رہیں، یہاں تک کہ کھاتے کھاتے میرا دم گھٹنے لگا۔

"اور کھائیے، ہیر کرسٹوف۔ آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے۔"

"میں نے عمر بھر میں کبھی اتنا نہیں کھایا، فراؤ نوواک۔"

"کرسٹوف کو ہمارا کھانا پسند نہیں آیا،" ہیر نوواک نے کہا۔ "کوئی بات نہیں ہے کرسٹوف، عادت پڑ جائے گی۔ جب اوٹو سمندر سے لوٹا ہے تو اُس کی بھی یہی حالت تھی۔ اپنے انگریز کے ساتھ رہتے رہتے اُسے اچھی اچھی چیزوں کی عادت پڑ گئی تھی....."

"بس زبان بند کرو!" فراؤ نوواک نے تہدید آمیز انداز میں کہا۔ "بچارے لڑکے ہی کے سر رہتے ہو! وہ کوئی ایسا بچہ تو ہے نہیں، اپنے آپ سوچ سمجھ سکتا ہے کیا بات اچھی ہے، کیا بات بُری ہے۔ اس پہ تو اُسے خود ہی شرم آنی چاہیئے!"

ہم کھانا کھا ہی رہے تھے کہ لوثار آ گیا۔ اُس نے اپنی ٹوپی پلنگ پہ پھینک دی، ہلکے سے تعظیماً سر جھکا کے بڑے اخلاق کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا، مگر بولا بالکل نہیں، اور کھانا کھانے میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میری موجودگی سے اُسے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی، اور نہ اُس کے چہرے پر دلچسپی کے آثار نظر آئے۔ میری اور اُس کی آنکھیں شاید چار تک نہیں ہوئیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ صرف بیس سال کا ہے، مگر معلوم ہوتا تھا کئی سال زیادہ کا۔ وہ اچھا خاصا مرد بن چکا تھا۔ اوٹو تو اُس کے سامنے لڑکا سا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا چہرہ سوکھا ہوا، اور کسانوں کا سا تھا، اور ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں، جیسے بنجر کھیتوں کی نسلی یادنے اُس پہ تلخی اور محنت کشی کی مُہر لگا دی ہو۔

"لوثار رات کے اسکول میں پڑھنے جاتا ہے،" فراؤ نوواک نے مجھ سے فخریہ کہا۔

"پہلے یہ موٹر خانے میں ملازم تھا۔ اب یہ انجینیئری پڑھنا چاہتا ہے۔ آج کل تو جب تک کوئی سند نہ ہو کہیں نوکری نہیں ملتی۔ ہر کرسٹوف، آپ کو فرصت ملے تو اس کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھیئے گا۔ اس کے استاد کی تو رائے ہے کہ تصویریں بہت عمدہ ہیں۔"

"ضرور دیکھوں گا۔"

لوٹار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے اُس سے ہمدردی تھی، اور اپنے آپ کو بیوقوف سا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن فراؤ نوواک نے اُس کی نمائش کا تہیّہ کر لیا تھا۔

"لوٹار، تمہاری کلاس رات کو کس کس دن ہوتی ہے؟"

"پیر اور منگل کے دن۔" وہ جان بوجھ کے گھُٹّل بنا بیٹھا رہا، اور اپنی ماں کی طرف دیکھے بغیر کھانا کھاتا رہا۔ پھر شاید یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ مجھ سے ناراض نہیں ہے، بولا، "آٹھ سے ساڑھے دس بجے تک۔"

کھانا ختم کرتے ہی وہ کچھ کہے بغیر اٹھا، مجھ سے ہاتھ ملاتے، اُسی طرح ذرا سا جھکا اور اپنی ٹوپی لے کے باہر چلا گیا۔

فراؤ نوواک نے اُسے جاتے ہوئے دیکھ کے ٹھنڈا سا سانس لیا۔ "بس اب چلا اپنے نازیوں کے پاس۔ میں اکثر دل ہی دل میں کہا کرتی ہوں کہ وہ ان لوگوں میں نہ پڑتا تو اچھا تھا۔ یہ لوگ اُسے عجیب عجیب احمقانہ باتیں سکھاتے ہیں۔ ایسی باتیں سُن سُن کے وہ بڑا بے چین رہتا ہے۔ جب سے وہ ان لوگوں میں شامل ہوا ہے بالکل ہی بدل گیا۔۔۔ سیاست کی باتیں میری تو سمجھ میں آتی نہیں۔ میں تو ہمیشہ یہی کہتی ہوں کہ آخر ہم لوگ قیصر کو واپس کیوں نہیں بلا لیتے؟ چاہے کچھ کہو، وہ زمانے بڑے اچھے تھے۔"

"ہشت، جہنّم میں جائے تمہارا قیصر،" اوٹو نے کہا۔ "ہم تو کمیونسٹ انقلاب

چاہتے ہیں۔"

"کمیونسٹ انقلاب!" فراؤ نوواک نے پھنکار ماری۔ "کیا بات کہی ہے! کمیونسٹ تو تمہیں جیسے کاہل اور نکمے لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے عمر بھر ایمانداری سے کام کر کے نہیں دیا۔"

"کرسٹوف بھی تو کمیونسٹ ہیں،" اوٹو نے کہا۔ "ہو نا، کرسٹوف؟"

"نہیں۔ ٹھیک طرح سے تو میں کمیونسٹ نہیں ہوں۔"

فراؤ نوواک مسکرانے لگیں: "کیا بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو! ہر کرسٹوف کس طرح کمیونسٹ ہو سکتے ہیں؟ وہ تو شریف آدمی ہیں۔"

"میں تو یہ کہتا ہوں ——" ہر نوواک نے چھری کانٹا رکھ دیا اور بڑی احتیاط سے اپنی مونچھیں ہاتھ کی پشت سے پونچھیں۔ "ہم سب کو خدا نے بنایا ہے، ہم سب برابر ہیں۔ تم بھی اتنے ہی اچھے ہو جتنا میں، اور میں بھی اتنا ہی اچھا ہوں جتنے تم۔ فرانسیسی بھی اتنا ہی اچھا ہوتا ہے جتنا انگریز، اور انگریز بھی اتنا ہی اچھا ہوتا ہے جتنا جرمن۔ میرا مطلب سمجھ گئے نا؟"

میں نے سر ہلایا۔

"اب جنگ ہی کو لو ——" ہر نوواک نے کرسی میز سے دور ہٹالی: "ایک دن میں ایک جنگل میں تھا۔ سمجھے نا آپ، بالکل اکیلا تھا۔ بس اکیلا جنگل میں چلا جا رہا تھا جیسے سڑک پہ چل رہا ہوں..... اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے ایک فرانسیسی کھڑا ہے بس جیسے وہیں زمین میں سے نکل آیا ہو۔ مجھ سے اتنی ہی دور تھا جتنے اس وقت تم ہو۔" ہر نوواک بولتے بولتے اچھل کے کھڑے ہو گئے۔ میز پر سے روٹی کاٹنے کی چھری اٹھا کے

مدافعت کے انداز میں اپنے سامنے کرلی جیسے سنگین ہو۔ وہ اپنی گھنی بھوؤں کے نیچے سے میری طرف گھورنے لگے، اور اُس منظر کی نقل اتارنے لگے۔ " اب ہم دونوں یوں کھڑے ہیں، اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ فرانسیسی ایسا زرد ہو رہا تھا جیسے کوئی مردہ۔ یکایک وہ چیخ کے کہنے لگا، مجھے مت مارو! بس بالکل اسی طرح چیخا تھا۔" ہرنوواک نے بڑے قابلِ رحم انداز سے التجا کے لئے ہاتھ جوڑ لئے۔ اب چھری اُن کی اداکاری میں حارج ہو رہی تھی، چنانچہ انھوں نے چھری میز پر رکھ دی۔ "مجھے مت مارو! میرے پانچ بچے ہیں (وہ فرانسیسی بول رہا تھا، لیکن میں اُس کی بات سمجھ رہا تھا میں اُس زمانے میں بڑی اچھی فرانسیسی بولتا تھا۔ لیکن اب تو کچھ بھول سا گیا) اچھا، اب میں اُس کی طرف دیکھ رہا ہوں اور وہ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر میں نے کہا، "آمی،" (اس کے معنی ہیں دوست۔) اس کے بعد ہم دونوں نے ہاتھ ملائے۔" ہرنوواک نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا، اور بڑی گرمجوشی سے دبایا۔" اور پھر ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور اُلٹے قدموں چلنے لگے، کیونکہ مجھے یہ ڈر تھا کہ وہ پیچھے سے کہیں گولی نہ مار دے۔" آگے کی طرف دیکھتے ہوئے ہرنوواک احتیاط سے ایک ایک قدم پیچھے ہٹنے لگے یہاں تک کہ الماری سے اُن کی بڑے زور کی ٹکر ہو گئی۔ الماری کے اوپر سے ایک فریم میں لگی ہوئی تصویر نیچے گر پڑی۔ شیشہ چھن سے ٹوٹ گیا۔

"ابّا! ابّا!" گریٹے خوش ہو کے چلا پڑی۔ "ذرا دیکھو، تم نے کیا کر دیا!"

"اچھا ہوا، تمہیں سبق مل گیا! اب تو نہیں کرو گے ایسی بیوقوفی کی باتیں؟ بالکل بھانڈ ہی بن گئے!" فراؤ نوواک بگڑ کے بولیں۔ گریٹے زور زور سے بناوٹی ہنسی ہنسنے لگی، یہاں تک کہ اوٹّو نے اُس کے منہ پہ ایک چانٹا رسید کر دیا اور وہ تھیٹر کے سے

انداز میں رو پڑی۔ اس دوران میں ہرنڈواک نے اپنی بیوی کا بوسہ لے کے اور گال پہ چٹکی کاٹ کے اُن کا غصہ دُور کر دیا تھا۔

"ہٹو میرے پاس سے، اتنے بڑے ہو گئے اور ابھی تک لڑکوں کی سی باتیں کئے چلے جاتے ہو!" انہوں نے ہنستے ہوئے احتجاج کیا۔ میری موجودگی سے انہیں شرم بھی آ رہی تھی اور خوشی بھی تھی۔ "ہٹو، مجھے چھوڑ دو، تم میں سے شراب کی بُو آ رہی ہے!"

اُس زمانے میں مجھے بہت پڑھنا پڑتا تھا۔ میں سارے دن گھر سے باہر رہتا تھا۔ مجھ سے انگریزی پڑھنے والیاں مغرب کی طرف فیشن ایبل علاقوں میں رہتی تھیں یہ عورتیں بڑی مالدار تھیں اور کوئی فراؤ نوواک کی عمروں کی ہوں گی، مگر بڑی تندرست تھیں اور دس سال کم کی معلوم ہوتی تھیں۔ اُن کا ایک کھیل یہ بھی تھا کہ جب اُن کے شوہر دفتر ہوں اور تیسرے پہر کا وقت کاٹے نہ کٹ رہا ہو تو انگریزی میں بات چیت کیا کریں۔ کھلے ہوئے آتش دانوں کے سامنے ریشمی گدّوں پر بیٹھ کر ہم ایلڈس ہکسلے کے ناول "پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ" اور ڈی ایچ لارنس کے ناول "لیڈی چیٹرلی کا عاشق" کے بارے میں بحث کیا کرتے تھے۔ اتنے میں ملازم چائے اور مکھن توس لے آتا تھا۔ بعض دفعہ جب وہ ادب سے تھک جاتی تھیں تو میں اُن کی تفریحِ طبع کے لیئے نوواک خاندان کا حال سنایا کرتا تھا۔ لیکن میں اتنی احتیاط ضرور برتتا تھا کہ میں نے انہیں کبھی یہ نہیں بتایا کہ میں بھی وہیں رہتا ہوں۔ اگر میں اعتراف کر لیتا کہ دراصل میں غریب ہوں تو اس سے میرے کاروبار پر بڑا بُرا اثر پڑتا۔ یہ عورتیں مجھے ایک گھنٹے کے تین مارک دیتی تھیں۔ تین مارک انہوں نے بڑی پس و پیش کے بعد دینے

پہلے تو یہی کوشش کی مجھ سے ڈھائی مارک ہی میں سودا کرلیں۔ ان عورتوں میں سے اکثر دیدہ و دانستہ یا غیر شعوری طور پہ مجھے دھوکا دے کر زیادہ دیر تک ٹھیرائے رکھنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ مجھے ہمیشہ گھڑی پہ نگاہ رکھنی پڑتی تھی۔

صبح کو بہت کم عورتیں پڑھتی تھیں۔ چنانچہ میں عام طور پہ لوواک خاندان کے بہت بعد بستر سے اُٹھا کرتا تھا۔ فراؤ لوواک کو آتش دان صاف کرنے جانا پڑتا تھا، ہیر لوواک فرنیچر اٹھانے والے کے یہاں اپنے کام پہ چلے جاتے تھے، لوٹار کی ملازمت چھوٹ گئی تھی، وہ اپنے ایک دوست کی مدد کرنے کے لئے اُس کے ساتھ ایک اخبار کے خریدار بنوانے جاتا تھا، گریٹے اسکول چلی جاتی تھی۔ میرے پاس بس اوٹو رہ جاتا تھا۔ البتہ بعض دن بڑی ردّ و قدح کے بعد اُس کی ماں اُسے ملازمت کے دفتر بھیج دیتی تھیں کہ اپنے کارڈ پہ مہر لگوا لائے۔

ہمارا ناشتہ یعنی ایک پیالی کافی اور روٹی کا ایک ٹکڑہ لانے کے بعد اوٹو اپنا پیجامہ اُتار دیتا تھا اور ورزش کرنے لگتا تھا یا سر کے بل کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ مجھ سے داد لینے کے لئے اپنی مچھلیاں پھُلا پھُلا کر دکھایا کرتا تھا۔ میرے بستر پر بیٹھ کے وہ مجھے طرح طرح کی کہانیاں سنایا کرتا تھا:

"کرسٹوفر، میں نے کبھی تمہیں سنایا ہے کہ مجھے وہ ہاتھ کس طرح دکھائی دیا؟"

"نہیں مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔"

"اچھا تو سنو.... جب میں بہت چھوٹا سا تھا تو ایک مرتبہ میں رات کو بستر پہ لیٹا تھا۔ رات بہت جا چکی تھی اور بڑا اندھیرا تھا۔ اچانک آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک بڑا سا کالا ہاتھ بستر کے اُوپر پھیلا ہوا ہے۔ مجھے ایسا ڈر لگا کہ میرے منھ سے چیخ

تک نہیں نکلی۔ میں نے ٹانگیں پیٹ میں دے لیں اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ دو ایک منٹ بعد ہاتھ غائب ہو گیا۔ پھر میں چیخا۔ اماں دوڑتی ہوئی اندر آئیں۔ میں نے کہا کہ اماں مجھے ہاتھ نظر آیا ہے۔ لیکن وہ ہنسنے لگیں۔ انہیں یقین ہی نہیں آیا۔"

اوٹو کا ڈبل روٹی جیسا گول گول معصوم چہرہ جس میں دو گڑھے پڑھے ہوئے تھے بڑا سنجیدہ ہو گیا۔ اُس نے اپنی چھوٹی چھوٹی مہمل چمکدار آنکھیں میرے اُوپر گاڑ دیں۔ اور اپنی پوری قوتِ بیانیہ سے کام لینے لگا۔

"پھر کرسٹوف، کئی سال بعد کا ذکر ہے کہ میں ایک کرسی بنانے والے کے یہاں کام کر رہا تھا۔ اچھا تو ایک دن کیا ہوا کہ بالکل صبح کا وقت تھا اور خوب روشنی پھیلی ہوئی تھی میں اپنی تپائی پہ بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اتنے میں یکایک سارے کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے دیکھا تو وہ ہاتھ موجود تھا۔ مجھ سے بس اتنی دور تھا جتنی دور تم ہو، اور مجھے پکڑنے ہی والا تھا۔ میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب مجھ سے نہ سانس لیا جائے نہ چیخا جائے میرے مالک نے دیکھا کہ میں بالکل زرد ہو رہا ہوں تو وہ بولا کہ اوٹو کیا ہوا، کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟ جب وہ بولا تو ہاتھ مجھ سے دور ہوتا چلا گیا، اور چھوٹا پڑتا گیا، یہاں تک کہ کالا لا سا دھبّہ رہ گیا۔ جب میں نے پھر نظر اُٹھائی تو کمرے میں بالکل پہلے ہی کی طرح روشنی تھی اور جہاں میں نے کالا دھبّہ دیکھا تھا وہاں چھت پر ایک بڑی سی مکھی چل رہی تھی لیکن سارا دن میری طبیعت ایسی خراب رہی کہ مالک نے مجھے گھر بھیج دیا۔"

یہ قصّہ سناتے ہوئے اوٹو کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا تھا اور ایک لمحے کے لیے خوف کی بڑی شدید کیفیت جھلکنے لگی تھی۔ اب اُس کا چہرہ المناک بن گیا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"ایک نہ ایک دن مجھے وہ ہاتھ پھر نظر آئے گا، اور میں مرجاؤں گا۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم تمہیں بچا لیں گے۔"

اوٹو بڑا مغموم ہو کر سر ہلانے لگا، "خدا کرے ایسا ہی ہو، کرسٹوف۔ لیکن مجھے تو امید نہیں ہے۔ وہ ہاتھ مجھے آخر میں ضرور پکڑ لے گا۔"

"تم کرسی بنانے والے کے یہاں کتنے دن رہے؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ دن نہیں رہا۔ بس یہی دو چار ہفتے۔ مالک مجھ سے بڑی سختی سے پیش آتا تھا وہ مجھے ہمیشہ سب سے مشکل کام دیا کرتا تھا، اور اُس زمانے میں میں بالکل ذرا سا تھا۔ ایک دن مجھے پانچ منٹ دیر ہو گئی۔ اُس نے ایک قیامت مچا دی، اور مجھے ملعون کُتا کہنے لگا۔ بھلا میں یہ بات برداشت کر سکتا تھا؟" اوٹو آگے کو جھک گیا، اُس کے چہرے پر کمینے کی بندروں جیسی خشک مسکراہٹ آگئی۔ اُس نے میری طرف چہرہ بڑھاتے ہوئے کہا، "نہیں نہیں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا!" اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ایک لمحے کے لئے بندروں جیسی غیر معمولی اور شدید نفرت کے ساتھ میرے اُوپر گڑ گئیں، اور اُس کا سکڑا ہوا چہرہ بے انتہا بدصورت نظر آنے لگا۔ پھر اُس کا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا۔ اب میں کرسی بنانے والا باقی نہیں رہا تھا۔ وہ معصومیت سے کھلکھلا کر ہنسنے لگا اور بال پیچھے جھٹکنے لگا۔ ہنسنے میں اُس کے دانت نظر آ رہے تھے۔ "میں نے کچھ ایسی شکل بنائی جیسے اُس کے مکہ مارنے والا ہوں۔ میں نے اُسے ڈرا دیا!" اُس نے متوسط عمر کے خوف زدہ آدمی کی نقل اُتاری جو چوٹ سے بچ رہا ہو۔ پھر وہ ہنس پڑا۔

"اچھا تو پھر تم وہاں سے الگ ہو گئے؟" میں نے پوچھا۔

اوٹو نے سر ہلایا۔ اُس کا چہرہ آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگا۔ اب وہ پھر مغموم ہوتا

جا رہا تھا۔

"تمہارے ابّا اور امّاں نے کیا کہا؟"

"او ہو، وہ تو ہمیشہ میرے خلاف رہے ہیں۔ جب میں چھوٹا سا تھا تبھی سے۔ اگر روٹی کے دو ٹکڑے ہوں تو امّاں ہمیشہ بڑا ٹکڑا لوٹار کو دیتی تھیں۔ جب میں شکایت کرتا تھا تو یہ لوگ کہتے تھے، "جا کام کر۔ اتنا بڑا تو ہو گیا، اپنے آپ کھا کما۔ ہمارے سر کیوں پڑا ہے؟" اوڈو کو بڑے خلوص کے ساتھ اپنے اوپر رحم آنے لگا اور اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں، "یہاں کوئی مجھے نہیں سمجھتا۔ کوئی مجھ سے اچھی طرح نہیں پیش آتا۔ سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں مر جاؤں۔"

"اوڈو، کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو! تمہاری امّاں کو تو تم سے نفرت نہیں ہے"

"بیچاری امّاں!" اوڈو نے تائید کی۔ اس کا لہجہ فوراً بدل گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُسے احساس ہی نہیں ہے کہ وہ ابھی کیا کہہ رہا تھا۔ "رحم آتا ہے۔ انہیں روز اتنی محنت کرتے ہوئے دیکھا نہیں جاتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ شوفت، رات کو وہ اکثر گھنٹوں کھانستی رہتی ہیں بعض دفعہ اُن کے تھوک میں خون بھی آتا ہے۔ میں جاگ جاتا ہوں اور لیٹا لیٹا سوچتا رہتا ہوں کہ اُن کی موت تو قریب نہیں آ گئی۔"

میں نے سر ہلایا۔ اپنے آپ کو روکنے کے باوجود میں مسکرا پڑا۔ یہ بات نہیں تھی کہ فراؤ نواک کے بارے میں اوڈو نے جو کچھ کہا تھا مجھے اُس کا یقین نہیں آیا۔ مگر بستر پہ بیٹھا ہوا اوڈو خود جانوروں کی طرح ایسا چاق چوبند تھا اور اُس کا بادامی ننگا جسم تندرستی کی وجہ سے ایسا چمک رہا تھا کہ اُس کے منہ سے موت کا ذکر بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی جھانڈ منہ رنگ کے کسی جنازے کا بیان کر رہا ہو۔ غالباً وہ سمجھ گیا، کیونکہ وہ جواب

میں مسکرانے لگا، اور اُسے میری ظاہری بے حسی پہ ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ اپنی ٹانگیں سیدھی کرکے وہ بغیر زور لگانے جھک گیا اور ہاتھوں سے اپنے پیر پکڑ لئے۔ "تم ایسے کر سکتے ہو، کرسٹوف؟"

یکایک اُسے کوئی نئی بات یاد آئی جس سے وہ بڑا خوش ہوا۔ "کرسٹوف نہیں ایک چیز دکھاؤں؟ قسم کھاؤ کسی سے نہیں کہو گے۔"

"اچھی بات ہے۔"

وہ اُٹھا اور اپنے پلنگ کے نیچے کچھ ڈھونڈنے لگا۔ کھڑکی کے قریب کونے میں فرش کا ایک تختہ ڈھیلا تھا۔ اسے اٹھا کر اُس نے ایک ٹین کا ڈبہ نکالا جس میں پہلے بسکٹ تھے۔ ڈبے میں خط اور تصویریں بھری ہوئی تھیں، اوٹو نے انہیں بستر پہ پھیلا دیا۔

"یہ چیزیں اگر اماں کے ہاتھ لگ گئیں تو وہ انہیں جلا ڈالیں گی..... دیکھو کرسٹوف، یہ لڑکی تمہیں پسند آئی؟ اس کا نام ہلڈے ہے۔ وہ مجھے اس جگہ ملی تھی جہاں میں ناچنے جاتا ہوں..... اور یہ مارمی ہے۔ اس کی آنکھیں خوبصورت ہیں نا؟ یہ میرے اوپر بری طرح فریفتہ ہے ـــــ دوسرے سب لڑکے مجھ سے جلتے ہیں۔ لیکن مجھے اس قسم کی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔" اوٹو نے بڑی سنجیدگی سے سر ہلایا۔ "بڑی ہنسی کی سی بات ہے، مگر جیسے ہی مجھے پتہ چلتا ہے کہ یہ لڑکی مجھ پہ مرتی ہے، اُس سے میری دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ میں اُس سے بالکل تعلق ختم کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ سیدھی یہاں چلی آئی، اور اماں کے سامنے بڑی آفت مچائی۔ چنانچہ اُسے خاموش رکھنے کے لئے مجھے اُس سے کبھی کبھی ملنا پڑتا ہے..... اور یہ ٹروڈے ہے ـــــ کرسٹوف، بھلا تمہیں یقین آئے گا کہ اس کی عمر ستائیس سال کی ہے؟ سچ کہہ رہا ہوں! اس کا جسم بڑا شاندار ہے؟ وہ ویسٹ اینڈ کے علاقے میں خود اپنے مکان

میں رہتی ہے۔ یہ لڑکی دو دفعہ طلاق لے چکی ہے۔ میں جب چاہوں وہاں آجا سکتا ہوں۔ یہ اُسکی تصویر ہے جو اُس کے بھائی نے کھینچی تھی۔ وہ ہم دونوں کی ایک ساتھ تصویر کھینچنا چاہتا تھا، لیکن میں نہیں مانا۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں بعد میں یہ تصویریں بیچ نہ دے ـــــ اس بات پہ آدمی گرفتار ہو سکتا ہے ....." اوٹو دانت نکال کے ہنس دیا، اور اُس نے مجھے خطوں کا ایک بنڈل دیا۔ "لو انہیں پڑھو، بڑی ہنسی آئے گی تمہیں۔ یہ خط ایک ہالینڈ کے آدمی کا ہے۔ اس کے پاس اتنی بڑی کار ہے کہ میں نے تو دیکھی نہیں۔ میں بہار کے زمانے میں اُس کے ساتھ تھا۔ وہ کبھی کبھی مجھے خط لکھتا رہتا ہے۔ ابا کو اس کا پتہ چل گیا۔ اور اب وہ اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ لفافوں میں روپیہ تو نہیں ہے۔ بڑے چالاک آدمی ہیں! لیکن مجھے ایک ایسی ترکیب آتی ہے کہ اُن جیسے دو ہوں تو بھی قابو میں نہ آؤں! میں نے اپنے سب دوستوں سے کہہ رکھا ہے کہ نکڑ پہ جو تنور ہے اُس کے پتے سے مجھے خط بھیجیں۔ تنور والے کا بیٹا میرا دوست ہے ....."

کبھی پیٹر کا بھی خط آتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اوٹو نے تھوڑی دیر بڑی سنجیدگی سے میری طرف دیکھا، "دو کرسٹوف؟"

"ہاں؟"

"میرے اُوپر عنایت کرو گے؟"

"وہ کیا ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اوٹو قرضہ مانگنے کے لئے ایسا وقت چھانٹتا تھا جس کی بالکل امید بھی نہ ہو۔

"مہربانی کر کے ....." اُس کے لہجے میں ہلکی سی ملامت تھی۔ "مہربانی کر کے میرے سامنے پیٹر کا نام پھر کبھی نہ لینا ....."

"اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ میں بالکل حیران و ششدر رہ گیا تھا۔ "اگر تم نہیں چاہتے تو نہ سہی۔"

"بات یہ ہے، کرسٹوف ..... پیٹر نے مجھے بڑی تکلیف پہنچائی ہے۔ میں اُسے اپنا دوست سمجھتا تھا، اور وہ یکایک مجھے اکیلا چھوڑ کے چل دیا۔"

صحن کے اندھیرے کنوئیں میں جہاں خزاں کے اس نم آلود موسم میں کہرا ہر وقت چھایا رہتا تھا، سڑک پہ گانے اور باجا بجانے والے یکے بعد دیگرے آتے رہتے تھے، اور اُن کے گانے بجانے کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ ایک تو کچھ لڑکے مل مل کر آتے تھے اور ستار بجایا کرتے تھے، ایک بڈھا سارنگی لے کر آتا تھا، اور ایک آدمی اپنی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ مل کر گایا کرتا تھا۔ سب سے مقبول گانا "جوانی کے دنوں میں" تھا۔ اکثر صبح کے وقت میں یہ گانا ایک دن میں بارہ بارہ دفعہ سنتا تھا۔ لڑکیوں کا باپ مفلوج تھا، اور اُس کے گلے سے گدھے کی سی گھٹی گھٹی چیخیں نکلتی تھیں اور وہ بھی بڑے زور لگانے سے۔ لیکن لڑکیاں بھوتوں کی سی طاقت سے گاتی تھیں۔ وہ آواز ملا کر چیخا کرتی تھیں جیسے ہوا کے عفریت انسانیت کی شکست پر خوشیاں منا رہے ہوں۔ کبھی کبھی کوئی آدمی اُوپر کھڑکی سے اخبار کے کاغذ میں پیسہ باندھ کے نیچے پھینک دیتا تھا۔ پیسہ پھٹ سے زمین پر پڑتا تھا اور اس کی چوٹ بندوق کی گولی کی طرح لگتی تھی۔ لیکن لڑکیوں کے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی تھی۔

کبھی کبھی دورہ کرنے والی نرس فراؤ نوواک کو دیکھنے آیا کرتی تھی۔ وہ سونے کے انتظامات دیکھ کر سر ہلاتی تھی اور پھر چلی جاتی تھی۔ مکانوں کا انسپکٹر بھی آیا کرتا تھا۔ وہ

زرد رُو نوجوان تھا اور کھلا ہوا کالر لگاتا تھا۔ (غالباً وہ اصولاً یہ کالر لگاتا تھا۔) انسپکٹر لمبے چوڑے نوٹ لکھ کر لے جایا کرتا تھا۔ وہ فراؤ نوواک سے کہا کرتا تھا کہ اُوپر کی کوٹھڑی بڑی گندی ہے اور رہنے کے قابل نہیں ہے۔ یہ بات وہ کچھ ملامت آمیز لہجے میں کہتا تھا جیسے اس میں ہمارا بھی تھوڑا سا قصور ہو۔ فراؤ نوواک کو ان لوگوں کا آنا بڑا بُرا معلوم ہوتا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ دراصل یہ لوگ جاسوسی کرنے آتے ہیں۔ اُنہیں یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ نرس یا انسپکٹر کہیں ایسے وقت نہ آجائیں جب مکان گندا ہو۔ اُن کے شبہات اتنے گہرے تھے کہ ان لوگوں کو جلدی سے جلدی مکان سے باہر نکالنے کے لئے انہیں طرح طرح کے جھوٹ بولنے میں بھی باک نہیں تھا۔ کبھی کہہ دیتی تھیں کہ چھت زیادہ نہیں ٹپکتی، کبھی کچھ اور۔

ایک آدمی بڑی باقاعدگی سے آتا تھا۔ یہ ایک یہودی درزی تھا جو قسطوں پر ہر طرح کے کپڑے بیچتا تھا۔ وہ پستہ قد اور نرم مزاج تھا، اور اپنی باتوں سے آدمی کے دل میں بڑی جلدی گھر کر لیتا تھا۔ سارا دن وہ اس علاقے کے مکانوں میں پھرتا رہتا تھا۔ یہاں سے پچاس فیننگ لے لئے، وہاں سے ایک مارک لے لیا۔ غرض کہ وہ مرغی کی طرح اس بنجر زمین سے اپنی دال روٹی کا بندوبست کرتا پھرتا تھا، اور اس کا بھی ٹھیک نہیں تھا کہ انتظام پوری طرح ہو بھی جائے گا یا نہیں۔ وہ روپے کا زیادہ تقاضہ نہیں کرتا تھا۔ اس کے بجائے وہ اپنے قرض داروں کو اُکسایا کرتا تھا کہ اُس سے کچھ اور چیزیں خرید لیں اور ادائیگی کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیں۔ دو سال ہوئے فراؤ نوواک نے تین سو مارک میں اوٹو کے لئے ایک سوٹ اور ایک اوورکوٹ خریدا تھا۔ یہ سوٹ اور اوورکوٹ مدّت ہوئی پھٹ پھٹا کے ختم بھی ہو چکا تھا، لیکن روپیہ ابھی تک ادا نہیں ہوا تھا۔ میرے آنے کے تھوڑے دن بعد ہی فراؤ نوواک نے گریٹے کے لئے پچھتر مارک کے کپڑے اور لے لئے۔ مگر درزی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

اس علاقے کے سارے آدمیوں پر اُس کا روپیہ چاہیئے تھا، لیکن وہ غیر مقبول تھا، بلکہ اُس کا درجہ تو اس علاقے کے ایک بڑے نمایاں کردار کا تھا جسے لوگ حقیقی بغض یا عداوت کے بغیر یونہیں گالیاں دیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی فراؤ نوواک کہا کرتی تھیں "شاید لوٹار ہی ٹھیک کہتا ہے۔ جب ہٹلر آ جائے گا تو وہ اِن یہودیوں کو مزا چکھا دے گا۔ پھر وہ اتنی بدتمیزی نہیں کر سکیں گے۔" لیکن جب میں انہیں بتاتا کہ اگر ہٹلر کی بات چل گئی تو وہ اس درزی کو یہاں سے بالکل ہی ہٹا دے گا، تو یہ سن کر فراؤ نوواک کا لہجہ فوراً بدل جاتا، "نہیں، میں یہ تو نہیں چاہتی۔ یہ درزی بڑے اچھے کپڑے سیتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر آدمی کو پریشانی ہو تو یہودی روپیہ مانگنے میں ضد نہیں کرتا بلکہ کچھ مہلت دے دیتا ہے۔ کوئی عیسائی ایسا نہیں مل سکتا جو اس طرح قرضہ دیتا ہو۔ اس محلے کے لوگوں سے پوچھ لیجیے، ہر کرسٹوف یہ لوگ یہودیوں کو کبھی بھی نہیں نکالنا چاہیں گے۔"

اوٹو دن بھر افسردہ سا اِدھر اُدھر پڑا پھرتا تھا۔ یا تو وہ مکان ہی میں لوٹتا رہتا تھا یا نیچے صحن کے دروازے پر اپنے دوستوں سے گپ میں مشغول رہتا تھا۔ شام کے قریب ذرا اس کی طبیعت بحال ہونے لگتی تھی۔ جب میں کام سے لوٹتا تھا تو عموماً یہ دیکھتا تھا کہ اُس نے اپنا سویٹر اور نکر بوکر اُتار دیا ہے اور اپنا بہترین سوٹ پہن رہا ہے۔ اُس کے کوٹ کے کندھوں میں اتنی لکرم بھری ہوئی تھی کہ وہ بالکل نوک دار بن گئے تھے، اُس کی ڈبل بریسٹ واسکٹ خوب پھنس کے آتی تھی اور اُس کا پتلون نیچے سے گول گول تھا۔ اُس کے پاس بہت سی ٹائیاں تھیں اور وہ کوئی ٹائی چن کر اپنے اطمینان کے مطابق باندھنے میں کم سے کم آدھ گھنٹہ لگاتا تھا۔ باورچی خانے میں جو ٹوٹا ہوا آئینہ تھا وہ اُس کے

سامنے کھڑا عجیب احمقانہ انداز سے مسکراتا رہتا تھا اور اُس کے گلابی اور گول چہرے میں نخوت کے مارے گڑھے پڑ جاتے تھے۔ اُس کے وہاں کھڑے ہونے سے فراؤ نوواک کا بڑا ہرج ہوتا تھا لیکن وہ اُن کے احتجاجوں کی بالکل پروا نہیں کرتا تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہی وہ ناچنے کے لئے چل دیتا تھا۔

عام طور سے میں بھی شام کو باہر چلا جاتا تھا۔ چاہے میں کتنا ہی تھکا ہوا ہوں مگر کھانا کھاتے ہی مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ گریٹے اور اُس کے ماں باپ اکثر نو بجے تک سو جاتے تھے۔ چنانچہ میں سینما چلا جاتا تھا یا کسی کیفے میں بیٹھ جاتا تھا، اور اخبار پڑھتا رہتا تھا اور جمائیاں لیتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

ہماری سڑک کے آخر میں ایک شراب خانہ تھا جس کا نام الگزینڈر کیسینو تھا۔ ایک دن شام کو میں اور اوٹو دونوں ایک ساتھ گھر سے نکلے۔ تو اوٹو نے مجھے یہ جگہ دکھائی۔ اس شراب خانے میں جانے کے لئے سڑک سے چار سیڑھیاں نیچے اُترنا پڑتا تھا۔ پھر دروازہ کھول کے چمڑے کا بھاری سا پردہ اٹھایا جاتا تھا جو بوچھار روکنے کے لیے لگا ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک نیچی چھت کا لمبا سا میلا کچیلا کمرہ آتا تھا۔ اس میں لال لال چینی لالٹینیں لٹکی ہوئی تھیں اور کاغذ کی گرد آلود جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے کنارے کنارے بید کی میزیں اور بڑی بڑی گندی سی بینچیں رکھی تھیں جو انگلستان کے تھرڈ کلاس کے ڈبوں کی نشستوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ کمرے کے دوسرے کونے پر جعفریوں سے کُنج بنا رکھے تھے جن پر تاروں کے ذریعے نقلی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ؟ کمرہ نم آلود تھا اور بیئر کی بُو آ رہی تھی۔

میں یہاں پہلے بھی آ چکا تھا، یعنی ایک سال ہوا، اُس زمانے میں جب فرٹز وینڈل سنیچر کی شام کو مجھے شہر کے "اڈے" دکھانے لے جایا کرتا تھا۔ یہ جگہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی

میں نے چھوڑی تھی۔ لیکن اتنی خوفناک اور دلفریب نہیں رہی تھی، اور نہ زندگی کے معانی سے متعلق ایک زبردست حقیقت کی علامت نظر آتی تھی ــــ کیونکہ آج میں بالکل نشے میں نہیں تھا۔ شراب خانے کا مالک وہی آدمی تھا جو پہلے مکّے بازی کیا کرتا تھا۔ وہ اسی طرح اپنی توند تختے پر لٹکائے ہوئے تھا۔ ویٹر بھی وہی تھا، اور اپنا میلا کچیلا سفید کوٹ پہنے سکڑا سمٹا لڑکھڑاتا ہوا آرہا تھا۔ دو لڑکیاں جو شاید بالکل وہی تھیں، لاؤڈ اسپیکر کے گانے کے ساتھ ساتھ ناچ رہی تھیں۔ سویٹر اور چمڑے کی جیکٹیں پہنے ہوئے کچھ نوجوان تاش کھیل رہے تھے۔ تماشائی اُن کے اوپر جھک کر کھیل دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکا جس کے بازو گدے ہوئے تھے، چولھے کے قریب بیٹھا کسی جاسوسی ناول میں غرق تھا۔ اس کا گریبان کھلا ہوا تھا اور آستینیں بغلوں تک اُوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ اُس نے نِکر اور جرّابیں پہن رکھی تھیں جیسے دوڑ میں حصّہ لینے والا ہو۔ وہاں دور کُنج میں ایک آدمی اور ایک لڑکا اکھٹے بیٹھے تھے۔ لڑکے کا چہرہ گول گول اور بالکل بچّوں کا سا تھا۔ اُس کے پپوٹے بھاری اور سُرخ تھے اور کچھ سُوجے ہوئے معلوم ہو رہے تھے جیسے وہ ٹھیک طرح سو نہ سکا ہو۔ وہ اپنے ساتھ والے آدمیوں کو کوئی بات سنا رہا تھا۔ یہ آدمی کچھ زیادہ عمر کا تھا، اُس کا سر منڈا ہوا تھا اور خاصا شریف معلوم ہوتا تھا۔ وہ بادلِ ناخواستہ بیٹھا باتیں سن رہا تھا اور ایک چھوٹا سا سگار پی رہا تھا۔ لڑکا اپنی کہانی بڑی احتیاط اور بڑے صبر کے ساتھ سنا رہا تھا بیچ بیچ میں اپنی بات پر زور دینے کے لئے وہ اُس آدمی کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیتا تھا اور اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ لڑکا اُس آدمی کے چہرے کی ذرا ذرا سی حرکت کی نگرانی بڑی ہوشیاری اور بڑے غور سے کر رہا تھا جیسے کوئی ڈاکٹر کسی اعصابی مریض کی۔

کچھ دن بعد اس لڑکے سے میری اچھی خاصی شناسائی ہو گئی۔ اُس کا نام پیپس تھا، اور وہ بہت سفر کر چکا تھا۔ وہ چودہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گیا تھا۔ کیونکہ اُس کا باپ جو لکڑہارا تھا اُسے بہت مارا پیٹا کرتا تھا۔ پیپس پیدل ہی ہیمبرگ جا پہنچا۔ ہیمبرگ میں وہ ایک اینٹورپ سے آنے والے جہاز میں کوئلہ جھونکنے پر نوکر ہو گیا۔ پھر اینٹورپ سے رائن کے کنارے پیدل چلتا ہوا جرمنی واپس آ گیا۔ وہ آسٹریا اور چیکوسلواکیہ بھی دیکھ چکا تھا۔ اُسے سینکڑوں گانے، کہانیاں اور لطیفے یاد تھے۔ وہ بہت ہی خوش مزاج اور زندہ دل تھا۔ اُس کے پاس جو کچھ ہوتا اپنے دوستوں کو بھی اس میں شریک کر لیتا۔ اُسے کبھی بھی یہ پروا نہیں ہوتی تھی کہ اگلے وقت کا کھانا کہاں سے آئے گا۔ جیب کاٹنے میں وہ بڑا ماہر تھا اور خاص طور سے فریڈرخ اسٹراسے کی ایک تفریح گاہ میں کام کرتا تھا، جہاں جاسوس بھرے رہتے تھے اور یہ جگہ اب بڑی خطرناک ہوتی جا رہی تھی۔ اس تفریح گاہ میں طاقت آزمانے کی مشینیں اور دل لگی کے دوسرے سامان تھے۔ الگزینڈر کیسینو کے زیادہ تر لڑکے تیسرے پہر کا وقت یہیں گزارا کرتے تھے۔ اس وقت اُن کی لڑکیاں ریڈرخ اسٹراسے اور لنڈن میں لوگوں کی تلاش میں نکل جاتی تھیں۔

پیپس اپنے دو دوستوں، گرہارٹ اور کرٹ کے ساتھ اسٹیشن کے قریب نہر کے کنارے ایک کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ یہ کوٹھڑی گرہارٹ کی خالہ کی تھی، جو فریڈرخ اسٹراسے کی ادھیڑ عمر کی طوائف تھی اور جس کی باہوں اور ٹانگوں پر سانپ، چڑیاں اور پھول بنے ہوئے تھے۔ گرہارٹ لمبے قد کا لڑکا تھا اور اُس کی مسکراہٹ بڑی مبہم، احمقانہ اور افسردہ سی تھی۔ وہ جیبیں نہیں کاٹتا تھا، بلکہ بڑی بڑی دکانوں میں سے چیزیں چرایا کرتا تھا۔ وہ ابھی تک پکڑا نہیں گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ اُس کی مجنونانہ دلیری تھی۔ احمقوں کی طرح مسکراتے ہوئے وہ

دکان والو نکی آنکھوں کے سامنے سے چیزیں اُٹھا کر اپنی جیبوں میں بھر لیتا تھا۔ وہ جو کچھ چراتا تھا اپنی خالہ کو دے دیتا تھا اور اُس کی خالہ اس کی کاہل وجودی پر اُسے گالیاں سناتی رہتی تھی، اور روپے پیسے سے بہت تنگ رکھتی تھی۔ ایک دن ہم لوگ اکٹھے بیٹھے تھے کہ اُس نے اپنی جیب سے چمڑے کی بنی ہوئی ایک بڑی چمکدار اور رنگین پیٹی نکالی، "دیکھو کرسٹوف، اچھی ہے نا؟"

"کہاں سے ملی؟"

"لانڈاور کے یہاں سے۔" گرہارٹ نے مجھے بتایا۔ "کیوں ... ہنس کیوں رہے ہو؟"

"بات یہ ہے کہ لانڈاور لوگ میرے دوست ہیں۔ مجھے ہنسی آگئی ——— اور کوئی بات نہیں تھی۔"

گرہارٹ کا چہرہ فوراً مایوسی کی تصویر بن گیا، "انہیں بتاؤ گے تو نہیں کرسٹوف؟"

"نہیں۔" میں نے وعدہ کیا۔ "میں نہیں بتاؤں گا۔"

کرٹ اوروں کی بہ نسبت الگزینڈر کیسینو میں کم آتا تھا۔ میں پیپی اور گرہارٹ کو اتنی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا جتنا اسے، کیونکہ وہ شعوری طور پر مغموم رہتا تھا۔ اُس کے کردار میں ایک بڑا ناعاقبت اندیشانہ اور مہلک عنصر تھا۔ اس میں یہ عجیب صلاحیت تھی کہ اپنی زندگی کی ناامیدی اور مایوسی کے خلاف بیٹھے بیٹھے یکایک بھڑک اٹھتا تھا۔ جرمن لوگ اُسے جنون کہتے ہیں۔ وہ اپنے کونے میں چپ چاپ بیٹھا جلدی جلدی شراب پیتا رہتا اور مکّوں سے میز بجاتا رہتا۔ اُس کے انداز میں بڑا تحکم اور ساتھ ہی ساتھ اضمحلال ہوتا۔ پھر وہ یکایک اچھل کے کھڑا ہو جاتا اور کہتا، "آخ تھو، لعنت!" اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا باہر چل دیتا۔ اس حالت میں وہ جان بوجھ کے دوسرے لڑکوں سے لڑ پڑتا،

ایک ساتھ تین تین چار چار لڑکوں سے بھڑ جاتا. یہاں تک کہ اُس کے چہرے سے خون بہنے لگتا. اور نیم بیہوشی کی حالت میں اُسے سڑک پر پھینک دیا جاتا. ایسے موقعوں پہ پیپ اور گرہارٹ بھی، اُس کے مخالفوں کے ساتھ شامل ہو جاتے جیسے کسی قومی خطرے کے خلاف. وہ بھی اُس کے ایسے ہی زور کے مکّے مارتے تھے جیسے اور لوگ، اور بعد میں اُسے گھسیٹتے ہوئے گھر لے جاتے تھے. حالانکہ وہ اکثر اپنے مکّوں سے اُن کا سر پھوڑ دیتا تھا لیکن وہ وہ اپنے دل میں ذرا بھی عداوت نہ آنے دیتے تھے. معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے رویّے پر اُنہیں ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی. اگلے دن وہ پھر ویسے ہی دوست بن جاتے تھے.

جب میں گھر واپس پہنچتا تھا تو ہر نوواک اور فراؤ نوواک کو سوتے ہوئے بھی شاید دو تین گھنٹے گزر چکے ہوتے تھے. اوٹو عام طور سے اور بھی بعد میں آتا تھا. ویسے تو ہر نوواک کو اپنے بیٹے کی بہت سی باتیں بُری لگتی تھیں، لیکن چاہے کوئی وقت ہوا نہیں سوتے سے اُٹھ کر دروازہ کھولنے میں تکلّف نہیں ہوتا تھا. نہ معلوم کیا پُراسرار وجہ تھی کہ ہم نے بہت کہا نوواک لوگوں نے ہم دونوں میں سے کسی کو بھی تالی نہیں دی. جب تک کہ دروازے کی زنجیر نہ بند ہو جائے اور تالا نہ لگ جائے انہیں نیند نہیں آتی تھی.

اس علاقے میں چار گھروں کے حصّے میں ایک پیخانہ آتا تھا. ہمارا پیخانہ نیچے والی منزل میں تھا. اگر سونے سے پہلے مجھے رفع حاجت کی ضرورت پڑتی تو مجھے دوبارہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے بیٹھنے کے کمرے میں سے ہو کر یا باورچی خانے جانا پڑتا. میں میز کے کنارے کنارے چلتا، کوشش کرتا کہ نوواک لوگوں کے پلنگ سے نہ ٹکرا جاؤں یا جس پلنگ پر لوٹار اور گرہارٹ سو رہے ہیں اُسے نہ ہلا دوں. چاہے میں کتنی ہی احتیاط سے

چلوں، فراؤ نواک کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے اندھیرے میں دیکھ لیتی ہیں۔ وہ مجھے بڑے اخلاق کے ساتھ ہدایتیں دینا شروع کر دیتیں اور میں گڑبڑا جاتا،

"نہیں، ہر کرسٹوف ـــــ وہاں نہیں۔ وہ بائیں طرف بالٹی میں، چولھے کے قریب۔"

یہ علاقہ انسانوں کے ایک زبردست بھٹ کی طرح تھا۔ اس کے ایک چھوٹے سے کونے میں بستر پہ لیٹا ہوا میں نیچے صحن سے آنے والی ایک ایک آواز سنتا رہتا تھا۔ آوازیں اتنی صاف سنائی دیتی تھیں کہ عجب ڈر سا لگنے لگتا تھا۔ صحن کچھ ایسی شکل کا بنا ہوا تھا کہ گراموفون کے بھونپو کا کام کرتا تھا۔ کوئی آدمی زینے پر سے اُتر رہا ہوتا۔ عموماً یہ ہمارا ہمسایہ ہر مولر ہوتا۔ اُسے رات کو ریل میں کام کرنے جانا پڑتا تھا۔ میں سنتا رہتا تھا کہ جیسے جیسے وہ سیڑھیاں نیچے اُتر رہا ہے ویسے ویسے ہی اُس کے قدموں کی آواز ہلکی ہوتی جا رہی ہے۔ پھر یہ آوازیں صحن کو پار کرتیں اور گیلے پتھر پہ چپچپاتی ہوئی سی اور بالکل صاف سنائی دیتیں۔ میں آوازوں کی طرف کان لگا دیتا تو سڑک والے پھاٹک کے تالے میں کُنجی گھومنے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی، یا مجھے ایسا معلوم ہوتا۔ ایک لمحے بعد دروازہ ایک گہری اور کھوکھلی سی گونج کے ساتھ بند ہو جاتا۔ اب برابر والے کمرے میں فراؤ نوواک پر کھانسی کا دورہ پڑ جاتا۔ اس کے بعد خاموشی طاری ہو جاتی۔ اتنے میں لوٹار نیند میں بڑبڑاتا اور کسی کو دھمکیاں دیتا ہوا کروٹ لیتا اور اُس کا پلنگ چرچرانے لگتا۔ صحن کے دوسری طرف کہیں ایک بچہ رونا شروع کر دیتا۔ کوئی کھڑکی دھڑ سے بند ہوتی۔ عمارت میں کہیں بہت دور اندر جا کر کوئی بہت ہی بھاری چیز دیوار سے بھد بھد ٹکرانے لگتی۔ مجھے ایسی ہی وحشت ہوتی جیسے جنگل میں اکیلا سو رہا ہوں۔

نوواک لوگوں کے یہاں اتوار کا دن بڑا لمبا گزرا، ایسے گندے موسم میں جا بھی تو نہیں سکتے کہیں۔ ہم سب کے سب گھر ہی رہے۔ ہر نوواک نے چڑیاں پکڑنے کے لئے ایک جال بنایا تھا، اور کھڑکی میں لگا دیا تھا۔ گریٹے اور ہر نوواک دونوں بیٹھے اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ اسی طرح گھنٹوں بیٹھے جال کو تکتے رہے۔ وہ ڈوری جس سے جال بند ہوتا تھا گریٹے کے ہاتھ میں تھی۔ کبھی کبھی وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑتے تھے، اور میری طرف بھی نظر ڈال لیتے تھے۔ میں میز کے دوسری طرف بیٹھا ایک پرچہ سامنے رکھے اسے گھور رہا تھا۔ میں نے اس پر لکھ رکھا تھا، "لیکن، ایڈورڈ، تم اتنی سی بات سمجھ نہیں سکتے؟" میں اپنا ناول آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ناول ایک خاندان کے بارے میں تھا جو بغیر محنت کئے حاصل کی ہوئی آمدنی کے سہارے دیہات میں ایک بہت بڑی کوٹھی میں رہتا تھا۔ اور اس خاندان والے بہت ہی بدمزگی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُن کا سارا وقت ایک دوسرے کو یہی بتاتے رہنے میں صرف ہوتا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے لطف کیوں نہیں حاصل کر سکتے۔ ان میں سے بعض سوجھ بوجھ بڑی انوکھی تھیں —— یعنی یہ میری رائے ہے۔ بدقسمتی سے میں نے دیکھا کہ اس المناک خاندان سے میری دلچسپی گھٹتی جا رہی ہے۔ نوواک خاندان کا ماحول اس باب میں زیادہ معاون ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ اوتو اندر والے کمرے کا دروازہ کھولے اپنی دنگی کے لئے ایک پرانے گراموفون کی گھومنے والی تختی پر، جس کا ساؤنڈ بکس باقی رہا تھا نہ بھونپو، شیشے کے آرائشی برتن جما جما کر دیکھ رہا تھا کہ وہ کتنی دیر میں اُڑ کے دُور گرتے ہیں اور ٹوٹ جاتے ہیں۔ لوثار اپنے ہمسایوں کے تالے ٹھیک کر رہا تھا اور تالیاں بنا رہا تھا وہ بڑی تندہی سے کام میں مشغول تھا اور اس کا زرد مضمحل چہرہ تالوں پر جھکا ہوا تھا۔

فراؤ نوواک کھانا پکا رہی تھیں۔ اُنہوں نے اچھے بھائی اور نکمّے بھائی کے متعلق وعظ شروع کر دیا، "ذرا لوٹار کو دیکھ، اُس کی نوکری چھوٹ جاتی ہے تب بھی وہ کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتا ہے، لیکن تو تو بس چیزیں توڑنے پھوڑنے کا ہے۔ تو میرا بیٹا نہیں ہے۔"

اوٹو اپنے بستر پہ پڑا ہنستا رہا۔ کبھی کبھی وہ کوئی گندی سی گالی دے دیتا تھا، یا اپنے ہونٹوں سے ریاح خارج کرنے کی سی آواز نکالتا تھا۔ بعض دفعہ تو اُس کا لب و لہجہ ایسا طعن آمیز ہوتا تھا کہ اُس کے تھپّڑ مارنے کو جی چاہتا تھا ــــ اور وہ خود بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ فراؤ نوواک اُسے ڈانٹتے ڈانٹتے چیخنے لگیں، "جی چاہتا ہے کہ تجھے تو گھر سے نکال دوں! تو نے ہمیں فائدہ ہی کیا پہنچایا ہے؟ جب کوئی کام ہوتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ میں تھکا ہؤا ہوں۔ لیکن آدھی آدھی رات تک جو آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے اُس میں نہیں تھکتا؟ لُچّا کہیں کا، نکھٹو۔"

اوٹو اچھل کے کھڑا ہو گیا، اور وحشیانہ فتح مندی کے ساتھ چیخ چیخ کے سارے کمرے میں ناچنے لگا۔ فراؤ نوواک نے صابن اُٹھا کے کھینچ مارا۔ وہ جلدی سے ایک طرف کو ہو گیا، اور صابن جا کے کھڑکی میں لگا۔ اب فراؤ نوواک بیٹھ گئیں اور رونے لگیں۔ اوٹو فوراً بھاگا ہؤا اُن کے پاس پہنچا اور زور زور سے بوسے لے کے اُنہیں تسلّی دینے لگا۔ لوٹار یا ہر نوواک کسی نے بھی اس لڑائی جھگڑے کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی۔ بلکہ معلوم ہوتا تھا ہر نوواک کو تو بڑا مزا آیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے چالاک نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے آنکھ ماری۔ کھڑکی میں جو سوراخ ہو گیا تھا اُسے گتّے کے ٹکڑے سے بند کر دیا۔ مگر اُس کی جگہ نیا شیشہ کبھی نہیں لگا۔ اُوپر والی کوٹھڑی میں پہلے ہی بہت سے سوراخوں سے بوچھار آیا کرتی تھی اب یہ ایک اور بڑھ گیا۔

رات کے کھانے کے وقت ہم سب بڑے خوش تھے۔ ہرنوواک کھانے کی میز سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور نقلیں اُتار اُتار کے بتانے لگے کہ یہودی اور کیتھلک کس طرح نماز پڑھتے ہیں۔ وہ گھٹنوں کے بل گر پڑے اور کئی دفعہ زمین پہ زور زور سے سر مارا۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ مہمل لفظ بڑبڑاتے جا رہے تھے۔ یہ گویا عبرانی اور لاطینی دعائیں تھیں، "کوئی ووچ کا، کوئی ووچ کا، کوئی ووچ کا۔ آمین۔" پھر اُنہوں نے سزاؤں کی خوفناک کہانیاں سنائیں جن سے گریٹے اور فراؤ نوواک کو بڑا ڈر لگا، اور مزا بھی آیا: "ولیم اوّل کبھی موت کی سزا پہ دستخط نہیں کرتا تھا، تمہیں معلوم ہے کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کے تخت پر بیٹھنے کے تھوڑے ہی دن بعد قتل کا ایک بڑا مشہور مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ بہت دنوں تک جج فیصلہ ہی نہ کر سکے کہ قیدی مجرم ہے یا معصوم۔ آخر انہوں نے اُسے موت کی سزا دی۔ اُسے چبوترے پہ کھڑا کیا گیا اور جلّاد نے اپنا تبر اٹھا لیا—— اس طرح —— اور اسے ہلایا —— یوں، اور کھٹ سے مارا! (یہ لوگ اپنے کام میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ ہم تم تو ایک وار میں آدمی کا سر نہیں کاٹ سکتے چاہے ایک ہزار مارک ہی کیوں نہ ملتے ہوں۔) اور سر وہ جا کے گرا دور ٹوکری میں —— دھڑ!" ہرنوواک آنکھیں گول گول گھمانے لگے، اپنی زبان ایک طرف کو باہر نکال دی اور کٹے ہوئے سر کی بڑی واضح اور کراہیت انگیز نقل پیش کی۔ "اور پھر سر بولنے لگا۔ وہ کہنے لگا، 'میں معصوم ہوں!' (اصل میں یہ اعصاب کی وجہ سے ہوا۔ مگر سر بالکل صاف بول رہا تھا جیسے میں اس وقت بول رہا ہوں) سر بولا، 'میں معصوم ہوں!'.... دو ایک مہینے بعد ایک اور آدمی نے مرنے سے پہلے اعتراف کر لیا کہ اصلی قاتل میں تھا۔ اس کے بعد ولیم کا دستور یہ ہو گیا کہ وہ موت کی سزا پر کبھی دستخط نہیں کرتا تھا!"

واسر ٹوراسٹراسے میں ہر ہفتہ ایسا ہی ہوتا تھا جیسا کوئی دوسرا ہفتہ۔ ہماری چھوٹی سی بند کوٹھڑی ٹپکتی تھی، اور اس میں گندی نالیوں اور کھانا پکانے کی بو آتی رہتی تھی۔ اگر بیٹھنے کے کمرے میں چولہا روشن ہوتا تو ہم سانس تک نہ لے سکتے۔ جب چولہا بجھ جاتا تو ہم ٹھٹھرنے لگتے۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ جب فراؤ نوواک کو کام سے فرصت ہوتی تو وہ اسپتال سے محکمہ صحت کے دفتر اور پھر وہاں سے واپس اسپتال کی سڑکوں پہ گھسٹتی پھرتیں۔ انہیں گھنٹوں دالانوں میں بنچ پر بیٹھے رہنا پڑتا، یا درخواست کے پیچیدہ فارموں میں سر کھپانا پڑتا ڈاکٹر ٹھیک طرح بتاتے ہی نہ تھے کہ انہیں کیا علاج کرنا چاہیئے۔ ایک ڈاکٹر تو انہیں فوراً سینے ٹوریم بھیج دینے کے حق میں تھا، دوسرے کا خیال تھا کہ ان کی حالت بہت خراب ہو چکی ہے اور اب بھیجنا بالکل بیکار ہے ـــــ اور اس نے انہیں بتا بھی دیا۔ ایک اور ڈاکٹر نے یقین دلایا کہ کوئی ایسی گھبرانے کی بات نہیں پہاڑ پہ جا کے دس پندرہ دن رہنا بہت کافی ہے۔ فراؤ نوواک تینوں کی باتیں بڑے احترام سے سنتی تھیں، اور ان ملاقاتوں کا حال بیان کرتے ہوئے ہمیشہ مجھے یقین دلایا کرتی تھیں کہ ان میں سے ہر ڈاکٹر ایسا ہوشیار اور نرم دل تھا کہ یورپ بھر میں نہیں مل سکتا۔

وہ مٹی میں سنے ہوتے جوتے لئے کھانستی تھرتھراتی بالکل تھکی ہوئی، اور نیم مخبوط الحواس گھر واپس آتیں۔ گھر میں قدم رکھتے ہی وہ خود بخود گر بیٹے یا اوٹو کو ڈانٹنا شروع کر دیتیں، جیسے کوئی کل دار گڑیا بول رہی ہو:

"میری باتیں کان کھول کے سن لے ـــــ تو ایک نہ ایک دن جیل خانے پہنچے گا! جی چاہتا ہے کہ جب تو چودہ سال کا تھا تجھے اصلاحی جیل بھیج دیتے۔ تیرا تو یہی علاج تھا

.....میرے خاندان بھر میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہوا جو شریف اور نیک نہ ہوا اب ایک تو ایسا پیدا ہوا ہے۔"

"تم شریف ہو!" اوٹو طعن آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہتا۔ "جب تم لڑکی تھیں تو جو لڑکا بھی مل جائے اُسی کے ساتھ چل دیتی تھیں۔"

"زبان سنبھال کے بول! سنتا ہے؟ زبان سنبھال! تجھے جنم دینے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی؟ بدمعاش کہیں کا! ایسا دیکھا نہ سُنا۔"

اوٹو اُن کے واروں سے بچتا ہوا اُن کے چاروں طرف اُچھلنے لگتا اور ربنیب جھگڑا کھڑا کر دینے سے اُسے ایسی خوشی ہوتی کہ وہ بالکل پاگل ہو جاتا۔ اپنے جوش میں وہ طرح طرح کے منھ بناتا اور فراؤ نواک کو چڑاتا۔

"یہ تو پاگل ہو گیا ہے!" فراؤ نوواک کہتیں۔ "ذرا اسے دیکھئے تو، ہر کرسٹوف، میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ یہ دیوانہ ہے یا نہیں؟ میں اسے دکھانے اسپتال لیجاؤنگی۔"

یہ خیال اوٹو کے رومانی تخیل کو بہت پسند آتا تھا۔ جب ہم اکیلے ہوتے وہ اکثر آنکھوں میں آنسو بھر کے کہتا، "میں یہاں زیادہ دن نہیں رہوں گا، کرسٹوف۔ میرے اعصاب خراب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بہت جلدی میں اسپتال میں پہنچ جاؤں گا۔ وہاں مجھے تنگ سی واسکٹ پہنائی جائے گی، اور ربڑ کی نلکی سے غذا پہنچائی جائے گی۔ اور جب تم مجھے دیکھنے آؤ گے تو میں پہچان بھی نہیں سکوں گا کہ کون ہے۔"

اس گھر میں صرف فراؤ نوواک اور اوٹو ہی کے آثار خراب نہیں تھے۔ آہستہ آہستہ مگر بڑی باقاعدگی کے ساتھ نوواک لوگ میری مدافعت ختم کئے دے رہے تھے۔ میں ہر روز دیکھتا کہ باورچی خانے کی بدبو تھوڑی سی اور بڑھ گئی ہے۔ اوٹو کی آواز لڑتے ہوئے ہر روز

زیادہ سخت ہوتی جا رہی تھی اور اس کی ماں کی آواز بھرّاتی چلی جا رہی تھی۔ گرینٹے کا رونا سن کر میں دانت کچکچانے لگتا تھا۔ جب اڈو زور سے دروازہ بند کرتا تو میں غصے کے مارے لرز اُٹھتا۔ رات کو جب تک میں تھوڑا بہت نشے میں نہ ہوں مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بڑا ناخوشگوار اور پُراسرار قسم کا دانہ بھی نکل آیا تھا جس کی مجھے بڑی فکر ہو رہی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ فراؤ نوواک کے کھانے کی وجہ سے ہو، یا کوئی اور بھی خراب وجہ ہو۔

اب میں زیادہ تر اپنی شامیں الگزینڈر کیسینو میں گزارتا تھا۔ چولھے کے قریب کونے میں ایک میز رکھی تھی، میں یہاں بیٹھ کے خط لکھتا رہیپ اور گرہارٹ سے باتیں کرتا، یا دل بہلانے کے لئے دوسرے گاہکوں کو دیکھتا رہتا۔ عام طور سے یہ جگہ بڑی پُرسکون رہتی تھی۔ ہم سب شراب کی میز کے چاروں طرف بیٹھ جاتے، یا کبھی ٹیک کے کھڑے ہو جاتے اور انتظار کرتے رہتے کہ کوئی نئی بات ہو۔ باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آتے ہی ایک درجن بھر آنکھیں اُٹھ جاتیں کہ دیکھیں چمڑے کے پردے کے پیچھے سے کون آدمی نمودار ہوتا ہے۔ عام طور سے نووارد اپنی ٹوکری لئے کوئی بسکٹ بیچنے والا ہوتا یا چندہ جمع کرنے کے ڈبے اور رسالوں سمیت مکتی فوج کی کوئی لڑکی ہوتی۔ اگر بسکٹ والا اچھی بکری کر آیا ہو یا نشے میں ہو تو وہ مٹھائی کے بنڈلوں کے لئے ہمارے ساتھ پانسہ پھینک پھینک کے جوا کھیلنے لگتا۔ اگر مکتی فوج کی لڑکی ہوتی تو وہ میرے کمرے بھر میں اپنی بک بک کرتی پھرتی اور اُسے کچھ بھی نہ ملتا۔ آخر وہ چلی جاتی اور ہم ذرا بھی تکلیف یا بے آرامی محسوس نہ کرتے۔ وہ شام کے روزانہ معمول کا ایسا لازمی حصّہ بن گئی تھی کہ اُس کے چلے جانے کے بعد گرہارٹ اور رہیپ اُس پر پھبتیاں تک نہیں کستے تھے۔ پھر ایک بڈھا ڈگمگاتا ہوا آجاتا، شراب والے کے کان میں کچھ کہتا اور اُس کے ساتھ میز کے پیچھے والے

کمرے میں چلا جاتا ۔ وہ کوکین کھاتا تھا ۔ ایک لمحے بعد وہ پھر باہر آتا، کچھ مبہم سی
شائستگی کے ساتھ ٹوپی اُتار کے ہمیں سلام کرتا اور پھر لڑکھڑاتا ہوا باہر چلا جاتا۔ اعصاب
کی خرابی کی وجہ سے بڈھے کے اعصاب سائڈ گئے تھے، اور اُس کا سر ہر وقت ہلتا رہتا تھا
جیسے زندگی کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہو —— نہیں، نہیں، نہیں۔

کبھی کبھی مجرموں یا اصلاحی جیل سے بھاگے ہوئے لڑکوں کی تلاش میں پولیس بھی آجاتی
تھی۔ عام طور سے اُن کے آنے کی پہلے ہی سے توقع رہتی تھی اور تیاری کرلی جاتی تھی۔ ہیپس نے
مجھے بتایا کہ اگر آدمی پھنس ہی جائے تب بھی پیخانے کی کھڑکی سے مکان کے پیچھے والے صحن
میں کود سکتا ہے۔ "لیکن کرسٹوف، احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔" اُس نے ہدایت کی: "خوب
لمبا کودو، ورنہ کوئلے کی کوٹھری میں گر پڑو گے۔ ایک مرتبہ میں ایسے ہی گر پڑا تھا۔ ہیمبرگ ورنر
میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ وہ اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ آخر سپاہیوں نے اُسے پکڑ لیا۔"

سنیچر اور اتوار کی شام کو الگزینڈر کیسینو بھرا رہتا تھا۔ ویسٹ اینڈ سے لوگ اس طرح
آیا کرتے تھے جیسے دوسرے ملک سے سفیر۔ ان لوگوں میں بہت سے غیر ملکی بھی ہوتے تھے
—— زیادہ تر تو ولندیزی اور کچھ انگریز بھی۔ انگریز لوگ پرجوش آواز میں زور زور سے
باتیں کیا کرتے تھے۔ اُن میں سے بعض آدمی کچھ خوف زدہ معلوم ہوتے تھے۔ شاید انہیں یہ
خیال ہوتا تھا کہ اس چوروں کے غار میں کوئی چاقو نہ مار دے۔ ہیپس اور گرہارٹ اُنکی
میزوں پر بیٹھ جاتے تھے اور اُن کی آوازوں کی نقل اُتارتے تھے، اور ساتھ ساتھ مفت
کی شراب اور سگریٹیں پیتے جاتے تھے۔ سینگ کی عینک لگائے ہوئے کوئی دوہرے بدن
کا آدمی پوچھتا، "بِل نے حبشی گانے والوں کو جو مزے دار دعوت دی تھی، اُس میں تم
تھے؟" اور کوئی نوجوان ایک آنکھ میں عینک لگائے ہوئے زیرِ لب کہتا، "دنیا کی ساری

شاعری اُس چہرے میں جمع ہے۔" میں جانتا تھا کہ یہ آدمی اس وقت کیا محسوس کر رہا ہے مجھے اُس سے ہمدردی تھی، بلکہ رشک تھا۔ مگر یہ سوچ کر بڑا رنج ہوتا تھا کہ اب سے دو ہفتے بعد وہ کلب والوں یا پروفیسروں کی ایک منتخب جماعت کے سامنے ڈینگیں مارے گا، اور یہاں کے بارے میں اپنے کارنامے سنائے گا ـــــ یہ لوگ بڑی گرمجوشی مگر احتیاط کے ساتھ مسکراتے ہونگے، اور اُن کی میز چاندی کے تاریخی برتنوں اور سینکڑوں برس پرانی شراب سے مزیّن ہوگی۔ یہ سوچ کر میں اپنے آپ کو بڈھا سا محسوس کرنے لگتا تھا۔

آخر کار ڈاکٹروں نے فیصلہ کر لیا۔ فراؤ نوواک کو سینے ٹوریم بھیجا جا رہا تھا، اور بڑی جلدی ـــــ یعنی کرسمس سے تھوڑے دن پہلے۔ یہ خبر سنتے ہی انہوں نے درزی کو ایک نئے سوٹ کا آڈر دے دیا۔ انہیں اتنی خوشی اور اتنا جوش تھا جیسے کسی دعوت کا بُلاوا آیا ہو۔ "نرسیں قاعدے کا بڑا خیال رکھتی ہیں، ہر کرسٹوف۔ وہ اس کا بڑا خیال رکھتی ہیں کہ ہم لوگ بڑے صاف ستھرے رہیں۔ اگر ہم صاف نہ رہیں تو سزا ملتی ہے ـــــ اور واقعی ٹھیک بھی ہے ..... مجھے یقین ہے کہ وہ جگہ مجھے کافی پسند آئے گی۔" فراؤ نوواک نے ٹھنڈا سا سانس لیا۔ "بس ایک مجھے گھر کی فکر پڑی رہے گی۔ میں چلی جاؤں گی تو خدا جانے ان لوگوں کا کام کیسے چلے گا۔ یہ لوگ تو کسی کام کے ہیں ہی نہیں۔ ایسے ہیں جیسے بھیڑیں ....." شام کو وہ گھنٹوں بیٹھی خلا میں کے زیر جامے سیتی رہتیں اور اپنے آپ ہی اپنے آپ مسکراتی رہتیں، جیسے کوئی عورت امید سے ہو۔

جس روز میں جا رہا تھا، اُس دن تیسرے پہر کو اوٹو بہت مغموم تھا

اب تم جا رہے ہو کرسٹوف، پتہ نہیں میرا کیا حشر ہو گا۔ شاید چھ مہینے بعد میں زندہ بھی نہیں ہوں گا۔"

"میرے آنے سے پہلے بھی تو آخر تم کسی طرح گزر کرتے ہی تھے؟"

"لیکن اب اماں بھی تو جا رہی ہیں۔ شاید ابا تو مجھے کھانے کو بھی نہیں دیں گے۔"

"کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو!"

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو، کرسٹوف۔ مجھے نوکر رکھ لو۔ میں تمہارے کام آؤں گا۔ میں تمہارا کھانا پکاؤں گا، کپڑے ٹھیک کیا کروں گا، تمہارے شاگرد آئیں گے تو دروازہ کھول دیا کروں گا......" اوٹو کو اپنی یہ نئی حیثیت بڑی پسند آئی، اور اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "میں چھوٹی سی سفید جیکٹ پہنا کروں گا —— یا شاید نیلا رنگ بہتر ہو گا، اور چاندی کے بٹن ......"

"میرے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں کہ میں تمہیں نوکر رکھوں۔"

"لیکن کرسٹوف میں کوئی تنخواہ تھوڑے ہی لوں گا۔" اب اُسے محسوس ہوا کہ وہ بڑی فیاضی سے کام لے رہا تھا، چنانچہ اوٹو رُک گیا، اور پھر بڑی احتیاط برتتے ہوئے بولا، "میرا مطلب ہے کہ کبھی کبھی ناچنے جانے کے لئے دو ایک مارک لے لیا کروں گا۔"

"مجھے بڑا افسوس ہے۔"

فراؤ نوواک کے آجانے سے ہماری بات چیت ادھوری رہ گئی۔ وہ آج جلدی ہی گھر آ گئی تھیں، کیونکہ وہ مجھے رخصتی دعوت دینا چاہتی تھیں۔ انہوں نے بہت سی چیزیں خریدی تھیں، اور انہیں اپنے ڈوری کے تھیلے میں بھر کے لائی تھیں۔ وہ تھیلا ہاتھ میں لیے لیے تھک گئی تھیں۔ انہوں نے ٹھنڈا سا سانس لے کر باورچی خانے کا دروازہ

بند کر دیا، اور فوراً کام میں لگ گئیں۔ ان کا مزاج چڑچڑا ہو رہا تھا، اور وہ لڑنے کو تیار بیٹھی تھیں۔

"کیوں، اوٹو، یہ چولھا کیسے ٹھنڈا ہو گیا! میں نے تاکید کر دی تھی کہ دیکھو، اس پہ نظر رکھنا! اس گھر میں اتنا بھی تو نہیں کہ کوئی میری ذرا سی مدد ہی کر دے!"

"بڑا افسوس ہے، اماں۔" اوٹو نے کہا۔ "میں بھول گیا تھا۔"

"ہاں، بھول تو گیا ہی تھا! تجھے کوئی بات بھی یاد رہتی ہے؟ بھول گیا!" فراؤ نوواک چیخنے لگیں۔ اُن کا چہرہ سکڑ کر غیظ و غضب کا ایک خوفناک نقطہ بن گیا۔ "میں تو تم لوگوں کے لیے محنت کرتے کرتے قبر میں جا پہنچی اور مجھے یہ انعام مل رہا ہے۔ جب میں مر جاؤں گی تو دیکھ لینا تیرے باپ تجھے گھر سے نکال دیں گے۔ جب پتہ چلے گا! پہاڑ کا پہاڑ ہو گیا اور کاہلی کا یہ حال ہے! دُور ہو جا میرے سامنے سے۔ کچھ سُنا تو نے؟ دور ہو جا میرے سامنے سے!"

"اچھی بات ہے۔ کرسٹوفر، سنا تم نے کیا کہہ رہی ہیں؟" اوٹو میری طرف مڑا، اُس کا چہرہ غصّے کے مارے پھڑک رہا تھا۔ اس وقت ان دونوں کی شکلوں میں اتنی مشابہت تھی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ دونوں بالکل ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ان کے سر بھوت آ گیا ہو۔ "انہیں عمر بھر اپنی باتوں پر افسوس کرنا پڑے گا!"

وہ مڑا اور جلدی سے اندر والے کمرے میں چلا گیا۔ اور ٹوٹا پھوٹا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ فراؤ نوواک فوراً چولھے کی طرف مڑ گئیں اور راکھ نکالنے لگیں۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہی تھیں اور انہیں بڑے زور کی کھانسی اٹھ رہی تھی۔ میں اُن کی مدد کرنے لگا اور لکڑیاں اور کوئلے اٹھا اٹھا کر انہیں پکڑانے لگا۔ وہ انہیں اندھوں کی

پکڑتی رہیں، نہ میری طرف دیکھا نہ کچھ کہا۔ اپنے معمول کے مطابق میں نے بھی محسوس کیا کہ میں مخل ہو رہا ہوں۔ چنانچہ میں بیٹھنے کے کمرے میں چلا گیا اور احمقوں کی طرح کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ میرا جی چاہنے لگا کہ یکایک غائب ہو جاؤں۔ میں دنیا سے بیزار ہو چکا تھا۔ کھڑکی کی دہلیز پر پنسل کا چھوٹا سا ٹکڑا پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور یہ سوچتے ہوئے لکڑی پہ ایک چھوٹا سا دائرہ کھینچ دیا کہ میں اپنی نشانی چھوڑے جا رہا ہوں۔ پھر مجھے یاد آیا کہ کئی سال ہوئے شمالی ویلز میں ایک بورڈنگ ہاؤس کو چھوڑتے ہوئے میں نے یہی حرکت کی تھی۔ اندر والے کمرے میں بالکل خاموشی طاری تھی۔ میں نے اوڈو کی آزردگی کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ابھی مجھے اپنے سوٹ کیس ٹھیک کرنے تھے۔

جب میں نے دروازہ کھولا تو اوڈو اپنے بستر پہ بیٹھا تھا۔ اُس کی بائیں کلائی میں ایک زخم تھا جس میں سے خون بہہ بہہ کر اُس کی ہتھیلی پر آ رہا تھا اور بڑے بڑے قطرے فرش پر ٹپک رہے تھے۔ وہ اُس زخم کی طرف اس طرح گھور رہا تھا جیسے کسی نے ہپنوٹزم کر دیا ہو۔ اپنے داہنے ہاتھ میں اُنگلی اور انگوٹھے کے درمیان اُس نے ایک بلیڈ لے رکھا تھا۔ جب میں نے بلیڈ اُس سے چھینا تو اُس نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ زخم کچھ ایسا گہرا نہیں تھا۔ میں نے اُس کا رومال لے کر زخم پر پٹی باندھ دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اوڈو کو ایک لمحے کے لیے غش سا آ گیا، اور وہ میرے کندھے سے لگ کر بیٹھ گیا۔

"یہ تم نے کیا حرکت کی؟"

"میں انہیں دکھانا چاہتا تھا۔" اوڈو نے کہا۔ وہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ غالباً

اُس نے اپنے آپ کو بہت زیادہ ڈرا دیا تھا۔ "مجھے روکنا نہیں چاہیئے تھا تمہیں کرسٹوف"

"بے وقوف۔" میں نے بگڑتے ہوئے کہا، کیونکہ اُس نے مجھے بھی ڈرا دیا تھا۔ "اب کے تم غلطی سے ضرور کہیں چوٹ مار لوگے۔"

اوٹو نے میری طرف بڑی لمبی اور طعن آمیز نظر سے دیکھا۔ آہستہ آہستہ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"اس سے کیا ہوتا ہے کرسٹوف؟ میں ہوں ہی کس کام کا.... جب میں بڑا ہو جاؤنگا تو میرا کیا بنے گا؟"

"تمہیں کام مل جائے گا۔"

"کام .... " یہ خیال آتے ہی اوٹو پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ زور زور سے ہچکیاں لیتے ہوئے اُس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے ناک پونچھ ڈالی۔

میں نے اپنی جیب سے رومال نکالا۔ "لو، یہ لے لو۔"

"شکریہ، کرسٹوف ....." اُس نے بڑے غمناک انداز میں اپنی آنکھیں پونچھیں اور ناک صاف کی۔ پھر رومال میں کوئی چیز اُسے ایسی دکھائی دی کہ وہ اُس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پہلے تو بے دلی سے، اور پھر بہت دلچسپی کے ساتھ

ہیں، کرسٹوف!" وہ خفا ہو کے بولا۔ "یہ تو میرا ہے!"

کرسمس کے چند ایک دن بعد ایک روز تیسرے پہر کو میں واسر ٹور اسٹر سے گیا۔ جب میں محراب دار دروازے میں داخل ہوا تو چراغ جل چکے تھے۔ اس لمبی چوڑی نم آلود سڑک پر جگہ جگہ میلے کچیلے برف کے پیوند سے لگے ہوئے تھے۔ کوٹھڑیوں میں جو دکانیں تھیں اُن سے روشنی کی زرد اور کمزور شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ایک اپاہج ہاتھ سے ڈھکیلنے والی

گاڑی لئے گیس کی روشنی میں ترکاریاں اور پھل بیچ رہا تھا۔ ایک دروازے کے سامنے دو لڑکے لڑ رہے تھے، اور اُن کے چاروں طرف انگھڑ اور مضمحل چہروں والے بچّوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگا ہوا تھا۔ جب اُن میں سے ایک لڑکا ٹھوکر کھا کر گر پڑا تو کسی لڑکی کے زور سے چلّانے کی آواز آئی۔ جب میں کیچڑ سے بھرے ہوئے صحن کو پار کر رہا تھا، اور ان مکانوں کی نم آلود اور سڑی ہوئی سی مانوس بُو سونگھ رہا تھا تو میں نے سوچا کہ میں کیسا واقعی کبھی یہاں رہا ہوں؟ اب میں ویسٹ اینڈ میں ایک بڑے آرام دہ کمرے میں رہتا تھا، اور میری نئی ملازمت بڑی عمدہ تھی۔ یہ خستہ حال مکانات اب میرے لئے بالکل اجنبی بن چکے تھے۔

نوواک لوگوں کے زینے کی مشینیں خراب تھیں۔ چنانچہ وہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن مجھے زیادہ دقّت نہیں ہوئی، اور میں راستہ ٹٹولتا ہوا اوپر جا پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے جتنا بھی ممکن ہو سکا خوب شور مچایا، کیونکہ چیخنے، ہنسنے اور گانے کی آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اندر دعوت ہو رہی ہے۔

"کون ہے؟" ہر نوواک نے پکارا۔

"کرسٹوف۔"

"اہا! کرسٹوف! آنگلے! انگریز! اندر آجاؤ! آجاؤ!"

آخر دروازہ کھلا۔ ہر نوواک مجھ سے بغلگیر ہونے کے لئے بازو پھیلائے لڑکھڑاتے ہوئے دہلیز پر پہنچے۔ اُن کے پیچھے گریٹے کھڑی تھی، اور ہنسی کے مارے تھرتھرا رہی تھی اور اُس کے گالوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ ان دو آدمیوں کے علاوہ اور کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

"اخاہ، کرسٹوف!" ہرنوواک نے میری کمر تھپکتے ہوئے کہا۔ "میں گریٹے سے کہا کرتا تھا کہ میں جانتا ہوں وہ ضرور آئے گا! کرسٹوف ہم سے بے وفائی نہیں کر سکتا!" ایک عجیب مزاحیہ انداز سے میرا خیر مقدم کرتے ہوئے انہوں نے مجھے کمرے میں دھکیل دیا۔ کمرہ بے انتہا گندا ہو رہا تھا۔ مختلف قسم کے کپڑے ایک پلنگ پر الّم غلّم پڑے تھے۔ دوسرے پلنگ پر پیالیاں، طشتریاں، جوتے، چاقو اور چھریاں بکھری ہوئی تھیں۔ الماری پر ایک کڑھائی رکھی تھی جس میں سوکھی چربی تھی۔ کمرے میں تین موم بتیاں روشن تھیں جو شراب کی خالی بوتلوں میں لگی ہوئی تھیں۔

"بجلی کٹ گئی ہے۔" ہرنوواک نے بے پروائی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "بل ادا نہیں ہوا تھا..... کبھی نہ کبھی تو دینا ہی پڑے گا۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ یوں بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ آؤ گریٹے کرسمس والے پیڑ پہ روشنی کر دیں۔"

میں نے کرسمس کا اتنا چھوٹا پیڑ کبھی نہیں دیکھا۔ یہ پیڑ اتنا چھوٹا اور کمزور تھا کہ اس کے اوپر صرف ایک موم بتی لگ سکتی تھی۔ گوٹے کا صرف ایک تار اس کے چاروں طرف بندھا ہوا تھا۔ ہرنوواک نے کئی جلتی ہوئی دیاسلائیاں فرش پر پھینکیں، تب جا کے کہیں موم بتی روشن ہوئی۔ اگر میں دیاسلائیوں پہ پیر نہ رکھ دیتا تو میز پوش میں آگ لگ جاتی۔

"بّار اور اوٹو کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ کہیں ہونگے..... آج کل وہ زیادہ نہیں رہتے۔ یہ جگہ انہیں کچھ پسند نہیں آتی..... خیر، کوئی بات نہیں ہے۔ ہم اکیلے ہی خوش ہیں۔ کیوں گریٹے؟" ہرنوواک نے ناچنے کے لئے دو چار لمبے لمبے ڈگ بھرے اور گانا شروع کر دیا۔

"آؤ کرسٹوف، سب مل کے گائیں!"

گانا ختم ہو گیا تو میں نے اپنے تحفے نکالے ـــــ ہر نوواک کے لیے سگار، گریٹے کے لیے چاکلیٹ اور کل دار چوہا۔ ہر نوواک نے پلنگ کے نیچے سے بیئر کی بوتل باہر نکالی۔ پھر وہ بہت دیر تک اپنی عینک تلاش کرتے رہے، جو آخر باورچی خانے میں پانی کے نل پہ ٹنگی ہوئی ملی۔ عینک مل گئی تو انہوں نے فراؤ نوواک کا ایک خط پڑھ کے سنایا جو انہوں نے مینے ٹوریم سے لکھا تھا۔ وہ ہر جملے کو تین تین بار چار دفعہ دہراتے تھے، پھر بیچ میں گڑبڑا کے گالیاں بکنے لگتے تھے، ناک صاف کرتے تھے اور کان سے میل نکالنے لگتے تھے۔ میں ایک لفظ نہ سمجھ سکا۔ پھر انہوں نے اور گریٹے نے کل دار چوہے سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اُسے میز پہ دوڑاتے اور جب وہ کنارے کے پاس پہنچ جاتا تو خوب چیخیں مارتے اور دہاڑتے۔ چوہے کا تحفہ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ میں نے رخصت کی اجازت بڑے مختصر لفظوں میں حاصل کر لی اور زیادہ حیل و حجت کی ضرورت نہیں پڑی۔ "خدا حافظ، کرسٹوف۔ جلدی آنا۔" ہر نوواک نے کہا، اور فوراً میز کی طرف مڑ گئے۔ جب میں کوٹھڑی سے باہر نکلا تو وہ اور گریٹے جواریوں کی سی بیتابی سے چوہے کے اُوپر جھکے ہوئے تھے۔

اس کے تھوڑے ہی دن بعد اوٹو مجھ سے ملنے آیا۔ وہ مجھ سے پوچھنے آیا تھا کہ اگلے اتوار کو میں اس کے ساتھ فراؤ نوواک کو دیکھنے چلوں گا یا نہیں۔ سینے ٹوریم میں ہر مہینے ملاقات کا ایک دن مقرر تھا۔ اُس دن خاص طور سے بس جاتی تھی۔

"تمہیں میرا کرایہ نہیں دینا پڑے گا،" اوٹو نے بڑی شان سے کہا۔ اُسے اتنی خود اطمینانی تھی کہ اُس کا چہرہ کچھ چمک سا رہا تھا۔

"یہ تو بڑی عنایت ہوگی تمہاری،" اوٹو..... نیا سوٹ ہے؟"

"تمہیں پسند آیا؟"

"بہت قیمتی معلوم ہوتا ہے۔"

"ڈھائی سو مارک کا۔"

"اُفوہ! کیا کہیں سے لاٹری مل گئی؟"

اوٹو احمقوں کی طرح ہنس پڑا۔ "آجکل میں نے ٹروڈے سے بہت میل جول بڑھا رکھا ہے۔ اُس کا چچا اُسے کچھ روپیہ چھوڑ مرا ہے۔ شاید بہار کے موسم میں ہماری شادی ہو جائے گی۔"

"مبارک ہو..... ویسے تو شاید گھر ہی رہتے ہو؟"

"کبھی کبھی جھانک آتا ہوں۔" ایک مضمحل سی ناپسندیدگی ظاہر کرنے کے لئے اوٹو نے اپنے ہونٹوں کے کونے نیچے کو کھینچ لئے، اور مسکرا سا دیا۔ "لیکن ابا ہمیشہ نشے میں دھت رہتے ہیں۔"

"بہت ہی نفرت کے قابل بات ہے۔ کیوں ہے نا؟" میں نے اُس کے لہجے کی نقل اُتاری۔ ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"افوہ، کرسٹوف، اتنی دیر ہو گئی؟ اب مجھے چلنا چاہیئے..... تو پھر اتوار کو ملاقات ہو گی۔ دیکھو وعدہ کر چکے ہو۔"

ہم دوپہر کے قریب سینے ٹوریم پہنچے۔

وہاں ایک اونچی نیچی سی پکی سڑک کئی میل برف پوش جنگلوں میں سے گزرتی اور سانپ کی طرح بل کھاتی جاتی تھی۔ پھر یکایک ایک گوتھک قسم کا بنا ہوا پھاٹک آتا تھا جیسے کسی

قبرستان کا دروازہ۔ اس کے پیچھے بڑی بڑی لال عمارتیں نظر آتی تھیں۔ بس رک گئی میں اور اودلو سب سے آخر میں اُترے۔ ہم کھڑے ہو کے انگڑائیاں لینے لگے اور چمکدار برف سے ہماری آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہونے لگی۔ یہاں دیہات میں ہر چیز اتنی سفید تھی کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ ہمارا سارا بدن اکڑ گیا تھا، کیونکہ یہ بس در اصل چھت دار ٹھیلا تھا جس میں نشستوں کے بجائے چیڑ کے بکس اور اسکول کی بینچیں رکھی تھیں اس سفر میں نشستیں ذرا بھی نہیں ہلی جلی تھیں، کیونکہ ہم لوگ اس طرح ٹھنسے ہوئے تھے جیسے الماری میں کتابیں۔

اب مریض ہم لوگوں سے ملنے دوڑتے ہوئے آئے۔ یہ لوگ دوشالوں اور کمبلوں میں لپٹے ہوئے تھے اور عجیب بے ڈھنگے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ راستے کے کچلے ہوئے برف پر لڑکھڑاتے اور پھسلتے ہوئے آ رہے تھے۔ انہیں اتنی جلدی تھی کہ اپنی یورش کی جھونک میں وہ بالکل ہی پھسل پڑے، اور سیدھے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے بازوؤں سے جا کے ٹکرائے۔ اس تصادم کے زور سے یہ لوگ بھی لڑکھڑا گئے۔ ایک جوڑا تو بالکل لڑھک بھی گیا۔ یہ تماشا دیکھ کر مجمع نے ایک قہقہہ لگایا۔

"اودلو!"

"اماں!"

"واقعی تم آ گئے! تم بڑے تندرست معلوم ہو رہے ہو!"

"ہاں، آ ہی گئے اماں! تم اور کیا سمجھتی تھیں؟"

فراؤ نوواک نے اپنے آپ کو اودلو سے چھڑایا اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "آپ کا مزاج کیسا ہے، ہیر کرسٹوف۔"

اُن کی عمر کئی سال کم معلوم ہو رہی تھی۔ اُن کا ہشاش بشاش اور تھوڑا سا مکّار، پھُولا پھالا، گول اور معصوم چہرہ اپنی چھوٹی چھوٹی دلکش آنکھوں سمیت کسی نوجوان لڑکی کا سا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ اُن کے گالوں پر جگہ جگہ سرخی دمک رہی تھی۔ وہ اس طرح مسکرائے چلی جا رہی تھیں جیسے کبھی رُکیں گی ہی نہیں۔

"مِسٹر کرسٹوف، آپ نے بڑی عنایت کی جو یہاں تک آئے۔ اور آپ کی یہ بھی بڑی مہربانی ہے کہ اوٹو کو بھی مجھ سے ملانے لے آئے!"

وہ ایک بڑی عجیب و غریب مختصر سی مجنونانہ آواز میں ہنسیں۔ ہم لوگ دو چار سیڑھیاں طے کر کے مکان میں پہنچے وہاں پہنچ کے ایک صاف شفّاف، گرم اور دوائیوں سے دُھلی ہوئی عمارت کی بُو میری ناک میں آئی، اور مجھے ایک ہلکا سا خوف محسوس ہوا۔

"میں ایک چھوٹے وارڈ میں ہوں۔" فراؤ نوواک نے ہمیں بتایا۔ "وہاں ہم کل ملا کے چار آدمی ہیں۔ ہم لوگ طرح طرح کے کھیل کھیلتے ہیں۔" اُنھوں نے بڑے فخر کے ساتھ دروازہ کھولا، اور تعارف کرایا۔ "یہ موٹخن ہیں۔ ہم سب کو قاعدے میں رکھتی ہیں! اور یہ ایرنا ہیں۔ اور یہ ایریکا ہے ــــ ہماری بچّی!"

ایریکا اٹھارہ سال کی سُوکھی ہوئی سی خوش رنگ لڑکی تھی۔ وہ کھی کھی کھی ہنسنے لگی۔ "اچھا تو یہ ہیں مشہور و معروف اوٹو! ہمیں تو کتنے ہفتے سے ان سے ملنے کا انتظار ہے!"

اوٹو بڑے محتاط اور دقیقہ رس انداز سے مسکرایا۔ وہ اپنے آپ سے بہت مطمئن تھا۔ اُس کا بادامی رنگ کا نیا سوٹ اتنا مبتذل تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اُس کے نیلے موزے اور نوک دار زرد جُوتے بھی۔ اُس کی انگلی میں ایک بہت بڑی انگوٹھی تھی جس میں چاکلیٹی رنگ کا چوکور پتھر لگا ہوا تھا۔ اوٹو کو اس کا بڑا احساس تھا،

اور وہ بار بار بہت بن بن کے اپنا ہاتھ اس طرح رکھتا تھا کہ بڑا خوبصورت معلوم ہو، اور کنکھیوں سے داد بھی دیتا جاتا تھا۔ فراؤ نوواک اُسے ایک لمحے کے لیے نہ چھوڑ رہی تھیں۔ کبھی اُسے گلے لگاتی تھیں، کبھی اُس کے گالوں پہ چٹکیاں لیتی تھیں۔

"اچھا لگ رہا ہے نا!" انہوں نے گرمجوشی سے کہا۔ "شاندار معلوم ہوتا ہے! اوٹو، تو تو بہت بڑا اور مضبوط ہو گیا، اب تو تو مجھے ایک ہاتھ سے اٹھا لے گا!" ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ بڈھی موٹخن کو نزلہ ہے۔ اُس کے پرانے فیشن کے سیاہ لباس کے اونچے سے کالر کے نیچے گردن میں کس کے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بڑی اچھی بڑھیا معلوم ہوتی تھی، مگر ساتھ ہی کچھ گندی سی بھی لگتی تھی، جیسے کوئی خارشی بڈھا کتا۔ وہ بستر کے کنارے پر اپنے پاس میز پر اپنے بچوں اور پوتے پوتیوں کی تصویریں رکھے بیٹھی تھی جیسے یہ اُس کے حاصل کیے ہوئے انعام ہوں۔ وہ کافی خوش معلوم ہوتی تھی، جیسے اپنے بیمار ہونے پر اُسے مسرت ہو۔ فراؤ نوواک نے ہمیں بتایا کہ موٹخن اس سینے ٹوریم میں تین دفعہ رہ چکی تھی۔ ہر دفعہ وہ اچھی ہو کے واپس چلی جاتی تھی لیکن نو مہینے یا سال بھر میں اُس کی بیماری پھر عود کر آتی تھی، اور اُسے دوبارہ یہیں بھیج دیا جاتا تھا۔

"جرمنی کے کئی بہترین ڈاکٹر اِنہیں دیکھنے آئے ہیں۔" فراؤ نوواک نے فخریہ کہا۔ "لیکن تم نے اُنہیں ہر دفعہ بے وقوف بنایا ہے، موٹخن، بنایا ہے نا؟"

بڑھیا نے کچھ اس طرح مسکراتے ہوئے سر ہلایا جیسے کوئی ہوشیار بچہ جس کے بزرگ اُس کی تعریف کر رہے ہوں۔

"اور ایرنا یہاں دوسری دفعہ آئی ہیں۔" فراؤ نوواک بتاتی رہیں۔ "ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ اب تم بالکل ٹھیک ہو گئیں، لیکن انہیں اچھی طرح کھانے کو نہیں ملا۔ چنانچہ

یہ اب پھر ہمارے پاس واپس آگئی ہیں۔ ہے نا یہی بات' ایرنا؟"

"ہاں، واپس آگئی ہوں۔" ایرنا نے تائید کی۔

اُس میں بس ہڈیاں ہی ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔ اُس کی عمر پینتیس سال کی تھی اور بال کٹے ہوئے تھے۔ ایک زمانے میں وہ بڑی نرم و نازک، دلکش، افسردہ افسردہ اور نسائیت سے لبریز ہوگی۔ اب تو وہ گھُل کے کانٹا رہ گئی تھی، اور معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے کوئی بہت ہی مایوسانہ فیصلہ کر لیا ہے اور اس کے اندر سرکشی کی روح بھری ہوتی ہے۔ اُس کی آنکھیں سیاہ، بڑی بڑی اور بھوکی سی تھیں۔ اُس کی سوکھی ہوئی اُنگلی میں شادی کی انگوٹھی بہت ڈھیلی تھی۔ جب وہ بولتی اور اُسے جوش آجاتا تو اُس کے ہاتھ بالکل بے معنی انداز سے جلدی جلدی حرکت کرنے لگتے جیسے دو سکڑے ہوئے کیڑے۔

"میرے خاوند نے مجھے بُری طرح پیٹا اور پھر بھاگ گیا۔ جس رات کو گیا ہے اُس نے مجھے اتنی بے دردی سے پیٹا کہ میرے کئی مہینے تک نیل پڑے رہے۔ وہ بڑا طاقتور آدمی تھا۔ اُس نے تو مجھے تقریباً مار ہی ڈالا تھا۔" وہ بڑے سکون کے ساتھ اور بڑے سوچ سمجھ کر بول رہی تھی، لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے جوش کو دبا رہی ہے۔ اُس کی آنکھیں میرے چہرے سے بالکل نہیں ہٹ رہی تھیں۔ اُس کی بھوکی بھوکی نظر میرے دماغ میں گھُستی جا رہی تھی، اور بڑی بے تابی سے میرے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "اب وہ مجھے کبھی کبھی خواب میں بھی نظر آتا ہے۔" اُس نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے اس بات پہ ہنسی آ رہی ہو۔

اوٹو اور میں میز پہ بیٹھ گئے، اور فراؤ نوواک کافی اور کیک لیئے ہمارے

چاروں طرف پھرنے لگیں — یہ چیزیں ایک نرس لائی تھی۔ آج میں جتنی باتیں دیکھ رہا تھا میرے اُوپر کسی کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میرے حواسِ خمسہ بالکل منتشر اور معطل ہو رہے تھے۔ مجھے بس یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی واضح اور روشن خواب دیکھ رہا ہوں۔ اُس پرسکون اور سفید کمرے میں جس کی بڑی بڑی کھڑکیوں سے برف سے ڈھکا ہوا خاموش جنگل نظر آتا تھا، جہاں میز پر کرسمس کا پیڑ رکھا تھا، پلنگوں پہ کاغذ کی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں، کیلوں سے تصویریں گڑی ہوئی تھیں۔ دل کی شکل کے بسکٹوں کی رکابی تھی — اس کمرے میں یہ چار عورتیں چل پھر رہی تھیں میری آنکھیں اُن کی دنیا کے ہر کونے کا جائزہ لے سکتی تھیں — درجۂ حرارت کے نقشوں، آگ بجھانے کے آلے، دروازے پر پڑے ہوئے چمڑے کے پردے، غرض ہر چیز کا اب ان عورتوں کے نہ تو سوئی چبھتی تھی اور نہ فرش دھونے سے ہاتھوں میں گھٹے پڑتے تھے۔ چنانچہ اُن کے ہاتھ بالکل صاف ستھرے رہتے تھے، اور وہ روزانہ اپنے بہترین کپڑے پہن کے برآمدے میں لیٹ جاتی تھیں اور ریڈیو سنتی رہتی تھیں اُنہیں بات چیت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کمرے میں ان عورتوں کے اکٹھے بند رہنے سے کچھ ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی جس سے متلی سی آتی تھی جیسے میلے کپڑے الماری میں بند رہے ہوں اور ہوا نہ لگی ہو۔ وہ آپس میں بڑی شرارتیں کرتی تھیں اور زور زور سے چیختی تھیں جیسے بڑی عمر کی اسکول میں پڑھنے والی لڑکیاں۔ فراؤلوواک اور ایریکا یکایک چپکے چپکے ایک دوسرے کو ستانے لگتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے کپڑے نوچتیں، چپکے چپکے ہاتھا پائی کرتیں۔ اور زور زور سے قہقہے لگانے لگتیں جیسے زبردستی ہنس رہی ہوں۔ یہ سب ہمارے سامنے بن رہی تھیں۔

"کیا بتائیں ہمیں آج کے دن کا کیسا انتظار تھا۔" ایرنا نے مجھ سے کہا۔ "یہاں تو کوئی جیتا جاگتا مرد نظر ہی نہیں آتا!"

فراؤ نوواک کھی کھی کھی کھی ہنسنے لگیں۔

"جب تک ایریکا یہاں نہیں آئی تھی، بچاری بڑی معصوم لڑکی تھی ..... تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا ایریکا۔ یہی بات ہے نا؟"

ایریکا دانت نکال کے ہنس دی۔

"جب سے تو مجھے بہت باتیں معلوم ہوگئی ہیں....."

"ہاں، ضرور ہوگئی ہوں گی! آپ کو یقین نہیں آئے گا، ہر کرسٹوف ـــــ اس کی خالہ نے یہ چھوٹا سا گڈا کرسمس کے موقع پر بھیجا تھا، اور اب وہ اسے ہر روز رات کو اپنے ساتھ بستر پہ لے کے لیٹتی ہے۔ کہتی ہے کہ مجھے بستر میں کوئی مرد چاہیئے!"

ایریکا بڑی دلیری سے ہنسنے لگی۔ "کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہی ہے۔"

اُس نے اوٹو کی طرف آنکھ ماری۔ وہ اپنی آنکھیں گول گول گھمانے لگا، اور یہ دکھانے کی کوشش کرنے لگا کہ اُسے ایسی بات سُن کر بڑا تعجب ہوا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد فراؤ نوواک کو گھنٹہ بھر آرام کرنا تھا۔ چنانچہ ایرنا اور ایریکا نے ہمیں قبضا لیا اور ٹہلانے کے لئے میدان میں لے گئیں۔

"پہلے ہم انہیں قبرستان دکھائیں گے۔" ایرنا نے کہا۔

سینے ٹوریم کے لوگوں کے جو پالتو جانور مر گئے تھے یہ قبرستان اُن کے لئے تھا۔ یہاں کوئی درجن بھر قبر کے پتھر اور صلیبیں لگی ہوئی تھیں۔ جن پر نیم سنجیدہ اور نیم مزاحیہ انداز میں

چھوٹے چھوٹے کتبے لکھے ہوئے تھے۔ وہاں چڑیاں، سفید چوہے اور خرگوش دفن تھے، اور ایک چمگادڑ بھی جو طوفان کے بعد ٹھٹھری ہوئی ملی تھی۔

"یہ سوچ کے بڑا رنج ہوتا ہے کہ بیچارے زمین میں دفن ہیں۔" ایرنا نے کہا۔ اُس نے ایک قبر پر سے برف جھاڑ کے ہٹایا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

لیکن جب ہم پگڈنڈی پر جا رہے تھے تو وہ اور ایریکا دونوں بڑی خوش تھیں۔ ہم لوگ قہقہے لگا رہے تھے اور ایک دوسرے کے برف کے گولے مار رہے تھے۔ اوٹو نے ایریکا کو اُٹھا لیا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ اُسے برف کے دریا میں پھینکنے والا ہے۔ آگے چل کر ہم ایک چھوٹے سے کھلے ہوئے بنگلے کے پاس سے گزرے، جو راستے سے کچھ ہٹ کر درختوں کے درمیان ایک ٹیلے پر بنا ہوا تھا۔ ایک مرد اور ایک عورت بنگلے سے باہر نکل رہے تھے۔

"یہ فراؤ کلیمکے ہے۔" ایرنا نے مجھے بتایا۔ "آج اُس کا شوہر آیا ہے۔ ذرا سوچو تو اس سارے میدان میں یہ جھونپڑی ہی ایک جگہ ہے جہاں دو آدمی تخلیے میں باتیں کر سکتے ہیں۔"

"اس موسم میں تو وہاں بڑی سردی ہوتی ہوگی۔"

"ہاں، سردی تو ہوتی ہی ہے! کل اُس کا بخار پھر بڑھ جائے گا اور اُسے پندرہ دن تک بستر پہ لیٹا رہنا پڑے گا... لیکن اس کی پروا کسے ہے! میں اُس کی جگہ ہوتی تو میں بھی کرتی۔" ایرنا نے میرا بازو دبایا۔ "جب تک جوان ہیں اُس وقت تک تو یہ باتیں ہیں ہی، ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں، بالکل ٹھیک ہے!"

ایرنا نے جلدی سے سر اُٹھا کے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں میری آنکھوں میں پیوست ہو کے رہ گئیں۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آنکھیں مجھے

نیچے کھینچ رہی ہیں۔

"دراصل مجھے تپِ دق نہیں ہے، سمجھے کرسٹوف..... کہیں تم یہ تو نہیں سمجھے کہ یہ یہاں رہتی ہے اس سے اسے ضرور تپِ دق ہوگی؟"

"نہیں، ایرنا، میں نے یہ بالکل نہیں سوچا۔"

"یہاں بہت سی لڑکیوں کو دق نہیں ہے۔ میری طرح بس انہیں تھوڑی سی خبرگیری کی ضرورت ہے.... ڈاکٹر کہتا ہے کہ اگر میں احتیاط برتوں تو ایسی ہی مضبوط ہو جاؤں گی جیسی پہلے تھی.... جب مجھے یہاں سے جانے کی اجازت مل جائے گی، تو بتاؤ میں سب سے پہلا کام کیا کروں گی؟"

"کیا؟"

"پہلے تو میں طلاق لوں گی، اور پھر کچھ اور ڈھونڈوں گی۔" ایرنا کچھ تلخ سی فتحمندی کے ساتھ ہنسنے لگی۔ "اس میں مجھے زیادہ دن نہیں لگیں گے ــــ یقین جانو!"

چار کے بعد ہم وارڈ کے کوٹھے پر جا بیٹھے۔ فراؤ نوواک کسی سے گراموفون مانگ لائی تھیں، تاکہ ہم ناچ سکیں۔ میں ایرنا کے ساتھ ناچا اور ایریکا اوٹو کے ساتھ۔ ایریکا بڑے بے ڈھنگے پن سے ناچ رہی تھی، اور کچھ سڑ ڈنگی سی معلوم ہوتی تھی۔ جب اُس کا پیر پھسل جاتا، یا اوٹو کی اُنگلیاں اُس کے جوتوں سے کچل جاتیں تو وہ قہقہہ مار کے ہنس پڑتی۔ اوٹو بڑے ملائم انداز سے مسکرا رہا تھا۔ اُس کے کندھے بڑے فیشن ایبل طریقے سے چمپانزی بندر کی طرح جھکے ہوئے تھے، اور وہ بڑی چابکدستی سے ایریکا کو آگے پیچھے لے جا رہا تھا۔ بڈھی موٹخن اپنے بستر پہ بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ جب میں ایرنا کو اپنے بازوؤں

میں لیتا تو میں دیکھتا کہ اُسے جھرجھری آ گئی ہے۔ اب اندھیرا ہو چلا تھا، لیکن کسی نے بجلی جلانے کو نہیں کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے ناچنا بند کر دیا، اور بستروں پر ایک حلقے میں بیٹھ گئے، فراؤ نوواک نے اپنے بچپن کے زمانے کی باتیں شروع کر دیں جب وہ اپنے والدین کے ساتھ مشرقی پرُوشا میں کھیت پر رہتی تھیں۔ "ہمارے پاس ایک لکڑی چیرنے کی مشین تھی۔" انہوں نے ہمیں بتایا۔ "اور تیس گھوڑے تھے۔ میرے والد کے گھوڑے اس ضلعے میں سب سے عمدہ تھے۔ اُن کے گھوڑوں کو نمائش میں کئی دفعہ انعام ملا.....۔" اب وارڈ میں بالکل اندھیرا چھا گیا تھا۔ اندھیرے میں کھڑکیاں بڑے بڑے زرد مستطیل معلوم ہوتی تھیں۔ ایرنا پلنگ پر میرے پاس بیٹھی تھی۔ اُس نے ٹٹول کے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دبایا۔ پھر اُس نے میرے پیچھے ہاتھ ڈالا اور میرا بازو اپنے جسم کے گرد کھینچ لیا۔ وہ بہت شدت سے کانپ رہی تھی۔ "کرسٹوف....." اُس نے میرے کان میں کہا۔

".....اور گرمیوں کے زمانے میں،" فراؤ نوواک کہہ رہی تھیں، "ہم دریا کے کنارے بڑی سی ناج کی کوٹھڑی میں ناچنے جایا کرتے تھے....."

میرا منہ ایرنا کے گرم اور خشک ہونٹوں کو دبانے لگا۔ مجھے لمس کا کوئی خاص احساس نہیں ہوا۔ یہ بھی اُس لمبے چوڑے پُراسرار رمزیہ خواب کا ایک حصہ تھا جو میں سارا دن دیکھتا رہا تھا۔ "آج شام میں بے انتہا خوش ہوں....." ایرنا نے کان میں کہا۔

"پوسٹ ماسٹر کا لڑکا سارنگی بجایا کرتا تھا۔" فراؤ نوواک نے کہا۔ "وہ بڑی عمدہ سارنگی بجاتا تھا..... بس رونے کو جی چاہنے لگتا تھا۔"

جس پلنگ پہ ایریکا اور ہاوتو بیٹھے تھے۔ وہاں سے کچھ ہانپنا پائی اور کبھی کبھی ہنسنے

کی آواز آئی۔ "اوتو، تم بڑے شریر ہو..... تمہاری باتیں دیکھ کے مجھے بڑا تعجب ہوتا ہے! میں تمہاری اماں سے کہہ دوں گی!"

پانچ منٹ بعد نرس نے آکے بتایا کہ بس چلنے والی ہے۔

"خدا کی قسم، کرسٹوف،" جب ہم اوورکوٹ پہن رہے تھے تو اوتو نے میرے کان میں کہا، "اس لڑکی کے ساتھ میں جو چاہتا کرسکتا تھا! میں نے اسے سارے میں چھو چھو کے دیکھا ہے..... اپنی والی کے ساتھ تم نے بھی کچھ دلگی کی یا نہیں؟ سوکھی ہوئی سی تو ہے — مگر شرط لگاتا ہوں، ہے بڑی گرما گرم!"

پھر ہم دوسرے مسافروں کے ساتھ بس میں چڑھنے لگے۔ مریض رخصت ہونے کے لئے بس کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ انہوں نے کمبل لپیٹ رکھے تھے اور ان کے سر بھی ڈھکے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جنگل میں رہنے والے کسی وحشی قبیلے کے لوگ ہیں۔

فراؤ نوواک مسکرانے کی تو بہت کوشش کر رہی تھیں مگر وہ رونے لگیں۔

"اپنے ابا سے کہہ دینا کہ میں جلدی ہی آجاؤں گی....."

"ہاں اماں، تم جلدی تو آہی جاؤ گی! تم جلدی ہی اچھی ہو جاؤ گی، اور جلدی ہی گھر پہنچ جاؤ گی۔"

"بس تھوڑے ہی دن اور رہیں....." فراؤ نوواک نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ان کی سب بے ہنگم مینڈک جیسی مسکراہٹ کے ساتھ آنسو بہتے جا رہے تھے۔ اور یکایک انہوں نے کھانسنا شروع کر دیا — معلوم ہوتا تھا کہ ان کا جسم بیچ میں سے ٹوٹا جا رہا ہے جیسے کوئی بیچ میں سے تڑی ہوئی گڑیا ہو۔ دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے ہوئے وہ

کراہتی ہوئی آواز میں کھانس رہی تھیں، جیسے کوئی بدحال اور زخمی جانور ہو۔ اُن کے سر اور کندھوں پر سے کمبل سرک گیا۔ اُن کے بندھے ہوئے بالوں میں سے ایک لٹ نکل آئی اور بار بار اُن کی آنکھوں میں گھسنے لگی — وہ اندھوں کی طرح سر ہلا ہلا کے اسے پیچھے ہٹا رہی تھیں۔ دو نرسوں نے انہیں نرمی سے پکڑ کے یہاں سے لے جانا چاہا مگر وہ فوراً بڑے جوش کے ساتھ اُن سے زور آزمائی کرنے لگیں۔ وہ اُن کے ساتھ جانے پہ راضی نہیں تھیں۔

"اندر چلی جاؤ اماں۔" اوٹو نے التجا کی۔ اُس کی آنکھوں میں خود بھی آنسو آ گئے تھے۔ "جاؤ چلی جاؤ! یہاں نزلہ ہو جائے گا!"

"مجھے کبھی کبھی خط لکھتے رہنا۔ لکھو گے نا، کرسٹوف؟" ایرنا میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی جیسے ڈوب رہی ہو۔ اُس کی آنکھیں میری طرف اوپر اٹھی ہوئی تھیں، اور بغیر کسی شرم یا لحاظ کے اُن میں ایسی شدید مایوسی جھلک رہی تھی کہ دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ "اور کچھ نہیں تو کارڈ ہی بھیج دیا کرنا، کوئی بات نہیں ہے...... بس اپنا نام لکھ دیا کرنا۔"

"ہاں ضرور بھیجوں گا....."

دھڑ دھڑاتی ہوئی بس کی بتیوں سے جو روشنی کا چھوٹا سا حلقہ بنا ہوا تھا اس میں وہ لوگ ایک لمحے کے لئے ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ صنوبر کے کالے کالے تنوں کے پس منظر کے سامنے اُن کے روشن چہرے بھوتوں کی طرح ہیبت ناک معلوم ہو رہے تھے۔ یہ میرے خواب کا عروجی نقطہ تھا۔ یہ ڈراؤنے خواب کا لمحہ تھا جہاں خواب کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ مجھے ایک عجیب مہمل سا خوف محسوس ہوا کہ یہ لوگ ہمارے اُوپر حملہ

کرنے والے ہیں، اور کمبل میں لپٹی ہوئی شکلوں کا یہ خوفناک گروہ ہمیں اپنے پنجوں سے پنجوں پر سے کھینچ لے گا اور مُردوں کی سی خاموشی کے ساتھ بھوکوں کی طرح ہمیں نیچے گھسیٹ لائے گا۔ لیکن یہ لمحہ گزر گیا۔ یہ لوگ تاریکی میں پیچھے ہٹ گئے، اور محض بھوتوں کی طرح بے ضرر ثابت ہوئے، اور ہماری بس پہیے گھماتی جھٹکا کھا کر نہ دکھائی دینے والے گہرے گہرے برف میں شہر کی طرف چل پڑی۔

لانڈاور لوگ

انتخابات کے کوئی مہینے بھر بعد اکتوبر ۱۹۳۰ئہ میں ایک رات لائپ زیگراسٹرا سے میں بڑے زور کا جھگڑا ہوگیا۔ نازی غنڈوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں یہودیوں کے خلاف مظاہرہ کرنے نکل آئیں۔ اُنھوں نے دس پانچ سیاہ بالوں اور بڑی بڑی ناک والے آدمیوں مارا پیٹا اور یہودیوں کی ساری دکانوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ ویسے تو اس واقعے میں کوئی قابلِ ذکر بات ہے نہیں، نہ کوئی آدمی مرا، نہ کچھ ایسی گولی چلی، اور یہی کوئی دو درجن آدمی گرفتار ہوئے۔ مجھے یہ واقعہ محض اس وجہ سے یاد ہے کہ برلن کی سیاسیات سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

فراؤلین میئر کو بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ "اچھا ہوا! مزا مل گیا!" اُس نے بڑے جوش سے کہا۔ "ان یہودیوں نے سارے شہر کو گندا کر رکھا ہے۔ جو پتھر اٹھاؤ، اُس کے نیچے سے دو ایک نکلے چلے آئیں گے۔ انہوں نے تو ہمارے پینے کے پانی تک میں زہر ملا دیا ہے! ہمارا گلا گھونٹے ڈال رہے ہیں، ہمیں لوٹے لے رہے ہیں، ہمارا خون چوسے جا رہے ہیں۔ کسی بڑی دکان کو دیکھ لو، ورٹ ہائم کے۔ ڈی، ڈبلو۔، لانڈاور، یہ سب دکانیں کس کی ہیں؟ انہیں چور بے ایمان یہودیوں کی!"

"لانڈاور لوگ میرے دوست ہیں۔" میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔ اور اس

سے پہلے کہ فراؤلین میئر کو کوئی مناسب جواب سوجھے، میں اٹھ کر کمرے سے چل دیا۔
یہ بات پوری طرح ٹھیک نہیں تھی۔ دراصل میں لانڈاور خاندان کے کسی آدمی سے عمر بھر میں ایک دفعہ بھی نہیں ملا تھا، لیکن میرے انگلستان سے روانہ ہونے سے پہلے ایک مشترک دوست نے اُن لوگوں کے نام ایک تعارفی خط دے دیا تھا۔ مجھے تعارفی خطوں پہ ذرا بھی یقین نہیں۔ اور اگر فراؤلین میئر یہ بات نہ کہتی تو غالباً میں اسے کبھی استعمال نہ کرتا۔ اب ضد کے مارے میں نے فوراً فراؤ لانڈاور کو خط لکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

تین دن بعد جب میں پہلی مرتبہ ناٹالیا لانڈاور سے ملا، تو دیکھا کہ وہ اٹھارہ سال کی ہے اور اسکول میں پڑھتی ہے۔ اس کے بال سیاہ اور گچھے دار تھے، اور اتنے زیادہ کہ اُس کا چمکتی ہوئی آنکھوں والا چہرہ بڑا لمبا اور پتلا معلوم ہونے لگا تھا۔ اُس کی شکل دیکھ کر مجھے جوان سی لومڑی کا خیال آتا تھا۔ اُس نے کندھے تک بازو پھیلا کر موجودہ زمانے کے طالب علموں کی طرح ہاتھ ملایا۔ "اندر آجایئے۔" اُس کی آواز میں بھرتیلا پن اور تحکم تھا۔

بیٹھنے کا کمرہ بہت بڑا اور بڑا خوشگوار تھا۔ اسے جنگ سے پہلے والے مذاق کے مطابق سجایا گیا تھا، اور آرائشی سامان کچھ ضرورت سے زیادہ تھا۔ ناٹالیا بڑی بیتابی اور شدّت سے کچھ لڑکھڑاتی ہوئی سی انگریزی میں فوراً باتیں کرنے لگی، اور مجھے گراموفون کے ریکارڈ، کتابیں اور تصویریں دکھانے لگی، لیکن مجھے کسی چیز کو ایک لمحے سے زیادہ دیکھنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

"آپ کو موتسارٹ پسند ہے؟ ہاں! اچھا، مجھے بھی بہت پسند ہے! بہت زیادہ!

.....یہ تصویر گردن پرنتس پالاسٹ کی ہے۔ آپ نے نہیں دیکھی؟ میں آپ کو کسی دن دکھاؤں گی.... آپ کو ہائینے پسند ہے؟ ٹھیک ٹھیک بتایئے۔" اُس نے کتابوں کی الماری سے نظریں ہٹا کر اُستانیوں کی سی سختی سے مسکراتے ہوئے کہا، "پڑھیے اِس کی نظمیں بڑی حسین ہیں۔"

مجھے اس گھر میں پاؤ گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ نٹالیا نے چار کتابیں الگ رکھ دیں کہ جب میں جاؤں تو اپنے ساتھ لیتا جاؤں ــــ "ٹونیو کروگر"، "جیکبسن کی کہانیاں"، اسٹیفان گیورگے کی نظمیں"، "گیٹے کے خطوط"۔ "مجھے اپنی سچی سچی رائے بتایئے گا" اُس نے مجھے تنبیہہ کی۔

یکایک ایک ملازمہ نے کمرے کے آخر میں شیشے کا پھسلنے والا دروازہ ہٹایا اور ہم فراؤ لانڈاور کے حضور میں پہنچ گئے۔ وہ ایک لمبی سی زرد رُو عورت تھی۔ اُس کے بائیں گال پہ ایک تل تھا، اور بال پیچھے کو بندھے ہوئے تھے۔ وہ کھانے کی میز کے سامنے بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھی تھی اور ایک سماوار میں سے گلاسوں میں چاء ڈال رہی تھی۔ میز پر رکابیوں میں کئی قسم کے گوشت، پنیر، گاجریں اور شراب کی بوتلیں رکھی تھیں، اور ایک رکابی میں قیمہ بھری آنت کے پتلے پتلے گیلے اور پھسلنے والے ٹکڑے تھے، جن سے کانٹا لگاتے ہی گرم پانی کی پچکاری چھوٹتی تھی۔ "آپ بیئر پئیں گے۔" نٹالیا نے اپنی ماں کو چاء کا گلاس واپس کرتے ہوئے حکم دیا۔

میں نے چاروں طرف نظر ڈالی تو دیکھا کہ دیواروں پہ الماریوں اور تصویروں سے جو تھوڑی بہت جگہ بچی ہے وہاں عجیب وغریب قسم کی قدِ آدم تصویریں، اُڑتے ہوئے بالوں والی عورتیں، یا ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہرن رنگین کاغذ کے

کاٹ کاٹ کر لگائے گئے ہیں۔ یہ تصویریں مہاگنی کے ٹھوس فرنیچر اور اس بورژوا ماحول پر عجیب مضحکہ خیز انداز میں بالکل بے اثر احتجاج کر رہی تھیں۔ مجھے بغیر بتائے پتہ چل گیا کہ یہ تصویریں ناٹالیا نے بنائی ہیں۔ ہاں، اُسی نے یہ تصویریں بنائی تھیں اور ایک دعوت کے موقعہ پر لگائی تھیں۔ اب وہ انہیں اتارنا چاہتی تھی، لیکن اُس کی ماں اُتارنے نہیں دیتی تھیں۔ اس معاملے میں ان دونوں کے درمیان تھوڑی سی بحث ہو پڑی ــــ جو غالباً اس گھر کے معمول کا ایک حصّہ تھی۔ "لیکن یہ تصویریں تو بڑی بدصورت ہیں!" ناٹالیا نے انگریزی میں چیخ کے کہا۔ "میں تو سمجھتی ہوں کہ بڑی خوبصورت ہیں۔" فراؤ لانڈاور نے منہ میں گاجریں بھرے ہوئے بڑے سکون کے ساتھ جرمن میں جواب دیا، اور اپنی رکابی سے نظریں تک نہیں ہٹائیں۔

جب ہم کھانا ختم کر چکے تو ناٹالیا نے اپنے انداز سے مجھے بتا دیا کہ مجھے فراؤ لانڈاؤ سے رسمیہ طور پر رخصت ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ہم پھر بیٹھنے کے کمرے میں آ گئے۔ وہ مجھ سے جرح کرنے لگی، آپ کا کمرہ کہاں ہے؟ آپ اس کا کیا کرایہ دیتے ہیں؟ جب میں نے اُسے کرایہ بتایا۔ تو وہ فوراً بولی کہ آپ نے بالکل غلط محلّے کا انتخاب کیا ہے (ولمرس ڈورف کہیں بہتر ہوتا) ، اور آپ تو لُٹ گئے! اسی کرائے میں آپ کو بالکل ایسا ہی مکان مل سکتا تھا، ساتھ ہی پانی کا نل بھی ہوتا اور کمرہ گرم کرنے کا انتظام بھی۔ "آپ مجھ سے کہتے۔" وہ بولی، اور یہ بالکل بھول گئی کہ ہم ایک دوسرے سے آج ہی شام پہلی مرتبہ ملے تھے۔ "میں آپ کو ڈھونڈ دیتی۔"

"آپ کے دوست نے لکھا ہے کہ آپ ادیب ہیں؟" ناٹالیا نے یکایک مجھے للکارا۔

"نہیں، اصلی ادیب تو نہیں ہوں۔" میں نے احتجاج کیا۔
"لیکن آپ نے کتاب تو لکھی ہے؟"
میں نے اعتراف کیا "ہاں، لکھی تو ہے۔"
ناٹا لیا جیت گئی۔ "آپ نے کتاب لکھی ہے اور کہتے ہیں میں ادیب نہیں ہوں۔ معلوم ہوتا ہے آپ پاگل ہیں۔"
مجھے اپنے ناول "سارے سازشی" کی پوری تاریخ اُسے سنانی پڑی کہ اس کا یہ نام کیوں رکھا گیا، ناول کی کہانی کیا ہے، کب شائع ہوئی، وغیرہ، وغیرہ۔
"میرے لئے ایک جلد ضرور لے کے آیئے گا۔"
"اب تو میرے پاس ہے نہیں" میں نے بڑے اطمینان سے اُسے بتایا۔ "اور ویسے بھی ختم ہو چکی ہے، اب ملتی ہی نہیں ہے۔"
یہ سُن کر ناٹا لیا ایک لمحے کے لئے کچھ دل شکستہ سی ہو گئی، پھر اُسے ایک نئی بات کا خیال آ گیا، اور اُس نے بڑی بے تابی سے پوچھا: "اور آپ یہاں برلن میں کیا لکھیں گے؟ مجھے بتلایئے۔"
اُسے بہلانے کے لئے میں نے ایک کہانی سنانا شروع کر دی جو میں نے کئی سال ہوئے کیمبرج میں کالج کے رسالے کے لئے لکھی تھی۔ کہانی سناتے ہوئے میں اسے فی البدیہہ گھٹاتا بڑھاتا گیا۔ میں نے یہ کہانی دوبارہ جو سنائی تو مجھے اتنی پسند آئی کہ میں محسوس کرنے لگا اس میں جو خیال پیش کیا گیا ہے وہ ایسا بُرا نہیں ہے، اور میں اسے دوبارہ لکھ سکتا ہوں۔ ہر جملے کے بعد وہ اپنے ہونٹ دبا کے اس زور سے سر ہلاتی تھی کہ اُس کے بال پھٹ پھٹ آ کے منہ پہ لگتے تھے۔

"ہاں ہاں۔" وہ کہے جا رہی تھی۔ "ہاں ہاں۔"

کئی منٹ بعد جا کے مجھے احساس ہوا میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل نہیں سمجھ رہی۔ غالباً وہ میری انگریزی نہیں سمجھ سکتی تھی کیونکہ اب میں بہت تیز بول رہا تھا، اور اپنے لفظوں کا انتخاب بھی نہیں کر رہا تھا، حالانکہ وہ اپنی توجہ مرتکز رکھنے کی تو بڑی عقیدت کے ساتھ کوشش کر رہی تھی، لیکن میں نے دیکھا کہ اُس کی نظریں بھٹک رہی ہیں اور وہ غور کر رہی ہے کہ میں مانگ کس طرح نکالتا ہوں، اور میری ٹائی کی گرہ گھس گھس کے چمکنے لگی ہے بلکہ اُس نے چپکے سے ایک نظر میرے جوتے پر بھی ڈالی۔ میں ایسا بن گیا گویا میں یہ سب دیکھ ہی نہیں رہا ہوں۔ اگر میں بیچ میں رُک جاتا تو بڑی بدتمیزی ہوتی اور ناٹالیا کی مسرت میں خلل پڑتا۔ اُسے بس اتنی ہی بات میں مزا آ رہا تھا کہ حالانکہ ہم دونوں بالکل اجنبی ہیں مگر میں بڑی بے تکلفی کے ساتھ اُس سے ایک ایسی چیز کے بارے میں باتیں کر رہا ہوں جس سے واقعی مجھے دلچسپی ہے۔

جب میری کہانی ختم ہو گئی تو اُس نے فوراً پوچھا، "یہ کہانی کتنے دن میں تیار ہو جائیگی؟" میرے اور معاملات کے ساتھ ساتھ یہ کہانی بھی اُس کے زیرِ نگرانی آ گئی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ کچھ پتہ نہیں، میں تو بہت کاہل ہوں۔

"آپ کاہل ہیں؟" ناٹالیا نے تمسخرانہ انداز میں آنکھیں کھول دیں۔ "اچھا؟ تب تو مجھے افسوس ہے، میرے بس کی بات نہیں۔"

تھوڑی دیر میں میں نے کہا کہ اب مجھے چلنا چاہیئے۔ وہ میرے ساتھ دروازے تک آئی۔ "وہ کہانی مجھے جلدی لا کے دکھا دیئے گا۔" اُس نے تاکید کی۔

"اچھا۔"

"کب؟"

"اگلے ہفتے۔" کمزور پڑکے میں نے وعدہ کرلیا۔ پندرہ دن گزر گئے تو میں ایک مرتبہ پھر لانڈا ور لوگوں کے یہاں پہنچا۔ کھانے کے بعد جب فراؤ لانڈا ور کمرے سے باہر چلی گئیں تو ناٹا لیا نے مجھے بتایا کہ ہم دونوں کو اکٹھے سنیما جانا ہے۔" ہم دونوں اماں کے مہمان ہیں" جب ہم چلنے کے لئے کھڑے ہوئے تو اُس نے یکایک الماری پر سے ایک نارنگی اور دو سیب اُٹھا لئے اور میری جیب میں ٹھونس دیئے۔ غالباً وہ یہ فیصلہ کرچکی تھی کہ ٹھیک طرح کھانا نہ ملنے کی وجہ سے میری صحت خراب ہے۔ کمزور سی آواز میں میں نے احتجاج کیا۔

"اگر آپ نے ایک لفظ بھی کہا تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔" اُس نے مجھے تنبیہہ کی۔

"آپ وہ لائے؟" جب ہم گھر سے نکل رہے تھے تو اُس نے پُوچھا۔

مجھے خوب معلوم تھا کہ اُس کا مطلب کہانی سے ہے، مگر میں نے اپنی آواز بڑی معصومانہ بنالی، "کیا نہیں لایا؟"

"آپ جانتے ہیں آپ نے کیا وعدہ کیا تھا۔"

"مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے کوئی وعدہ کیا ہو۔"

"یاد نہیں؟" ناٹا لیا حقارت سے ہنسنے لگی۔ "پھر تو مجھے افسوس ہے، میرے بس کی بات نہیں۔"

لیکن سنیما پہنچتے پہنچتے اُس نے مجھے معاف کر دیا۔ یہاں ایک مذاقیہ فلم ہو رہی تھی۔ ناٹا لیا نے سخت لہجے میں کہا۔ "شاید آپ کو اس قسم کی فلم پسند نہیں؟ اونچے مذاق کی نہیں ہے جو آپ کے لائق ہو؟"

میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے صرف اُونچے مذاق ہی کی فلمیں تھوڑے ہی پسند

ہیں، لیکن اُس کا شبہ دور نہ ہوا۔ "اچھا دیکھتے ہیں۔"

جب فلم چل رہی تھی تو وہ بار بار نظر اُٹھا کر میری طرف دیکھتی تھی کہ میں ہنس رہا ہوں یا نہیں۔ پہلے تو میں بہت زیادہ ہنسا، لیکن جب ہنستے ہنستے تھک گیا تو بالکل ہی ہنسنا بند کر دیا۔ ناٹالیا کو میرے اُوپر زیادہ سے زیادہ جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ فلم کے خاتمے کے قریب تو اُس کی یہ حالت ہوئی کہ جب ہنسنے کا موقع آتا تو میرے کہنی مارتی۔ جیسے ہی روشنی ہوئی اُس نے میرے اُوپر جھپٹا مارا:

"دیکھا نا؟ میں نے ٹھیک کہا تھا۔ آپ کو فلم پسند نہیں آئی؟"

"مجھے تو بہت پسند آئی ہے۔"

"ہاں جیسے مجھے یقین ہی تو آ گیا! اب کے سچ سچ بتائیے۔"

"میں نے بتا تو دیا۔ مجھے فلم کافی پسند آئی۔"

"لیکن آپ ہنسے تو ہیں نہیں۔ آپ تو بس یوں منھ بنائے بیٹھے رہے......" ناٹالیا نے میری نقل اتارنے کی کوشش کی۔ "اور ایک دفعہ بھی نہیں ہنسے۔"

"میں جب خوش ہوتا ہوں تو کبھی بھی نہیں ہنستا۔" میں نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے! یہ کوئی تمہارا انگریزوں کا دستور ہوگا کہ ہنسو مت؟"

"جب کوئی انگریز خوش ہوتا ہے تو کبھی بھی نہیں ہنستا۔"

"آپ چاہتے ہیں کہ میں اس بات کا یقین کر لوں؟ اچھا تو سنئے، آپکے انگریز پاگل ہیں۔"

"یہ بات آپ نے کوئی نئی نہیں کہی۔"

"اچھا تو جناب میں جو بات بھی کہوں وہ نئی ضرور ہو؟"

"ہاں، جب آپ میرے ساتھ ہوں۔"

"بے وقوف!"

تھوڑی دیر ہم چڑیا گھر والے اسٹیشن کے قریب ایک کیفے میں بیٹھے رہے اور آئس کریم کھاتے رہے۔ آئس کریم میں گانٹھیں سی تھیں، اور کچھ آلو کا سا مزا تھا۔ یکایک ناٹا لیا اپنے والدین کی باتیں کرنے لگی۔

"یہ آج کل کتابیں کیا کہتی ہیں، میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ ان کتابوں میں لکھا ہے کہ اپنے بچوں سے ماں باپ کا جھگڑا ضرور ہوتا ہے۔ میرا تو اپنے ماں باپ سے کبھی بھی جھگڑا نہیں ہو سکتا۔ بالکل ناممکن ہے۔"

ناٹا لیا نے میری طرف گھور کے دیکھا کہ مجھے اس بات کا یقین بھی آیا یا نہیں۔ میں نے سر ہلا دیا۔

"بالکل ناممکن ہے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے دہرایا۔ "کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میرے ماں باپ کو مجھ سے محبت ہے۔ چنانچہ وہ اپنے بارے میں نہیں سوچتے بلکہ ہمیشہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ میرے لئے کیا بات اچھی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میری والدہ کی صحت کچھ ایسی اچھی نہیں ہے کبھی کبھی اُن کے سر میں بڑا سخت درد ہوتا ہے، اور اُس وقت میں انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ اکثر میرا جی سینما یا تھیئٹر یا موسیقی گھر جانے کو چاہتا ہے اور میری والدہ کچھ بھی نہیں کہتیں، لیکن میں اُن کی طرف دیکھتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طبیعت اچھی نہیں، چنانچہ میں کہتی ہوں کہ نہیں، اب میرا جی نہیں چاہ رہا، میں نہیں کہوں گی۔ لیکن وہ اپنی تکلیف کے بارے میں کبھی ایک لفظ نہیں کہتیں، کبھی نہیں۔"

(جب میں اگلی دفعہ بلانڈا وہ لوگوں کے یہاں گیا تو ناٹا لیا کی ماں کے لئے پھولوں پر ڈھائی مارک خرچ کئے۔ یہ روپیہ مفت میں ضائع بھی نہیں ہوا، بلکہ کام آ گیا۔ جب کبھی

میں نے شام کو ناٹالیا کو ساتھ لے جانا چاہا ، فراؤ لانڈاور کے سر میں کبھی درد نہیں ہوا۔)

"میرے والد ہمیشہ چاہتے ہیں کہ مجھے اچھی سے اچھی چیز ملے ۔" ناٹالیا کہتی رہی "میرے والد چاہتے ہیں کہ میں کہوں، میرے ماں باپ بہت امیر ہیں، مجھے روپے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ۔" ناٹالیا نے ٹھنڈا سا سانس لیا۔ " لیکن میں اس سے بالکل مختلف ہوں۔ میں ہمیشہ اسی انتظار میں رہتی ہوں کہ کوئی بہت ہی بری بات پیش آئیگی۔ میں جانتی ہوں کہ آج کل جرمنی کی کیا حالت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یکایک میرے والد کا سارا روپیہ ختم ہو جائے۔ ایک دفعہ پہلے بھی یہی ہو چکا ہے۔ آپ کو معلوم ہے ؟ جنگ سے پہلے پوسن میں میرے والد کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ جنگ آئی تو میرے والد کا کاروبار بند ہو گیا۔ کل کو یہاں بھی یہی ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے والد ایسے آدمی ہیں کہ اُن کے لئے سب برابر ہے۔ وہ ایک فینگ سے شروع کریں گے، اور اتنا کام کریں گے، اتنا کام کریں گے کہ سارا روپیہ واپس آجائے گا۔۔۔۔۔ اسی وجہ سے میں چاہتی ہوں کہ اسکول چھوڑ دوں اور کوئی کارآمد چیز سیکھوں تاکہ اپنی روزی کما سکوں۔ پتہ نہیں میرے ماں باپ کے پاس کب تک پیسہ ہے کب تک نہیں۔ میرے والد چاہتے ہیں کہ میں یونیورسٹی جاؤں۔ لیکن اب میں اُن سے بات چیت کروں گی، اور پوچھوں گی کہ پیرس جا کے آرٹ کیوں نہ سیکھوں۔ اگر مجھے تصویریں بنانا آگیا تو شاید میری زندگی بن جائے۔ اور میں کھانا پکانا بھی سیکھوں گی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں کھانا پکانا نہیں جانتی، ذرا سی چیز بھی نہیں پکا سکتی ؟"

"میں بھی نہیں پکا سکتا۔"

"مرد کے لئے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے، لیکن لڑکی کو سب باتوں کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔"

"اگر میں چاہوں گی،" ناٹالیا نے بڑی سنجیدگی سے کہا، "تو جس آدمی سے مجھے محبت ہوگی اُس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اگر ہماری شادی نہ ہوگی تب بھی کوئی بات نہیں ہے۔ اس صورت میں تو لازمی ہے کہ میں اپنے ہاتھ سے سارے کام کر سکوں۔ آپ سمجھے؟ یہ کہہ دینا تھوڑے ہی کافی ہے 'میں نے امتحان پاس کر لیا ہے' میری سند یونیورسٹی میں ہے۔ وہ تو پوچھے گا، میرا کھانا کہاں ہے؟"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

"جو بات میں نے ابھی کہی ہے آپ کو بُری تو نہیں لگی۔" ناٹالیا نے یکایک پوچھا۔

"یہی کہ میں ایک آدمی کے ساتھ شادی کئے بغیر رہوں گی؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

"میری بات غلط نہ سمجھئے گا۔ مجھے ایسی عورتیں اچھی نہیں لگتیں جو ایک آدمی سے دوسرے آدمی کے پاس پھرتی رہتی ہیں —— بس اتنی سی بات ہے۔" ناٹالیا نے منہ بنا کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"ایسی عورتیں بڑی ذلیل ہوتی ہیں۔"

"تو آپ کے خیال میں عورتوں کو اپنی رائے بدلنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ایسے سوال میری سمجھ ہی میں نہیں آتے ..... مگر یہ ہے ذلیل بات۔"

میں اُس کے گھر تک ساتھ گیا۔ ناٹالیا میں یہ عجیب عادت تھی کہ وہ آدمی کو اپنے ساتھ دہلیز تک لے جاتی تھی، پھر بڑی تیزی سے ہاتھ ملا کے مکان میں گھس جاتی تھی اور دروازہ بند کر لیتی تھی۔

"مجھے فون کیجئے گا؟ اگلے ہفتے؟ اچھا؟" مجھے اب بھی اُس کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ اور پھر دروازہ کھٹ سے بند ہوگیا اور وہ جواب کا انتظار کئے بغیر غائب ہوگئی۔

ناٹالیا بالواسطہ یا بے واسطہ ہر قسم کے لمس سے بچتی تھی۔ جس طرح وہ اپنی دہلیز پہ کھڑے ہو کے مجھ سے باتیں نہیں کرتی تھی، اسی طرح میں نے دیکھا کہ جب ہم بیٹھتے ہیں تو وہ بیچ میں کوئی میز ضرور رکھتی ہے۔ اُسے اس بات سے بڑی نفرت تھی کہ میں اُسے کوٹ پہننے میں مدد دوں: "جناب میں کوئی ساٹھ سال کی تھوڑے سے ہی ہوں!" جب ہم کسی کیفے یا ریسٹورنٹ میں چلنے کے لئے کھڑے ہو جاتے اور وہ دیکھ لیتی کہ میری نظر اُس کھونٹی کی طرف جا رہی ہے جہاں اُس کا کوٹ ٹنگا ہوا ہے تو وہ فوراً اُس پہ جھپٹا مارتی اور کونے میں لے جاتی جیسے کوئی جانور اپنی غذا کی حفاظت کر رہا ہو۔

ایک روز شام کو ہم ایک کیفے میں گئے اور چاکلیٹ کی دو پیالیاں منگوائیں۔ جب چاکلیٹ آئی تو ہم نے دیکھا کہ خادمہ ناٹالیا کے لئے چمچہ لانا بھول گئی ہے۔ میں نے چاکلیٹ پینی شروع کر دی تھی اور دو ایک گھونٹ لینے کے بعد اسے اپنے چمچے سے چلا یا بھی تھا مجھے بالکل فطری سی بات معلوم ہوئی کہ اپنا چمچہ ناٹالیا کو دے دوں، مگر مجھے بڑا تعجب ہوا اور بُرا بھی لگا کہ اُس نے بدمزگی سے منھ بناتے ہوئے انکار کر دیا۔ اُسے میرے منہ کا بالواسطہ لمس بھی قبول نہ تھا۔

ناٹالیا ایک کونسرٹ کے ٹکٹ لے آئی جہاں موتسارٹ کی موسیقی ہونے والی تھی۔ یہ شام بڑی ناکامیاب رہی۔ ہال بہت بے رنگ اور سرد تھا۔ بجلی کی روشنی اتنی تیز تھی کہ میری آنکھوں میں بُری طرح چکا چوند ہو رہی تھی۔ لکڑی کی چمکتی ہوئی کرسیاں بے انتہا سخت

تھیں۔ نا معین اس کونسرٹ کو کوئی مذہبی رسم سمجھ رہے تھے۔ اُن کی اس عقیدت مندانہ اور بے لچک گرمجوشی سے مجھے ایسی تکلیف ہو رہی تھی جیسے سر کے درد سے۔ ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن سے ان اندھوں کی طرح پیشانی پہ بل ڈالے غور سے سننے والے سُروں کا خیال نہیں اترتا تھا۔ موتسارٹ کی موسیقی کے باوجود میں یہ سوچ رہا تھا کہ شام گزارنے کا بھی یہ عجیب و غریب طریقہ ہے!

گھر لوٹتے ہوئے میں تھکا ہوا تھا اور کچھ آزردہ سا ہو رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناتالیا سے ہلکی سی جھڑپ ہو گئی۔ یہ جھڑپ اُسی نے شروع کی، اور وہ اسی طرح کہ ہپی برنشٹائن کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ برنشٹائن لوگوں کے یہاں ناتالیا ہی نے مجھے یہ جگہ دلوائی تھی وہ اور ہپی ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ دو دن ہوئے میں نے ہپی کو انگریزی کا پہلا سبق دیا تھا۔

”وہ تمہیں پسند آئی؟“ ناتالیا نے پوچھا۔

”بہت زیادہ۔ تمہیں پسند نہیں؟“

”ہاں، مجھے بھی پسند ہے..... لیکن اُس میں دو بڑے بڑے عیب ہیں۔ شاید ابھی تمہیں پتہ نہیں چلا ہوگا؟“

چونکہ میں نے کوئی گرمجوشی ظاہر نہیں کی اس لیے اُس نے سنجیدگی سے کہا، ”میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے سچ سچ بتاؤ مجھ میں کیا عیب ہیں؟“

کوئی اور حالت ہوتی تو میں اس بات سے مزا لیتا، بلکہ میرے دل پر بھی اثر ہوتا مگر فی الحال تو میں نے یہ سوچا کہ یہ ٹوہ لینا چاہتی ہے، اور جھلا کے جواب دیا۔

”میں نہیں سمجھا کہ عیب سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں کوئی لوگوں کو اس طرح ٹھوڑی

جانچتا پھرتا ہوں جیسے مجھے چھ مہینے بعد اسکول میں رپورٹ داخل کرنی ہو۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ اپنی کسی اُستانی سے پوچھو۔"

اس بات نے تھوڑی دیر کے لیے ناٹا لیا کا منھ بند کر دیا، لیکن اُس نے بڑی جلدی پھر باتیں شروع کر دیں، اور پوچھا کہ میں نے تمہیں جو کتابیں دی تھیں اُن میں سے کوئی پڑھی یا نہیں؟ میں نے کوئی بھی نہیں پڑھی تھی، لیکن کہا کہ ہاں، جیکبسن کی " فراؤ ماری گروبے" پڑھی ہے۔ اُس نے کہا اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔

" بڑی اچھی ہے۔" میں نے چڑچڑے پن سے کہا، کیونکہ میں مجرم تھا۔

"ناٹا لیا نے میری طرف تیز نظروں سے دیکھا۔" تم خلوص کے ساتھ باتیں نہیں کر رہے ہو تم اپنی اصلی رائے نہیں بتلاتے۔"

میں بالکل بچّوں کی طرح تنک اُٹھا: " ہاں، نہیں بتاتا۔ کیوں بتاؤں؟ بحث سے مجھے کوفت ہوتی ہے۔ میں کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتا جس سے تمہیں اختلاف ہو۔"

اُس نے بڑے مایوس ہو کے کہا، " لیکن اگر یہ بات ہے کہ تو پھر ہمارا کسی چیز پہ سنجیدگی سے باتیں کرنا ہی بے کار ہے۔"

" ہاں بالکل بیکار ہے۔"

" تو پھر ہم بالکل ہی بولنا چھوڑ دیں؟" بچاری ناٹا لیا نے پوچھا۔

میں نے کہا، " بہترین بات تو یہ ہوگی کہ ہم جانوروں کی طرح آوازیں نکالا کریں۔ تمہاری آواز سننے کو تو میرا جی چاہتا ہے، مگر تم کیا کہتی ہو، کیا نہیں، اس کی مجھے بالکل پروا نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ بہت بہتر ہوگا کہ ہم بھوں بھوں، میاؤں میاؤں، بھیں بھیں کیا کریں"

ناٹا لیا سرخ ہو گئی۔ وہ حیران و ششدر رہ گئی تھی، اور اُسے میری بات۔ بہت

بڑی معلوم ہوئی تھی۔ بڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ بولی: "ہاں میں سمجھ گئی۔"
جب ہم گھر کے قریب آ گئے تو میں نے معاملے کو رو براہ لانے کی کوشش کی اور اس ساری بات کو مذاق میں بدل دینا چاہا، لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر میں ندامت اور شرم محسوس کرتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

اس کے دو چار دن بعد ناٹالیا نے اپنے آپ فون کیا، اور مجھے دوپہر کے وقت کھانے پر بلایا۔ اُس نے خود آکے دروازہ کھولا —— غالباً وہ اسی انتظار میں بیٹھی تھی —— اور میرا استقبال اس طرح کیا: "بھوں بھوں! میاؤں! بھیں!"
ایک لمحے کے لئے تو واقعی میں نے سوچا کہ یہ لڑکی پاگل ہو گئی ہے۔ پھر مجھے اس روز کا جھگڑا یاد آیا۔ لیکن یہ مذاق کر چکنے کے بعد ناٹالیا پھر دوست بن جانے کے لئے بالکل تیار تھی۔
ہم بیٹھنے کے کمرے میں پہنچے، اور وہ گلدانوں میں ایسپرن کی ٹکیاں ڈالنے لگی۔ وہ کہنے لگی کہ میں ان پھولوں کو پھر سے تر و تازہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے پوچھا کہ اس زمانے میں کیا کرتی رہی ہو۔
ناٹالیا نے کہا۔ "اس ہفتے میں بالکل اسکول نہیں گئی۔ میری طبیعت خراب تھی۔ تین دن ہوئے میں وہاں پیانو کے پاس کھڑی تھی، بس یکایک میں گر پڑی —— بول۔ اُسے کیا کہتے ہیں انگریزی میں؟"
"یعنی بے ہوش ہو گئیں؟"
ناٹالیا نے زور زور سے سر ہلایا۔ "ہاں ٹھیک ہے۔ میں بے ہوش ہو گئی۔"

"پھر تو تمہیں بستر پہ لیٹ کے آرام کرنا چاہیئے۔" یکایک میرے اندر بڑی مردانگی اور کمزوروں کی حفاظت کرنے کا احساس عود کر آیا۔ "اب تم کیسی ہو؟"

ناٹالیا کھل کھلا کے ہنسنے لگی۔ میں نے کبھی اُسے اتنا تندرست نہیں دیکھا تھا۔

"نہیں، کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے!"

"تمہیں ایک خبر سنانی ہے۔" وہ بولی۔ "تم سُن کے بڑے خوش ہو گے۔ آج میرے والد اور میرے چچا زاد بھائی برن ہارٹ آ رہے ہیں۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"ہاں اسے!؟ جب والد آتے ہیں تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے، کیونکہ وہ زیادہ تر سفر ہی میں رہتے ہیں۔ اُن کا ہر جگہ کاروبار ہے، پیرس میں، ویانا میں، پراہا میں۔ وہ ہمیشہ ریل میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ تمہیں بہت پسند آئیں گے۔"

"ہاں، یقیناً۔"

اور واقعی جب شیشے کا دروازہ ہٹا تو مسٹر لانڈاور مجھ سے ملنے کے منتظر بیٹھے تھے اُن کے قریب ناٹالیا کا چچا زاد بھائی برن ہارٹ لانڈو کھڑا تھا۔ وہ لمبے قد کا، زرد رُو نوجوان تھا، اور سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ عمر میں مجھ سے دو چار سال ہی بڑا ہو گا۔ "آپ سے مل کے بڑی خوشی ہوئی۔" جب ہم ہاتھ ملا رہے تھے تو برن ہارٹ نے کہا وہ بڑی روانی سے انگریزی بولتا تھا اور اُس کے لہجے میں ذرا سی بھی اجنبیت نہیں تھی۔

مسٹر لانڈاور پستہ قد اور بڑے زندہ دل تھے۔ اُن کی کھال میں جھریاں پڑی ہوئی تھیں، اور وہ بالکل چمڑے کی طرح تھے جیسے کوئی اچھی طرح پالش کیا ہوا پرانا جوتا۔ اُن کی آنکھیں چمکدار بھورے رنگ کی اور بوٹ کے بٹنوں جیسی تھیں، اور بھنویں ایسی گھنی

اور سیاہ کہ معلوم ہوتا تھا جلی ہوئی کاگ سے بنائی گئی ہیں۔ اُن کی شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اپنے خاندان سے محبّت ہے۔ انہوں نے فراؤ لانڈاور کے لئے اس طرح دروازہ کھولا جیسے کسی بہت ہی خوبصورت نوجوان لڑکی کے لئے۔ اُن کی پُرمسرت اور کریم نفساتی مسکراہٹ پوری جماعت کا احاطہ کئے ہوئے تھی ــــ ناٹالیا کا جو اپنے باپ کی واپسی پر خوشی کے مارے پھولی نہ سما رہی تھی، فراؤ لانڈورہ کا جن کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی تھی، چکنے چپڑے اور زندہ رُو برن ہارٹ کا جو شائستگی تو برت رہا تھا مگر معلوم ہوتا تھا کچھ پُراسرار سا؟ اس مسکراہٹ کے دائرے میں تو میں تک شامل تھا۔ بلکہ ہرلانڈاور تو ساری باتیں مجھ ہی کو مخاطب کر کے کہہ رہے تھے؛ اور خاندانی معاملات کا ذکر تک نہیں آنے دے رہے تھے کہ میں کہیں اپنے آپ کو اجنبی نہ محسوس کرنے لگوں۔

"پینتیس سال ہوئے میں انگلستان گیا تھا۔" انہوں نے مجھے بتایا۔ وہ لفظوں پر بہت زور دے دے کے بول رہے تھے۔ "میں ڈاکٹر کی ڈگری کے لئے اپنا مقالہ لکھنے آپ کے دارالسلطنت گیا تھا۔ میرا موضوع تھا، لنڈن کے ایسٹ اینڈ میں یہودی مزدوروں کی حالت، وہاں میں نے بہت سی ایسی باتیں دیکھیں جو آپ کے انگریز افسر نہیں چاہتے تھے کہ میں دیکھوں۔ میں اُس زمانے میں بالکل جوان تھا۔ آپ کی جو عمر ہے اُس سے بھی کم تھی۔ بندرگاہ کے مزدوروں، طوائفوں اور قحبہ خانوں کی نائکاؤں سے میری بڑی مزیدار باتیں ہوئیں۔ بڑی دلچسپ....." ہرلانڈاور مسکرانے لگے جیسے بیتی باتیں یاد آرہی ہوں۔ "میرے اس حقیر سے مقالے پر بڑی بحثیں ہوئیں۔ اس کا ترجمہ کم سے کم پانچ زبانوں میں ہوا ہے۔"

"پانچ زبانوں میں!" ناٹالیا نے جرمن میں مجھ سے کہا۔ "دیکھا، میرے والد بھی مصنّف ہیں!"

"اوہ، یہ تو پینتیس سال پہلے کی بات ہے! تمہارے پیدا ہونے سے تو بہت پہلے کا ذکر ہے۔" سر لانڈاور نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سر ہلایا، اور اُن کی بوٹ کے بٹنوں جیسی آنکھیں نیک دلی اور کریم نفسی سے چمک اٹھیں۔ "اب مجھے ایسے کاموں کے لئے فرصت کہاں ملتی ہے۔" وہ پھر میری طرف مڑے: "آپ کے زبردست انگریز شاعر لارڈ بائرن کے بارے میں میں نے ابھی ایک فرانسیسی کتاب پڑھی ہے۔ بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ بائرن کے متعلق ایک بہت اہم سوال ہے، آپ مصنّف کی حیثیت سے مجھے اپنی رائے بتائیے —— لارڈ بائرن کے اپنی بہن سے ناجائز تعلقات تھے یا نہیں؟ آپ کی کیا رائے ہے، مسٹر اِشروڈ؟"

مجھے محسوس ہوا کہ میرا چہرہ سرخ ہوا جا رہا ہے۔ نہ معلوم کیا بات تھی، اس وقت مجھے ناٹالیا کی موجودگی سے جھینپ نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ فراؤ لانڈاور کی موجودگی سے جو بڑے اطمینان سے کھانا کھا رہی تھی۔ برن ہارٹ کی نظریں اپنی رکابی پر جمی ہوئی تھیں، اور وہ سخن فہمانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ "جی،" میں نے کہنا شروع کیا، "ذرا مشکل ہے ....."

"بڑا دلچسپ مسئلہ ہے،" سر لانڈاور نے مہربان نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر بڑی دلجمعی کے ساتھ منہ چلاتے ہوئے کہا۔ "کیا ہم یہ مان لیں کہ فطانت رکھنے والا آدمی غیر معمولی شخص ہوتا ہے اور اُسے غیر معمولی باتیں کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے، یا پھر کہیں کہ نہیں، چاہے تم حسین نظمیں لکھو چاہے خوبصورت تصویریں بناؤ، اپنی روزانہ زندگی میں تو تمہیں عام آدمیوں کی طرح چلنا ہوگا، اور ہم نے عام آدمیوں کے لئے جو قانون بنائے ہیں تمہیں ان کی فرماں برداری کرنی ہوگی؟ ہم تمہیں غیر معمولی باتیں نہیں

کرنے دیں گے۔" ہرلانڈاورنے منہ میں نوالہ بھرے ہوئے باری باری سے ہم سب کو فتحمندانہ نظروں سے دیکھا۔ یکایک اُن کی آنکھوں سے مسکراہٹ پھوٹ پڑی اور وہ میرے اُوپر گڑ گئیں۔ "آپ کا ڈراما نگار آسکر وائلڈ..... وہ بھی ایک اچھا خاصا مسئلہ ہے۔ میں یہ مسئلہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، مسٹر اشروڈ۔ میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے انگریزی قانون نے آسکر وائلڈ کو سزا دی تو قانون حق پہ تھا یا نہیں؟ بتائیے، آپ کی کیا رائے ہے؟"

ہرلانڈاورنے میری طرف مسرت آمیز نظروں سے دیکھا۔ انہوں نے کانٹے میں گوشت لگا کے اپنے منہ کے قریب اٹھا رکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پس منظر میں بیرن ہاٹ بڑی احتیاط سے مسکرا رہا ہے۔

"جی....." میں نے کہنا شروع کیا، میرے کان جل رہے تھے اور بالکل سرخ ہو گئے تھے۔ اس دفعہ بالکل غیر متوقع طور پر فراؤ لانڈاورنے ترکاریوں کے متعلق جرمن میں ناٹالیا سے کوئی بات کہہ کے مجھے بچا لیا۔ اب ایک چھوٹی سی بحث چھڑ گئی، اور اس میں ہرلانڈاور اپنا سوال بھول گئے۔ وہ بڑے اطمینان سے کھانا کھاتے رہے۔ لیکن ...ی کے ناٹالیا سے بولے بغیر نہ رہا گیا:

"خوالد کو اپنی کتاب کا نام بتا دو۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ بڑا عجیب نام ہے۔"
میں نے اپنی خفگی کا اظہار کرنے کے لئے چپکے سے اُس کی طرف گھورا تاکہ دوسرے ...وگ نہ دیکھ سکیں۔ "سارے سازشی،" میں نے سرد مہری سے کہا۔

"سارے سازشی،..... ہاں، یہی نام ہے!"
"آہا، آپ جرائم کے متعلق ناول لکھتے ہیں، مسٹر اشروڈ؟" ہرلانڈاور نے

پسندیدگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کتاب کا مجرموں سے کوئی تعلق نہیں ہے" میں نے بڑی شائستگی برتتے ہوئے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہرلانڈاور کو بڑی مایوسی ہوئی اور وہ کچھ الجھن میں پڑ گئے "مجرموں سے تعلق نہیں؟"

"پوری بات بتادو" ناٹالیا نے حکم دیا۔

میں نے لمبا سا سانس لیا۔ "اس نام میں اشاریت ہے .... یہ فقرہ شیکسپیئر کے ڈرامے 'جولیس سیزر' سے لیا گیا ہے ....."

ہرلانڈاور کے چہرے پر فوراً رونق آگئی۔ "آہا! شیکسپیئر! بہت خوب! بڑی دلچسپ بات ہے ......"

میں اپنی ہوشیاری اور مہارت سے بے التفاتی ظاہر کرنے کے لئے مسکرایا، اور انہیں دوسری طرف بہکا لے جانے کی کوشش کی۔ "جرمن زبان میں تو غالباً شیکسپیئر کے بڑے اچھے ترجمے ہیں؟"

"ہاں، یقیناً! یہ ترجمے ہماری زبان کی بہترین تصنیفات میں سے ہیں۔ ان ترجموں کی بدولت شیکسپیئر تقریباً ایک جرمن شاعر بن گیا ہے ......"

"لیکن تم نے یہ نہیں بتایا" ناٹالیا نے ضد کی جیسے اُسے مجھ سے بڑی گہری عداوت ہو، "کہ تمہاری کتاب کس کے بارے میں ہے؟"

میں دانت کچکچانے لگا۔ "دو نوجوان آدمیوں کے بارے میں ہے۔ ان میں سے ایک فن کار ہے اور دوسرا طب کا طالب علم ہے۔"

"تو کیا تمہاری کتاب میں بس دو ہی کردار ہیں؟" ناٹالیا نے پوچھا۔

"نہیں تو...... لیکن مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ تمہارا حافظہ کتنا خراب ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن تو ہوئے کہ میں نے تمہیں ساری کہانی سنائی ہے۔"

"بیوقوف! میں اپنے لئے تھوڑی پوچھ رہی ہوں۔ جو کچھ تم نے سنایا ہے مجھے سب یاد ہے۔ لیکن والد صاحب نے تو ابھی نہیں سُنا۔ انہیں سنا دو...... ہاں تو پھر کیا ہوا"

"فن کار کی ایک ماں اور ایک بہن ہے۔ ان لوگوں کی زندگی بڑی بدمزگی سے گزر رہی ہے۔"

"لیکن ان لوگوں کی زندگی بدمزگی سے کیوں گزر رہی ہے؟ اب ہم ہی ہیں، میرے والد اور میری والدہ اور میں، ہماری زندگی تو بدمزگی سے نہیں گزرتی۔"

میرا جی چاہا کہ اُسے زمین نگل جائے "سب لوگ ایک سے تھوڑی ہوتے ہیں۔" میں نے مسز لانڈا ورسے آنکھیں چراتے ہوئے بڑی احتیاط سے کہا۔

"اچھا،" ناٹالیا نے کہا۔ "تو اُن کی زندگی بدمزگی سے گزرتی ہے...... پھر کیا ہوا؟"

"فن کار گھر سے بھاگ جاتا ہے اور اُس کی بہن کی شادی ایک بڑے خراب آدمی سے ہو جاتی ہے۔"

غالباً ناٹالیا سمجھ گئی کہ اب میں ایسی باتیں زیادہ دیر برداشت نہیں کروں گا۔ اُس نے آخری دفعہ کانٹا چبھویا۔ "اچھا کتاب کی کتنی جلدیں بکیں؟"

"پانچ۔"

"پانچ! لیکن یہ تو بہت کم ہیں، ہے نا یہی بات؟"

"ہاں، بہت کم ہیں۔"

کھانے کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگ خاموشی سے اپنی اپنی جگہ سمجھ گئے کہ اب برن ہارٹ، اُس کے چچا اور چچی خاندانی معاملات کے بارے میں باتیں کرنا چاہتے ہیں "کہو تو ہم دونوں تھوڑا سا ٹہل ہی لیں ؟"

ہرلانڈا ورنے بڑے رسمی طور سے مجھے خدا حافظ کہا۔ "مسٹر اَشروڈ، جب کبھی آپ کا جی چاہے، تشریف لایئے۔" ہم دونوں نے بڑے جھک کے سلام کیا۔ برن ہارٹ نے مجھے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا "کسی دن شام کو تشریف لایئے، اور میری تنہائی میں بھی تھوڑی سی رونق پیدا کیجئے۔" میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ بڑی خوشی سے آؤں گا۔

"میرے والد کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ؟" جب ہم گھر سے باہر نکلے تو ناٹالیا نے پوچھا۔

"میں نے اتنے اچھے والد کسی کے نہیں دیکھے۔"

"سچ کہہ رہے ہو ؟" ناٹالیا کو بڑی خوشی ہوئی۔

"ہاں، بالکل سچ۔"

"اچھا، قبول لو، جب والد نے لارڈ بائرن کا ذکر کیا ہے تو تم بڑے چونکے ـــ نہیں چونکے ؟ تمہارا سارا منھ لال چقندر ہو رہا تھا۔"

میں ہنسنے لگا: "تمہارے والد کے سامنے میں اپنے آپ کو پرانے فیشن کا سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ اُن کی گفتگو بالکل جدید قسم کی ہے۔"

ناٹالیا فتحمندانہ انداز سے ہنسنے لگی۔ "دیکھا، میں ٹھیک کہہ رہی تھی! تم بڑے چونکے۔ مجھے بڑی خوشی ہے۔ میں نے اپنے والد سے کہا تھا کہ ایک بڑا ذہین نوجوان

ہم سے ملنے آرہا ہے ــ چنانچہ وہ تمہیں دکھانا چاہتے تھے کہ میں بھی نئے فیشن کا ہو سکتا ہوں اور سارے مضمونوں پر بات کر سکتا ہوں۔ تم سمجھتے تھے میرے والد کوئی احمق سے بڈھے ہونگے؟ سچ بتاؤ۔"

"نہیں،" میں نے احتجاج کیا۔ "میں نے تو کبھی نہیں سوچا!"

"وہ احمق نہیں ہیں..... بڑے ہوشیار ہیں۔ بس انہیں پڑھنے کو وقت نہیں ملتا، کیونکہ انہیں ہر وقت کام کرنا پڑتا ہے۔ بعض دفعہ تو انہیں اٹھارہ اٹھارہ انیس انیس گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ بڑی محنت کرتے ہیں..... اور ساری دنیا میں کوئی باپ اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا!"

"تمہارے چچا زاد بھائی برن ہارٹ کاروبار میں تمہارے والد کے ساتھ شریک ہیں یہی بات ہے نا؟"

ناٹالیا نے سر ہلایا۔ "یہاں برلن میں وہی دکان کا انتظام کرتے ہیں۔ وہ بھی بڑے ہوشیار ہیں۔"

میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے یہاں اکثر آتے رہتے ہیں؟"

"نہیں..... وہ ہمارے یہاں زیادہ نہیں آتے..... بڑے عجیب آدمی ہیں۔ شاید انہیں اکیلے رہنا بہت پسند ہے۔ جب انہوں نے تم سے اپنے یہاں آنے کو کہا تو مجھے بڑا تعجب ہوا..... ذرا سنبھلے رہنا۔"

"سنبھلے رہنا؟ میں کیوں سنبھلا رہوں؟"

"وہ بڑی طنزیہ باتیں کرتے ہیں۔ شاید وہ تمہارا مذاق اُڑائیں گے۔"

"تو اس سے میرا کیا بگڑ جائے گا؟ بیسیوں آدمی میرا مذاق اڑاتے ہیں..... کبھی کبھی

تو تم بھی مذاق اُڑاتی ہو۔"

"ارے، ہیں! وہ تو اور بات ہے۔" نانا لیا نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ غالباً اُسے خود بڑا ناخوشگوار تجربہ ہو چکا تھا، اور وہ اسی بنا پر کہہ رہی تھی۔ "جب ہیں مذاق اُڑاتی ہوں تو بس دل لگی کے لئے۔ سمجھے؟ لیکن جب برن ہارٹ مذاق اُڑاتے ہیں تو اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔۔"

ٹیئر گارٹن سے تھوڑی ہی دور ایک خاموش سی سڑک پر برن ہارٹ کا مکان تھا۔ میں نے باہر والے دروازے کی گھنٹی بجائی تو ایک بونوں کی سی شکل کے دربان نے چھوٹی سی کھڑکی سے جھانکا، اور پوچھا کہ آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؛ اور آخر کئی منٹ تک مجھے بڑے شبہے کی نظروں سے دیکھنے کے بعد ایک بٹن دبایا جس سے دروازے کا تالا کھل گیا۔ یہ دروازہ اتنا بھاری تھا کہ مجھے دونوں ہاتھوں سے ڈھکیل کے کھولنا پڑا۔ جب میں نے اندر آکے دروازہ بند کیا تو ایسی کھوکھلی سی گونج پیدا ہوئی جیسے کوئی توپ دغی ہو۔ پھر دو دروازے آئے جو صحن میں کھلتے تھے، پھر باغیچے کا دروازہ، پھر پانچ زینے، پھر اصلی مکان کا دروازہ۔ برن ہارٹ کو چار دروازے خارجی دنیا سے محفوظ رکھتے تھے۔

آج شام اُس نے اپنے روزمرّہ کے لباس کے اوپر ایک بڑا خوبصورت کڑھا ہوا کمونو پہن رکھا تھا۔ پہلی ملاقات کے بعد میرے ذہن میں اُس کی جیسی شکل تھی آج وہ ویسا نہیں نظر آ رہا تھا۔ اُس دن مجھے اُس کا چہرہ ذرا بھی مشرقی انداز کا نہیں معلوم ہوا تھا ــــ کمونو کی وجہ سے اُس کے چہرے کا یہ انداز اُبھر آیا تھا۔ ایک رُخ سے دیکھا جائے تو وہ ضرورت سے زیادہ مہذب، حسین، بڑے سُبک خدوخال کا اور چکیلے چہرے والا نظر آتا

تھا جیسے کڑھے ہوئے چینی کپڑے پر کوئی چڑیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ شخص بڑا نرم و نازک اور منفی قسم کا ہے، مگر عجیب بات ہے کہ اس میں قوت بھی بہت نظر آتی ہے ـــــ کسی مندر میں ہاتھی دانت کے بُت کی سی ساکن قوت۔ اُس کے بستر کے قریب پائنتی کی طرف پتھر کا بنا ہوا گوتم بدھ کا سر رکھا تھا جو بارھویں صدی کا تھا اور خمیر سے لایا گیا تھا۔ جب وہ مجھے یہ سر دکھا رہا تھا تو میں اُس کی حسین انگریزی اور اُس کے ہاتھوں کی حقارت آمیز حرکات پر پھر غور کرنے لگا۔ اس سر کے بارے میں وہ کہنے لگا کہ "جب میں سوتا ہوں تو یہ میری نگرانی کرتا ہے۔" کتابوں کی سفید الماری پر یونان، سیام اور انڈوچائنا کے چھوٹے چھوٹے مجسمے اور پتھر کے سر رکھے ہوئے تھے۔ جب برن ہارٹ سفر پہ گیا تھا تو ان میں سے بہت سی چیزیں اپنے ساتھ لایا تھا۔ آرٹ کی کتابوں، فوٹوگرافوں کی نقلوں کے مجموعوں اور مجسمہ سازی اور قدیم نوادارات پر تنقیدی کتابوں کے درمیان میں نے ولیشل کی کتاب "پہاڑی" اور لینن کی کتاب "کیا کرنا چاہیئے" بھی دیکھیں۔ یہ مکان بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہیں دیہات میں ہو۔ یہاں باہر کی ذراسی بھی آواز نہیں آتی تھی۔ ایک بڑی سنجیدہ سی خادمہ کھانا لے کے آئی۔ میں نے شوربا، مچھلی، کباب اور ترکاری کھائی۔ برنہارٹ نے دودھ پیا اور صرف ٹماٹر اور بسکٹ کھائے۔

ہم نے لنڈن کے بارے میں باتیں کیں جہاں برنہارٹ کبھی نہیں گیا تھا، اور پھر کچھ پیرس کا ذکر آیا جہاں اُس نے کچھ دنوں ایک مجسمہ ساز کے یہاں یہ کام سیکھا تھا۔ جوانی میں وہ مجسمہ ساز ہی بننا چاہتا تھا۔ "لیکن،" برنہارٹ نے ٹھنڈا سا سانس لیا اور پھر ملامت سے مسکرایا، "خدا کی مرضی ہی اور تھی۔"

میں اُس سے لانڈا اور لوگوں کے کاروبار کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا تھا، لیکن ڈرا کہ

یہ بات نامناسب ہوگی، اس لئے میں نے کوئی بات نہیں چھیڑی۔ برنہارٹ نے خود ہی باتوں باتوں میں اس کا ذکر کیا۔ "اگر آپ کو دلچسپی ہو تو کسی دن وہاں آیئے ——— میرا تو خیال ہے کہ چاہے ہمارے زمانے کے ایک معاشی مظہر ہی کی حیثیت سے سہی مگر ہے چیز دلچسپ۔" وہ مسکرانے لگا اور اُس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار طاری ہوگئے۔ میں نے سوچا کہ شاید اسے کوئی مہلک بیماری ہے۔

مگر کھانے کے بعد وہ زیادہ خوش خوش نظر آنے لگا، اور مجھے اپنے سفر کا حال سنانے لگا۔ چند سال پہلے اُس نے ساری دنیا کے گرد سفر کیا تھا۔ اُس کی طبیعت میں ہلکا سا تجسس اور تھوڑا سا طنز تھا، اُس نے ہر چیز میں تھوڑی بہت ٹانگ اڑائی تھی ـــ فلسطین میں یہودیوں کی دیہاتی برادریاں، بحرِ سیاہ کے کنارے یہودی نو آبادیاں، ہندوستان میں انقلابی جماعتیں، میکسیکو میں باغی فوجیں ـــ اُس نے سب چیزیں دیکھی تھیں۔ کچھ ہچکچاتے ہوئے اور بڑی ملائمت سے لفظوں کا انتخاب کرتے ہوئے اُس نے سنایا کہ ایک چینی ملاح سے دیوؤں کے بارے میں کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اسی طرح اُس نے ایک قصہ نیویارک میں پولیس کی بے رحمی کا سنایا جس پر مشکل سے یقین آتا تھا۔

اس دوران میں چار پانچ دفعہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور ہر دفعہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ برنہارٹ سے مدد یا مشورہ مانگا جا رہا ہے۔ "مجھ سے کل آکے ملنا۔" وہ اپنی تھکی ہوئی سکون آور آواز میں کہتا، "ہاں ..... مجھے یقین ہے کہ انتظام ہو جائے گا ..... اچھا، اب مجھے زیادہ پریشان مت کرو۔ جاؤ سو رہو۔ ایسپرن کی دو ٹکیاں کھا لو۔" وہ کچھ طنز کے ساتھ بڑی ملائمت سے مسکراتا۔ غالباً اُسے ان سب امیدواروں کو کچھ نہ کچھ روپیہ قرض دینا تھا۔

جب میں چلنے کو اُٹھا تو اس نے کہا، "یہ پوچھنا ہے تو بدتمیزی کی بات لیکن بتایئے کہ آپ برلن میں رہنے کیوں آئے ہیں ؟"

"جرمن سیکھنے۔" میں نے کہا۔ ناٹالیا کی تنبیہہ کے بعد میں برنہارٹ پر اتنا اعتماد نہیں کرسکتا تھا کہ اُسے اپنی آپ بیتی سنا دوں۔

"اور یہاں آپ خوش ہیں ؟"

"بہت خوش ہوں۔"

"عجیب بات ہے..... بڑی عجیب بات ہے....." برنہارٹ اپنے ملائم اور طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "آپ کی روح میں اتنی طاقت ہے کہ برلن میں بھی خوش رہ سکتی ہے۔ مجھے بھی اپنا راز بتا دیجئے۔ کیا میں آپ کے قدموں میں بیٹھ کے آپ سے دانشوری حاصل کرسکتا ہوں ؟"

اُس کی مسکراہٹ کچھ سمٹ سی گئی اور پھر غائب ہو گئی۔ مہلک خستگی اور تھکاوٹ کی بے حسی ایک مرتبہ پھر سائے کی طرح اُس کے نوجوان چہرے پر چھا گئی۔ وہ کہنے لگا، "جب کبھی کوئی اور کام نہ ہو تو مجھے فون کیا کیجئے۔"

اُس کے تھوڑے دن بعد میں برنہارٹ سے ملنے دکان گیا۔

لانڈاور لوگوں کی دکان بہت زبردست تھی اور لوہے اور شیشے کی بنی ہوئی تھی۔ موزہ بنیائن، لباس، بجلی کی مشینیں، کھیل کا سامان، چاقو چھری اور اس قسم کے بہت سے حصوں میں سے گزرنے میں مجھے پورے پندرہ منٹ لگے، تب جاکے میں اُس حصے میں پہنچا جونسبتاً نچلے کا تھا۔ یہاں تھوک پر مال بیچنے اور خریدنے کے کمرے اور انجینئروں

کے کمرے تھے، اور برنہارٹ کے دفتر بھی یہیں تھے۔ دربان مجھے ایک چھوٹے سے انتظار کے کمرے میں لے گیا جس میں چاروں طرف بہت ہی روغن دار اور دھاریوں والی لکڑی لگی ہوئی تھی۔ زمین پر ایک بڑا قیمتی نیلا قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں پر صرف ایک تصویر تھی جس میں ۱۸۵۰ء کا برلن دکھایا گیا تھا۔ چند منٹ بعد برنہارٹ بھی آ گیا۔ آج صبح وہ کچھ کم عمر اور بنا ٹھنا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہلکے سے بھورے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں بو لگی ہوئی تھی۔ وہ کہنے لگا "امید ہے آپ کو یہ کمرہ پسند آیا ہوگا، چونکہ یہاں مجھے بہت سے آدمیوں کو انتظار میں بٹھاتے رکھنا پڑتا ہے اس لئے میں نے سوچا کہ انہیں کم سے کم ایسی خوشگوار فضا تو مل جائے جو ان کی بےتابی کم ہو سکے۔"

"بہت اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ اور پھر کچھ نہ کچھ کہنے کے لئے بولا — "بات یہ ہے کہ میں ذرا گڑبڑا سا رہا تھا: یہ لکڑی کس قسم کی ہے؟"

"کوہ قاف کے اخروٹ کی۔" برنہارٹ نے یہ الفاظ اپنی مخصوص متانت اور باضابطگی کے ساتھ صحیح مخرج سے ادا کئے۔ یکایک وہ مسکرانے لگا۔ میں نے سوچا کہ آج تو اس کا مزاج بہت درست معلوم ہوتا ہے۔ "آیئے دکان دیکھئے۔"

لوہے کی چیزوں والے حصے میں کام کا لباس پہنے ہوئے ایک عورت کافی بنانے کی مشین کی خوبیاں مشین چلا کر دکھا رہی تھی۔ برنہارٹ نے رک کر اس سے پوچھا کہ بکری کیسی ہو رہی ہے۔ اس عورت نے ہمیں کافی پیش کی۔ جب میں کافی پی رہا تھا تو برنہارٹ نے اس عورت کو بتایا کہ یہ لنڈن کے ایک مشہور کافی کے تاجر ہیں، اور ان کی رائے بہت صائب ہوتی ہے۔ پہلے تو اس عورت کو یقین آ گیا لیکن ہم دونوں اتنا ہنسے

کہ اُسے شبہ ہو گیا۔ پھر برنہارٹ کے ہاتھ سے پیالی گر کے ٹوٹ گئی۔ وہ گڑبڑا سا گیا اور بہت معافی مانگی۔ "کوئی بات نہیں ہے۔" عورت نے اُسے یقین دلایا، جیسے وہ کوئی معمولی نوکر ہو جسے بے ڈھنگے پن پر برخاست ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ "میرے پاس دوا اور ہیں۔"

اب ہم کھلونوں والے حصّے میں پہنچے۔ برنہارٹ نے مجھے بتایا کہ وہ اور اُس کے چچا اپنی دکان میں کھلونوں والے سپاہی یا توپیں نہیں بکنے دیتے تھے۔ ابھی حال ہی میں دکان کے ڈائریکٹروں کے جلسے میں کھلونوں والے ٹینکوں کے بارے میں بڑی گرما گرم بحث ہوئی تھی۔ اور آخر برنہارٹ نے اپنی بات منوالی تھی۔ "لیکن اسے بھی ایک قسم کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیئے۔" اُس نے ٹینک جیسے پہیّوں والی ہل چلانے کی مشین اٹھاتے ہوئے بڑے رنج کے ساتھ کہا۔

پھر اُس نے مجھے ایک کمرہ دکھایا، جو اس لئے تھا کہ مائیں سودا خرید رہی ہوں تو بچے یہاں آ کے کھیلیں۔ وردی پہنے ہوئے ایک آیا اینٹوں کا قلعہ بنانے میں دو چھوٹے چھوٹے بچّوں کی مدد کر رہی تھی۔ برنہارٹ کہنے لگا۔ "دیکھئے، یہاں انسان دوستی اور اشتہارات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس کمرے کے بالکل سامنے ہم نے بڑی ہی سستی اور دلکش ٹوپیاں رکھی ہیں۔ جو مائیں یہاں اپنے بچّوں کو لے کر آتی ہیں فوراً ترغیب کے جال میں پھنس جاتی ہیں..... آپ سوچیں گے کہ ہم لوگ بڑے مادّہ پرست ہیں....."

میں نے پوچھا کہ کتابوں کا کوئی حصّہ کیوں نہیں ہے۔

"کیونکہ ہم اس کی جرأت ہی نہیں کر سکتے۔ میرے چچا جانتے ہیں کہ اگر یہاں کتابیں ہوئیں تو میں دن بھر وہیں رہوں گا۔"

ساری دکان میں طرح طرح کی رنگین روشنیاں لگی ہوئی تھیں، لال، ہری، نیلی،

زرد۔ میں نے پوچھا کہ یہ کس لئے ہیں۔ برنہارٹ نے بتایا کہ ان میں سے ہر روشنی دکان کے کسی نہ کسی مالک کا نشان ہے۔ "میرا نشان نیلی روشنی ہے۔ شاید اس میں ایک حد تک اشاریت بھی ہے۔" میں پوچھنے ہی والا تھا کہ اس سے کیا مطلب ہے کہ اتنے میں ہم جس نیلی روشنی کی طرف دیکھ رہے تھے وہ بھڑکنے لگی۔ برنہارٹ قریب والے ٹیلیفون کے پاس پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی اُس کے دفتر میں اُس سے ملنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے جراب کا ایک جوڑا خرید لیا۔

سردیوں کے شروع میں برنہارٹ سے میری کافی ملاقاتیں رہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اتنی شامیں اکٹھے گزارنے کے بعد میں اُس سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا عجیب بات ہے کہ وہ اب بھی مجھ سے اتنا ہی دُور تھا ـــــ فانوس دار لیمپ کی روشنی میں اُس کے چہرے پر وہی تھکاوٹ اور بے حسی چھائی رہتی، وہ نیم مزاحیہ قصے سناتا رہتا اور اُس کی ملائم سی آواز اُسی طرح گونجتی رہتی۔ مثلاً وہ چند دوستوں کے ساتھ کھانے کا حال سناتا جو بہت ہی پکّے یہودی تھے۔ گفتگو کے دوران میں برنہارٹ کہتا چلا گیا تھا: "اچھا تو آج ہم دوپہر کا کھانا باغ میں کھا رہے ہیں؟ بڑا مزا رہے گا! موسم کے لحاظ سے تو آج دن خاصا گرم ہے، اور آپ کا باغ بڑا حسین معلوم ہو رہا ہے" پھر یکایک اُس نے دیکھا کہ اُس کے میزبان اُسے بڑی بُری نظروں سے گھور رہے ہیں۔ اب اُسے یاد آیا کہ آج تو تہوار ہے۔ اور یہ خیال آتے ہی وہ کانپ گیا۔

میں ہنسنے لگا۔ مجھے یہ کہانی بہت پسند آئی۔ برنہارٹ کہانیاں بڑے مزے سے

سناتا تھا۔ لیکن اس تمام عرصے میں مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہوتی رہتی تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ وہ مجھ سے بچّوں کا سا سلوک کیوں کرتا ہے؟ وہ ہم سب سے بچّوں کا سا سلوک کرتا ہے — اپنے چچا اور چچی سے، ناٹا لیا سے، مجھ سے۔ وہ ہمیں کہانیاں سناتا ہے۔ وہ ہمدردی سے بھی پیش آتا ہے اور اُس کی باتیں بڑی دلکش بھی ہیں، مگر جب وہ شراب کا گلاس یا سگرٹ دیتا ہے تو اُس کی حرکات و سکنات میں بڑی نخوت ہوتی ہے، مشرق کی سی پُر نخوت انکساری۔ وہ مجھے نہیں بتاتا کہ دل میں کیا سوچ رہا ہے، اور ساتھ ہی مجھے حقارت کی نظروں سے بھی دیکھتا ہے کہ مجھے یہ باتیں معلوم نہیں۔ اپنے بارے میں یا جو باتیں اُس کے لئے سب سے زیادہ اہم ہیں اُن کے بارے میں وہ مجھے کبھی کچھ نہیں بتائے گا۔ اور چونکہ میں اُس جیسا نہیں ہوں بلکہ اُس کے بالکل متضاد ہوں اور اگر لوگ سننا چاہیں تو میں اپنے خیالات اور احساسات بڑی خوشی سے لاکھوں آدمیوں کو سنانے کو تیار رہوں۔ اس لئے میں برنہارٹ کو کچھ تحسین کی نظروں سے بھی دیکھتا ہوں لیکن ساتھ ہی کچھ ناپسند بھی کرتا ہوں۔

جرمنی کی سیاسی حالت کے بارے میں ہم شاذونادر ہی باتیں کرتے تھے، لیکن ایک شام برنہارٹ نے مجھے خانہ جنگی کے زمانے کی ایک کہانی سنائی۔ اُس کے پاس اُس کا ایک طالب علم دوست آیا جو لڑائی میں حصہ لے رہا تھا۔ یہ شخص بڑا گھبرایا ہوا تھا اور بیٹھنے سے بھی انکار کر رہا تھا۔ اُس نے برنہارٹ سے بڑی جلدی قبول کیا کہ اُسے ایک اخبار کے دفتر پیغام لے جانے کا حکم ملا تھا جسے پولیس گھیرے پڑی تھی۔ اس دفتر تک پہنچنے کے لئے ضروری تھا کہ چھتوں پر چڑھ کے پیٹ کے بل چلا جائے کیونکہ مشین گن کی گولیوں کا خطرہ تھا

ظاہر ہے کہ اُسے جانتے ہوئے گھبراہٹ ہو رہی تھی
طالب علم ایک بہت ہی موٹا اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا۔ برنہارٹ نے اُس سے بار بار کہا کہ اسے اُتار دو کیونکہ کمرے میں خوب آگ جل رہی تھی اور اُس کے چہرے پر پسینہ بہنے لگا تھا۔ بڑی ردّ و قدح کے بعد آخر طالب علم نے کوٹ اُتار دیا۔ برنہارٹ یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ کوٹ کے اندر بہت سی جیبیں ہیں جن میں دستی بم بھرے ہوئے ہیں۔" اور خرابی کی بات یہ ہوئی۔" برنہارٹ بولا، "کہ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اور خطرے میں نہیں پڑوں گا بلکہ اوورکوٹ کو یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوٹ کو غسل خانے کی ٹب میں رکھ دے اور ٹھنڈے پانی کا نل کھول دے۔ آخر میں نے اُسے سمجھا بجھا کے راضی کیا کہ رات ہو جائے تو اسے لے جانا اور نہر میں ڈال دینا ـــ اور اُسی نے یہی کیا...... اب وہ ایک صوبے کی یونیورسٹی میں بڑا ممتاز پروفیسر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مدّت ہوئی اس سارے واقع کو بھول چکا ہے......"

"تم کبھی کمیونسٹ بھی رہے ہو، برنہارٹ۔" میں نے پوچھا۔

میں نے اُس کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ وہ فوراً مدافعت پر آمادہ ہو گیا۔ ایک لمحے کے بعد اُس نے آہستہ آہستہ کہا، "نہیں کرسٹفر، میرے بدن میں کبھی اتنی طاقت ہی نہیں ہوئی کہ مجھے پوری طرح جوش آسکے۔"

یکایک میں اُس سے کچھ چڑ سا گیا، بلکہ مجھے غصّہ سا آگیا، "جوش ہی نہیں پیدا ہوا کہ کسی بات پر ایمان لاسکو؟"

برنہارٹ میری شدّت پہ ہلکے سے مسکرا پڑا۔ شاید مجھے اس طرح ناراض کر دینے میں بھی اُسے مزا آیا ہوگا۔

"شاید....." پھر وہ اس طرح بولا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو، "نہیں.... یہ تو درست نہیں ہے....."

"تو پھر تمہیں کس چیز پر اعتقاد ہے؟" میں نے للکارا۔

برنہارٹ چند لمحے تک چپ چاپ اس پر غور کرتا رہا۔ اُس کے نرم و نازک نوک دار چہرے پر بے حسی طاری رہی اور اُس کی آنکھیں آدھی بند رہیں۔ آخر وہ کہنے لگا، "شاید مجھے نظم پر اعتقاد ہے۔"

"نظم پر؟"

"تم یہ بات سمجھے نہیں، کرسٹفر؟ میں بتاتا ہوں..... جہاں تک اپنا تعلق ہے مجھے نظم پر اعتقاد ہے۔ دوسروں کا ذمہ نہیں لیتا، جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میں تو اتنی بات جانتا ہوں کہ میرے لئے چند معیار ہونے چاہئیں جن کا میں تابع رہوں اور جن کے بغیر میں بالکل کھو سا جاتا ہوں..... کیا میں کوئی بہت خوفناک بات کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں۔" میں نے کہا، اور دل میں سوچا کہ یہ بالکل نٹالیا کی طرح ہے۔

"کرسٹفر، مجھے اتنی سختی سے نہ جانچو۔" طعن آمیز مسکراہٹ برنہارٹ کے چہرے پر پھیلتی جا رہی تھی۔ "یاد رکھو کہ میں دوغلی نسل کا ہوں۔ شاید میری آلودہ رگوں میں پروشا کے خالص خون کا ایک قطرہ ہے۔ شاید یہ چھوٹی انگلی،" اس نے اوپر روشنی میں انگلی اٹھائی، "پروشا کے کسی ڈرل سارجنٹ کی انگلی ہے..... کرسٹفر، تمہارے پس منظر میں تو اینگلو سیکسن آزادی کی صدیاں ہیں، تمہارے دل پر تو میگنا کارٹا کھدا ہوا ہے۔ تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ ہم بیچارے وحشی لوگوں کو سیدھے کھڑے رہنے

کے لئے سخت وردی کی ضرورت ہے۔"

"تم ہمیشہ میرا مذاق کیوں اُڑاتے رہتے ہو، برنہارٹ؟"

"تمہارا مذاق اُڑاتا رہتا ہوں، کرسٹفر! مجھے تو جرأت بھی نہیں ہوسکتی!" لیکن شاید اس موقع پر اُس نے مجھے اتنا کچھ بتا دیا تھا جتنا وہ چاہتا بھی نہیں تھا۔

میں بہت دن سے سوچ رہا تھا کہ ناٹالیا اور سیلی بولز کی ملاقات کرا کے دیکھوں۔ میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ ان کی ملاقات کا نتیجہ کیا ہوگا۔ بہرحال میں نے اتنی عقلمندی ضرور برتی کہ فرٹز وینڈل کو نہیں بُلایا۔

ہم نے یہ طے کیا کہ کوُرفورسٹین ڈام کے ایک فیشن ایبل کیفے میں ملیں گے۔ پہلے ناٹالیا پہنچی۔ وہ پندرہ منٹ دیر سے آئی تھی —— شاید وہ چاہتی تھی کہ دیر سے پہنچوں تاکہ سب لوگوں کی نظر میرے اُوپر پڑے۔ لیکن اُسے سیلی کی عادتوں کا پتہ ہی نہیں تھا وہ سیلی کی طرح گھنٹوں دیر سے پہنچنے کی جرأت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ بچاری ناٹالیا! اُس نے کوشش کی تھی کہ زیادہ عمر کی معلوم ہو —— اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ بڑی بدقطع معلوم ہونے لگی تھی۔ اُس نے ایک لمبا سا لباس پہنا تھا جس میں بڑی نمائشی شہریت تھی، اور جو اُسے بالکل بھلا نہیں لگتا تھا۔ اپنے سر کے ایک طرف اُس نے چھوٹی سی ٹوپی جما رکھی تھی —— جو سیلی کی خادموں جیسی ٹوپی کی غیر شعوری نقل تھی۔ لیکن ناٹالیا کے بال بہت زیادہ پھولے ہوئے اور گھونگریالے تھے، بالوں کی لہروں پہ ٹوپی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے طوفانی سمندر میں آدھی ڈوبی ہوئی کشتی۔

"میں کیسی معلوم ہو رہی ہوں؟" اُس نے کچھ ہیجانی کیفیت میں میرے مقابل بیٹھتے

ہوئے فوراً پوچھا۔

"بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہو۔"

"سچ سچ بتانا، وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی؟"

"تمہیں بہت پسند کریگی۔"

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا؟" ناٹا لیا کو غصہ آ گیا۔ "تمہیں نہیں معلوم!"

"پہلے تو تم میری رائے پوچھتی ہو، اور پھر کہتی ہو تمہیں نہیں معلوم!"

"بیوقوف! میں تعریف تھوڑی چاہتی ہوں!"

"میں سمجھ نہیں سکا کہ تم چاہتی کیا ہو۔"

"نہیں؟" ناٹالیا نے حقارت سے چیختے ہوئے کہا۔ "تم نہیں سمجھے؟ تب تو مجھے بڑا افسوس ہے۔ میرے بس کی بات نہیں!"

ٹھیک اسی وقت سیلی آ پہنچی۔

"ہلو، ڈارلنگ۔" اس نے فاختہ کی سی آواز بناتے ہوئے کہا۔ "مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں نے آنے میں دیر کر دی۔ معاف کر دوگے نا؟" وہ بڑی نزاکت سے سنبھل کے بیٹھ گئی، اور ہمیں خوشبو کے جھونکوں سے معطر کر دیا۔ نڈھال سے ہاتھوں سے وہ آہستہ آہستہ دستانے اُتارنے لگی۔ "میں آج کل ایک گندے سے بڈھے یہودی فلم ساز سے عشق لڑا رہی ہوں۔ امید ہے کہ وہ مجھے اپنی کمپنی میں رکھ لے گا، لیکن ابھی تک کام بنا نہیں......"

میں نے جلدی سے میز کے نیچے ہی نیچے سیلی کے ٹھوکر ماری، اور وہ فوراً رک گئی، اُس کے چہرے پہ مہمل سی نا امیدی جھلکنے لگی ــــ لیکن اب تو جو بات ہونی تھی وہ

ہو ہی چکی تھی۔ ناٹالیا کے چہرے پر فوراً سختی آگئی، اور وہ کچھ منجمد سی ہوگئی۔ سیلی کی ان حرکتوں کا مجھے پہلے ہی سے ڈر تھا، اور اُن کی پیشگی معذرت کے طور پر میں نے اشارتاً ناٹالیا کو آگاہ کر دیا تھا، لیکن میری ساری احتیاط بیکار گئی۔ ایک لمحے کی برفیلی خاموشی کے بعد ناٹالیا نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے وہ فرانسیسی فلم "پیرس کی چھتوں کے نیچے" دیکھی ہے۔ وہ جرمن بول رہی تھی۔ وہ سیلی کو اپنی انگریزی پر ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

لیکن سیلی ذرا نہیں شرمائی، فوراً بیچ میں بول پڑی کہ ہاں میں نے دیکھی ہے، بڑی نفیس ہے، پریژاں کی اداکاری بے نظیر ہے، اور آپ لوگوں کو وہ منظر یاد ہے جب لوگوں میں لڑائی شروع ہونے والی ہے اور پس منظر میں ٹرین گزرتی ہے؟ سیلی ہمیشہ سے زیادہ ٹوٹی پھوٹی جرمن بول رہی تھی؛ میں سوچنے لگا کہ کہیں ناٹالیا کا مذاق اُڑانے کے لئے جان بوجھ کے تو بگاڑ بگاڑ کے نہیں بول رہی۔

جتنی دیر یہ ملاقات جاری رہی میرے دماغ میں سوئیاں چبھتی رہیں۔ ناٹالیا نے مشکل سے دو چار باتیں کی ہونگی۔ سیلی اپنی اس ٹوٹی پھوٹی جرمن میں برابر بولے چلی گئی، اور اپنی دانست میں ہلکی پھلکی گفتگو کرتی رہی۔ اُس کا خاص موضوع انگلستان کی فلمی صنعت تھا۔ لیکن چونکہ ہر واقعے کے ساتھ یہ بتانا لازمی ہوتا تھا کہ فلاں عورت فلاں آدمی کی معشوقہ ہے، فلاں آدمی شراب بہت پیتا ہے اور فلاں آدمی افیم کھاتا ہے، اس لئے فضا کچھ خوشگوار نہیں رہی۔ مجھے محسوس ہوا کہ مجھے دونوں پر جھنجھلاہٹ ہو رہی ہے —— سیلی پر تو اُس کی لگاتار احمقانہ اور فحش گفتگو کی وجہ سے .... اور ناٹالیا پر اتنی حیادار بننے کی وجہ سے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے نہ جانے کتنی صدیاں گزر گئیں، اور ہوئے تھے صرف بیس منٹ۔ آخر ناٹالیا نے کہا کہ اب مجھے

چلنا چاہیئے۔

"اوہو، مجھے بھی چلنا چاہیئے!" سیلی نے انگریزی میں کہا۔ "کرس پیارے، مجھے ایڈن تک لے چلو، لے چلو گے نا؟"

میں نے اپنے مخصوص بزدلانہ انداز سے ناٹالیا کی طرف دیکھا اور اپنی بے بسی جتانی چاہی۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ یہ میری وفاداری کا امتحان ہو رہا ہے —— اور میں اس میں ناکامیاب ہو چکا تھا: ناٹالیا کے چہرے پر رحم کی جھلک تک نہیں تھی۔ اُس کا منہ چڑھا ہوا تھا۔ یقیناً اُسے بڑا غصہ آ رہا تھا۔

"اب تم سے کب ملاقات ہو گی؟" میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" ناٹالیا نے کہا —— اور اس طرح کھٹ کھٹ کرتی چل دی جیسے آئندہ ہم دونوں میں سے کسی کا منہ تک نہ دیکھنا چاہتی ہو۔

حالانکہ ہمیں دو چار سو گز ہی جانا تھا، مگر سیلی نے اصرار کیا کہ ٹیکسی لے لو۔ اُس نے کہا کہ ایڈن پیدل جانا مناسب نہیں ہو گا۔

"اُس لڑکی نے مجھے زیادہ پسند نہیں کیا، تمہارا کیا خیال ہے؟" جب ہم موٹر میں جا رہے تھے تو اُس نے پوچھا۔

"نہیں، سیلی۔ زیادہ پسند نہیں کیا۔"

"پتہ نہیں کیوں..... میری تو ایسی عادت بھی نہیں ہے، لیکن میں نے تو بڑی کوشش کی کہ اُس سے اچھی طرح پیش آؤں۔"

"اگر اسی کو تم اچھی طرح پیش آنا کہتی ہو.....!" میں اپنی جھنجھلاہٹ کے باوجود ہنس پڑا۔

"اچھا، تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے تھا؟"

"یہ پوچھو کہ تمہیں کیا نہیں کرنا چاہیئے تھا..... کیا تم زنا کے سوا کوئی اور بات کر ہی نہیں سکتیں؟"

"میں جیسی ہوں ویسی ہی تو رہوں گی، چاہے لوگ مجھ سے بات کریں یا نہ کریں" سیلی نے بڑی شان سے جواب دیا۔

"ان ناخونوں سمیت؟" میں نے دیکھا تھا کہ ناٹا لیا کی نظریں بڑی مسحور نفرت کے ساتھ بار بار اپنے ناخونوں پر پڑ رہی ہیں۔

سیلی ہنسنے لگی۔ "آج میں نے خاص طور سے اپنے ناخونوں پر پالش نہیں کیا تھا۔"

"کیوں جھوٹ بولتی ہو، سیلی! کیا واقعی تم نے ایسا ہی کیا تھا؟"

"ہاں، بالکل۔"

"لیکن اس سے فائدہ؟ میرا مطلب ہے، کوئی ـــ" میں نے تصحیح کی، "بہت کم لوگ انہیں دیکھ سکتے ہیں....."

سیلی انتہائی بے عقلی سے مسکرائی۔ "یہ تو میں جانتی ہوں، پیارے..... لیکن اس سے میں اپنے آپ کو بڑی شہوت پرست محسوس کرنے لگتی ہوں......"

اُس دن سے میرے اور ناٹا لیا کے تعلقات رُو بہ تنزّل ہو گئے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ہمارے درمیان کوئی باقاعدہ جھگڑا ہوا ہو، یا ہم نے تعلقات ختم کر دیئے ہوں۔ بلکہ دو ایک دن کے بعد ہی ہم دونوں پھر ملے، لیکن مجھے فوراً محسوس ہوا کہ ہماری دوستی کے درجۂ حرارت میں فرق آ گیا ہے۔ ہم نے ہمیشہ کی طرح آرٹ، موسیقی اور کتابوں کے بارے میں باتیں کیں،

مگر ذاتیات سے برابر بچتے رہے۔ ہم کوئی گھنٹے بھر سے باغ میں ٹہل رہے تھے کہ ناٹالیا نے دفعتاً پوچھا:

"تمہیں مس بولز بہت پسند ہیں؟" اُس کی آنکھیں سڑک پر جمی ہوئی تھیں جہاں ہر طرف پتّے ہی پتّے پڑے تھے، اور طعن آمیز انداز سے مسکرا رہی تھیں۔

"ہاں، بہت پسند ہیں..... تھوڑے ہی دن میں ہماری شادی ہونے والی ہے۔"

"احمق!"

ہم کئی منٹ تک خاموشی سے چلتے رہے۔

"تمہیں معلوم ہے،" ناٹالیا نے یکایک اس طرح کہا جیسے کوئی عجیب بات دریافت کر لی ہو، "مجھے تمہاری مس بولز پسند نہیں ہیں؟"

"مجھے معلوم ہے کہ وہ تمہیں پسند نہیں۔"

میرا لہجہ اُسے بہت ناگوار گزرا ـــــ میں چاہتا بھی یہی تھا۔ "میں کیا سوچتی ہوں کیا نہیں، اس کی تمہاری نظروں میں کوئی اہمیت نہیں ہے؟"

"ذرا بھی نہیں۔" اُسے چڑانے کے لیے میں مسکرایا۔

"بس ایک تمہاری مس بولز اہم ہیں؟"

"وہ تو بہت اہم ہیں۔"

ناٹالیا سرخ ہو گئی اور اپنا ہونٹ کاٹنے لگی۔ اُس کی خفگی بڑھتی جا رہی تھی۔ "کسی دن تم دیکھ لو گے کہ میں ٹھیک کہہ رہی تھی۔"

"ہاں، دیکھ لوں گا۔"

ناٹالیا کے گھر واپس آتے ہوئے ہم ایک لفظ بھی نہیں بولے۔ دہلیز پہ پہنچ کے اُس

نے حسبِ معمول کہا، "کسی دن فون کرنا.....،" پھر تھوڑا اسا رُک کے آخری چوٹ کی" اگر تمہاری مس بولنہ اجازت دے دیں۔"

میں ہنسنے لگا۔ "چاہے وہ اجازت دیں یا نہ دیں میں تمہیں بڑی جلدی فون کرونگا۔"

میں نے اپنی بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ ناٹالیا نے دروازہ بند کر دیا۔

بہرحال میں نے اپنے وعدے کی پابندی نہیں کی۔ کہیں مہینے بھر بعد جا کے میں نے فون پر ناٹالیا کا نمبر ملایا۔ یوں تو میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا، مگر اُس سے دوبارہ ملنے کی خواہش پر میری نارضامندی ہمیشہ غالب آگئی۔ اور جب آخر ہماری ملاقات ہوئی تو درجۂ حرارت بہت کافی کم ہو چکا تھا۔ اب تو ہم محض ملاقاتی معلوم ہوتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ناٹالیا کو یقین ہے سیلی میری معشوقہ بن گئی ہے' اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر میں اُس کی غلط فہمی کیوں کر دور کر دوں —— اس میں تو بڑی لمبی چوڑی اور پُرخلوص گفتگو کی ضرورت پڑتی جس کے لیے میری طبیعت حاضر نہیں تھی۔ غالباً اس تمام تصریح کے بعد بھی ناٹالیا کی نفرت ویسی کی ویسی ہی رہتی جیسی اب تھی، اور اس کا حسد بڑھ جاتا۔ میں یہ سمجھ کر اپنا دل نہیں خوش کر رہا تھا کہ ناٹالیا مجھے اپنا عاشق بنانا چاہتی تھی، لیکن وہ مجھ سے تیز طرار بڑی بہن کا سا سلوک کرنے لگی تھی' اور عجیب مہمل سی بات ہے کہ سیلی نے اُس کی یہی حیثیت چھین لی تھی۔ مجھے ناٹالیا پر رحم تو آیا، مگر میں نے فی الجملہ یہی فیصلہ کیا کہ بات جس طرح چل رہی ہے اُسی طرح ٹھیک ہے۔ چنانچہ میں ناٹالیا کے بالواسطہ سوالوں اور ڈھکے چھپے الزاموں کو اور تقویت پہنچاتا رہا، بلکہ میں نے اشاروں اشاروں میں یہ بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ سیلی کے ساتھ میری زندگی بڑے مزے سے گزرتی ہے: جیسے "سیلی اور میں آج صبح ناشتہ کر رہے تھے.....،" یا "تمہیں یہ ٹائی پسند آئی؟ سیلی نے انتخاب کی تھی۔"

بچاری ناٹالیا میری باتیں بڑی مغموم سی شکل بنائے خاموشی کے ساتھ سنتی رہتی، اور جیسا پہلے اکثر ہو چکا تھا، میں اپنے آپ کو بڑا مجرم اور بے رحم محسوس کرنے لگتا. ہمارے درمیان دو ملاقاتیں اور ہوئیں اور دونوں بالکل ناکامیاب. پھر فروری کے آخر میں میں نے اُس کے گھر فون کیا تو معلوم ہؤا کہ وہ جرمنی سے چلی گئی ہے.

برن ہارٹ سے بھی میں کچھ دنوں سے نہیں ملا تھا. ایک دن صبح کو فون پر اُس کی آواز سُن کے مجھے بڑا تعجب ہؤا. اُس نے پوچھا کہ تم آج شام میرے ساتھ دیہات چل سکتے ہو، رات کو بھی وہیں رہیں گے. یہ بات بڑی پُراسرار معلوم ہوئی، اور جب میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ہمیں کہاں جانا ہے اور کیوں، تو برن ہارٹ صرف ہنس دیا.

آٹھ بجے کے قریب برن ہارٹ ایک بڑی سی بند موٹر میں جسے شوفر چلا رہا تھا، مجھ سے ملنے آیا. برن ہارٹ نے بتایا کہ یہ کار دکان کی ہے. وہ اور اُس کے چچا دونوں اسے استعمال کرتے تھے. میں نے سوچا کہ لانڈاور لوگ جس انتہائی سادگی کے ساتھ رہتے ہیں اُس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اُن کے پاس کوئی ذاتی کار بھی نہیں ہے، بلکہ برن ہارٹ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کار کی موجودگی کی بھی معذرت کر رہا ہو. یہ عجیب پیچیدہ سادگی تھی — نفی کی بھی نفی. اس کی جڑیں ملکیت کے خوفناک جرم میں بہت گہری پہنچتی تھیں. میں نے ٹھنڈا سا سانس لے کے دل ہی دل میں کہا، میں کبھی ان لوگوں کی تہ کو پہنچوں گا یا نہیں، کبھی انہیں سمجھ سکوں گا یا نہیں؟ لانڈاور لوگوں کی نفسیاتی ساخت کے بارے میں سوچنے ہی سے ہمیشہ کی طرح، میرے اوپر شکست اور خستگی کا احساس طاری ہو گیا.

"کچھ تھکے ہوئے ہو؟" برن ہارٹ نے بالکل میرے پاس بیٹھے ہوئے فکرمند آواز

میں کہا۔

"نہیں تو۔۔۔۔" میں سیدھا ہو بیٹھا۔ "ذرا بھی نہیں۔"

"تم اجازت دو تو پہلے ایک دوست کے یہاں ہولیں۔ ہمارے ساتھ ایک اور صاحب چل رہے ہیں۔۔۔۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" میں نے خوش اخلاقی برتتے ہوئے کہا۔

"بڑے خاموش طبع ہیں۔ ہمارے خاندان کے پرانے دوست ہیں۔" نہ معلوم کیوں، معلوم ہوتا تھا برن ہارٹ کو بڑا مزا آرہا ہے۔ وہ اپنے آپ ہی اپنے آپ مسکرا رہا تھا۔ موٹر فاسانن اسٹرا سے میں ایک کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ برن ہارٹ نے گھنٹی بجائی دروازہ کھلا اور وہ اندر چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ بازوؤں میں ایک کتا لئے باہر نکلا۔ میں ہنسنے لگا۔

"تم بے انتہا خوش اخلاقی برت رہے تھے۔" برنہارٹ نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن میں تاڑ گیا کہ تم کچھ بے چین سے ہو رہے ہو۔۔۔۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟"

"شاید۔۔۔۔"

"مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ تمہیں کس کے ساتھ چلنے کی امید تھی؟ شاید کسی بیزار کن بڈھے کی؟" برنہارٹ نے کتے کو تھپکا۔ "لیکن کرسٹفر، تم اتنے خوش اخلاق ہو کہ اب قبولوگ تھوڑے ہی۔"

کار ہلکی پڑی، اور رایوس جانے والی سڑک کی چنگی کے سامنے رک گئی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "میں چاہتا ہوں کہ مجھے بتا دو!"

برن ہارٹ اپنے ملائم مشرقی انداز میں مسکرایا۔ "میں بہت پُراسرار ہوں کیوں ہوں نا؟"

"بہت۔"

"یوں رات کو موٹر میں سفر کرنا، اور وہ بھی اس طرح کہ پتہ نہیں جا کہاں رہے ہو، تمہارے لئے بڑا عجیب و غریب تجربہ ہو گا؟ اگر میں تمہیں بتا دوں کہ ہم پیرس یا میڈرڈ یا ماسکو جا رہے ہیں تو پھر اسرار باقی نہیں رہے گا، اور تمہارا آدھا لطف ختم ہو جائے گا...... تمہیں معلوم ہے، کرسٹفر، کہ مجھے تم پر بڑا رشک ہے کیونکہ تم جانتے ہی نہیں کہ جا کہاں رہے ہو؟"

"ہاں یقیناً، بات کا ایک پہلو یہ بھی ہے..... مگر بہرحال مجھے معلوم ہے کہ ہم ماسکو نہیں جا رہے ہیں۔ ہم بالکل مخالف سمت میں سفر کر رہے ہیں۔"

برن ہارٹ ہنسنے لگا۔ "بعض دفعہ تم بالکل انگریز بن جاتے ہو، کرسٹفر۔ تمہیں کبھی اس کا احساس بھی ہوتا ہے؟"

"تمہاری وجہ سے میرا انگریز والا عنصر اُبھر آتا ہے۔" میں نے جواب دیا، اور فوراً مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی جیسے یہ جملہ توہین آمیز ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ برنہارٹ کو بھی اس خیال کا احساس ہو گیا۔

"میں اسے تعریف سمجھوں، یا تادیب؟"

"ہاں، تعریف۔"

موٹر سیاہ ایوس کے کنارے کنارے موسم سرما کے اس اندھیرے میں جنگل میں اُڑی چلی جا رہی تھی۔ سڑک کے بڑے بڑے نشان موٹر کی روشنی سے ایک لمحے کے لئے چمک اُٹھتے اور بجھتی ہوئی دیا سلائیوں کی طرح ختم ہو جاتے۔ برلن ہمارے پیچھے آسمان میں ایک لال سا دھبہ رہ گیا تھا، اور صنوبر کے جنگل کے پیچھے غائب ہوتا چلا جا رہا تھا، اور جنگل جھکتا چلا آ رہا تھا۔

لائٹ ہاؤس کی سرچ لائٹ اِدھر سے اُدھر گھوم رہی تھی۔ سیدھی سیاہ سڑک ہم سے ملنے دھاڑتی ہوئی بھاگی چلی آرہی تھی جیسے مر جانا چاہتی ہو۔ کار کی گدّے دار تاریکی میں برنہارٹ بے چین کتے کو اپنے گھٹنے پر بٹھلائے تھپک رہا تھا۔

"اچھا، میں بتاتا ہوں۔ ہم وانسی کے کنارے ایک جگہ جا رہے ہیں جو میرے والد کی ملکیت تھی۔ یہاں ایک بنگلہ ہے۔"

"بنگلہ؟ بہت خوب....."

میرے لہجے سے برن ہارٹ نے بڑا لطف اٹھایا۔ اُس کی آواز سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

"امید ہے کہ تم وہاں بے آرام نہیں ہوگے؟"

"مجھے تو یقیناً یہ جگہ بہت پسند آئے گی۔"

"شروع شروع میں کچھ پرانے فیشن کی سی تو معلوم ہوگی....." برن ہارٹ دل ہی دل میں ہنسا۔ "بہرحال ہے مزے دار۔"

"ضرور ہوگی۔"

شاید مجھے کچھ مبہم سی امید تھی ہوٹل ہوگا، روشنیاں ہوں گی، موسیقی ہوگی اور بہت عمدہ کھانا ہوگا۔ اب میں بڑی تلخی سے غور کرنے لگا کہ صرف ایک انحطاط پذیر اور بہت زیادہ تہذیب یافتہ اور امیر شہری ہی رات کو جا کے ایسی سردی میں ایک نم آلود اور گھٹے ہوئے بنگلے میں ٹھہرنے کو "لطف انگیز" کہہ سکتا ہے۔ اور یہ کیسی ٹھیٹ بات تھی کہ وہ مجھے بڑی شاندار موٹر میں بٹھا کے لایا تھا! شوفر کہاں سوئے گا؟ شاید پولش ڈرام کے کسی بہترین ہوٹل میں..... جب ایڈیس کے دوسرے کنارے پر ہم جنگی کی روشنیوں کے پاس سے گزرے

تو میں نے دیکھا کہ برنہارٹ اب بھی اپنے آپ ہی اپنے آپ مسکراتے چلا جا رہا ہے۔

کار داہنی طرف مڑی اور نیچے اُترنے لگی۔ سڑک کے دونوں طرف کالے کالے درخت کھڑے تھے۔ ہمارے بائیں طرف جنگل کے پیچھے ایک بڑی سی جھیل تھی جو دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر ہمیں اُس کے قرب کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ سڑک ختم ہو گئی اور ہم ایک پھاٹک میں سے گزرتے ہوئے بنگلے کی سڑک پر چل رہے ہیں۔ یکایک ہماری موٹر ایک بڑے سے بنگلے کے دروازے پر رُکی۔

"ہم کہاں آ گئے؟" میں نے برنہارٹ سے پوچھا۔ میرا دماغ ایسا الجھ سا رہا تھا کہ میں سمجھا کسی اور کو لینا ہے ـــــ شاید کسی اور کتّے کو۔ برن ہارٹ کھلکھلا کے ہنس پڑا۔

"ہم اپنی منزل پہ پہنچ گئے ہیں، پیارے کرسٹفر! باہر نکل آؤ!"

دھاریوں دار جیکٹ پہنے ہوئے ایک خادم نے آ کے دروازہ کھولا۔ کُتّا کود کے باہر نکل گیا اور اُس کے پیچھے پیچھے برنہارٹ اور میں باہر نکل آئے۔ میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے وہ مجھے ہال میں اور پھر زینے کے اُوپر لے گیا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا بڑا قیمتی قالین بچھا ہوا ہے اور دیواروں پر چوکھٹوں میں تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ اُس نے ایک بڑے نفیس سونے کے کمرے کا دروازہ کھولا جس کی دیواروں کا رنگ سفید اور گلابی تھا، اور مسہری پر پروں کا بڑا گُدگُدا اور عشرت انگیز بستر بچھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ایک غسل خانہ تھا جس میں چاندی کی چیزیں چمک رہی تھیں اور سفید سفید روئیں دار تولیے لٹکے ہوئے تھے۔

برن ہارٹ مسکرانے لگا۔ "بچارا کرسٹفر! شاید تمہیں ہمارا بنگلہ دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ شاید تمہارے خیال میں یہ بنگلہ بہت بڑا ہے، بہت فوق البھڑک ہے؟ تمہیں،

امید تھی کہ فرش پر رینگتے ہوئے کیڑوں کے درمیان سوؤ گے؟"

اس مذاق کی فضا کھانے کے دوران میں بھی ہمارا احاطہ کیے رہی۔ ہر دفعہ جب ملازم چاندی کی رکابی میں کوئی کھانا لاتا تو برن ہارٹ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتا اور حقارت آمیز انداز سے مسکراتا۔ کھانے کا کمرہ سترھویں صدی کے انداز کا، بڑا شائستہ بے رنگ اور پھیکا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ بنگلہ کب بنا تھا۔

"۱۹۰۴ء میں میرے والد نے یہ مکان بنوایا تھا۔ میری والدہ کے خیال سے وہ چاہتے تھے کہ اسے بالکل انگریزی گھر کے نمونے کا بنوائیں....."

کھانا کھانے کے بعد ہم اندھیرے میں جا کے باغ میں ٹہلنے لگے۔ پانی کی طرف سے درختوں میں ہوتی ہوئی بڑی تیز ہوا آ رہی تھی۔ میں برن ہارٹ کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا، اور بار بار کتے سے ٹکرا جاتا تھا جو میری ٹانگوں میں گھسا جا رہا تھا۔ پتھر کی سیڑھیاں طے کر کے ہم ایک چھوٹے سے گھاٹ پہ پہنچے۔ اندھیری جھیل میں یہاں سے وہاں تک لہریں ہی لہریں تھیں، اور اُس پار پوش ڈام کی طرف ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں بکھری ہوئی تھیں جن کا عکس سیاہ پانی میں دُم دار ستارے کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ منڈیر پر گیس کے ٹوٹے ہوئے لیمپ کا خانہ ہوا میں کھڑکھڑا رہا تھا، اور ہمارے قدموں کے نیچے لہریں نظر نہ آنے والے پتھروں سے ٹکرا رہی تھیں، اور اُن کی آواز بڑی ملائم، بھیگی بھیگی اور پراسرار تھی۔

"جب میں لڑکا سا تھا تو جاڑوں میں شام کو سیڑھیوں پر سے اُتر کے یہاں آ جاتا تھا اور گھنٹوں کھڑا رہتا تھا....." برن ہارٹ نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کی آواز اتنی نیچی تھی کہ مشکل سے سنائی دے رہی تھی۔ اُس کا چہرہ اندھیرے میں میری طرف سے مڑا ہوا تھا اور جھیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب ہوا کا کوئی زور کا جھونکا آ جاتا تو اُس کے الفاظ

زیادہ صاف سنائی دینے لگتے ــــــ جیسے خود ہوا بول رہی ہو۔ "یہ جنگ کے زمانے کا ذکر ہے..... میرے بڑے بھائی لڑائی کے شروع ہی میں مارے گئے تھے..... کچھ دن بعد بعض آدمی جو کاروبار میں میرے والد کے رقیب تھے اُن کے خلاف پروپیگنڈا کرنے لگے کیونکہ اُن کی بیوی انگریز تھیں۔ چنانچہ کوئی ہم سے ملنے ہی نہیں آتا تھا، اور یہ افواہ گرم تھی کہ ہم لوگ جاسوس ہیں۔ آخر کار یہاں تک بات پہنچ گئی کہ مقامی تاجر بھی ہمارے یہاں نہیں آنا چاہتے تھے..... یہ بڑی مضحکہ خیز بات تھی اور ساتھ ہی بڑی خوفناک بھی کہ انسانوں میں اتنا بُغض بھی ہوتا ہے.....“

پانی کے اُوپر جھک کے دیکھتے دیکھتے میں کانپ گیا۔ سردی بڑی سخت تھی۔ برنہارڈ کی ملائم اور محتاط آواز میرے کان میں کہے جا رہی تھی: "اُس زمانے میں سردی کے باوجود میں شام کو یہاں آکے کھڑا ہو جایا کرتا تھا اور دل میں سوچا کرتا تھا کہ میں آخری انسان ہوں جو دنیا میں زندہ بچا ہے..... میں عجیب قسم کا لڑکا تھا..... حالانکہ میرا دل بہت چاہتا تھا کہ میں ہر دلعزیز ہو جاؤں اور میرے بہت سے دوست ہوں، لیکن میری لڑکوں سے کبھی نہیں بنی۔ غالباً اس میں میری کوئی غلطی نہیں تھی۔ میں دوستی کرنے کو بے چین رہتا تھا۔ لڑکوں نے یہ بات سمجھ لی تھی اور اس لیے وہ مجھ سے بے رحمی سے پیش آتے تھے۔ معروضی اعتبار سے تو میں یہ بات سمجھ سکتا ہوں..... ممکن ہے کہ حالات دوسرے ہوتے تو میں بھی اتنے ہی ظلم اور بے رحمی سے پیش آتا۔ ٹھیک طرح سے کچھ کہنا مشکل ہے..... لیکن اُس زمانے میں میری جو حالت تھی اُس میں اسکول مجھے چینی قسم کی ایذا رسانی معلوم ہوتا تھا..... چنانچہ تم سمجھ ہی سکتے ہو کہ رات کو جھیل کے پاس آکے اکیلے کھڑا ہونا مجھے کتنا پسند ہوگا۔ اور پھر جنگ بھی جاری تھی..... اُس زمانے میں میں سوچا کرتا تھا کہ جنگ

دس یا پندرہ سال، بلکہ بیس سال چلے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ خود مجھے بھی جبریہ بھرتی ہونا پڑیگا۔ عجیب بات ہے، مجھے یہ یاد نہیں پڑتا کہ مجھے کبھی ڈر لگا ہو۔ میں نے ان حالات کو قبول کر لیا تھا۔ یہ بات بالکل فطری معلوم ہوتی تھی کہ ہم سب کو مرنا پڑے گا۔ غالباً جنگ کے زمانے میں عام ذہنیت یہی تھی۔ لیکن اپنے بارے میں تو میرا خیال ہے کہ میرے اندازِ نظر میں ایک سامی خصوصیت ضرور تھی...... ان چیزوں کے بارے میں قطعی غیر جانب داری سے باتیں کرنا بڑا مشکل ہے۔ بعض دفعہ آدمی بعض باتیں اپنے آپ سے قبولنا نہیں چاہتا، کیونکہ وہ آدمی کی عزتِ نفس کے لئے ناخوشگوار ہوتی ہیں......"

ہم آہستہ آہستہ مڑے اور باغ سے جو ڈھلان جھیل تک آتا تھا اُس پہ چڑھنے لگے۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں مجھے کُتّے کے ہانپنے کی آواز سنائی دیتی تھی جو اندھیرے میں شکار تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ برنہاوٹ کی آواز ہچکچاتے ہوئے اپنے لفظوں کا انتخاب کرتے ہوئے، اُسی طرح برابر آئے جا رہی تھی:

"میرے بڑے بھائی کے مرنے کے بعد میری والدہ اس مکان سے کہیں نہیں جاتی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ بھول جانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ دنیا میں کوئی جرمنی جیسا ملک بھی ہے۔ وہ عبرانی پڑھنے لگیں، اور اپنی پوری توجہ قدیم یہودی تاریخ اور ادب پر صرف کر دی۔ میرے خیال میں یہودیوں کے نشو و نما میں یہ ایک نئے دور کی علامت ہے ۔۔۔ یعنی اس طرح یورپ کے کلچر اور روایتوں سے پھر جانا۔ مجھے بعض دفعہ خود اپنے اندر بھی اس کا احساس ہوا کرتا ہے...... مجھے یاد ہے کہ میری والدہ سارے گھر میں اس طرح پھرا کرتی تھیں جیسے کوئی آدمی سوتے میں چل رہا ہو۔ اپنے مطالعے سے اُنہیں ایک منٹ کے لئے ہٹنا بھی ناگوار تھا، اور یہ بڑی خوفناک چیز تھی، کیونکہ اس

عرصے میں سرطان اُنہیں گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا...... تب انہیں پتہ چلا کہ اصل بات کیا ہے تو انہوں نے ڈاکٹر کو دکھانے سے انکار کر دیا۔ انہیں آپریشن سے ڈر لگتا تھا... آخر جب درد بہت بڑھ گیا تو انہوں نے خودکشی کر لی......"

اب ہم مکان پہنچ گئے تھے۔ برن ہارٹ نے ایک شیشے کا دروازہ کھولا، اور ہم ایک چھوٹے سے پورچ میں سے ہوتے ہوئے ایک بہت بڑے ڈرائنگ روم میں جا پہنچے۔ انگریزی قسم کے آتش دان میں آگ جل رہی تھی اور اُس کے سائے کمرے میں اُچھلتے پھر رہے تھے۔ برنہارٹ نے بہت سے لیمپ روشن کر دیئے، جس سے کمرہ ایسا چمک اٹھا کہ آنکھوں میں چکا چوند ہونے لگی۔

"اتنی روشنی کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے پوچھا۔ "میرے خیال میں تو آتشدان کی روشنی ہی اچھی معلوم ہو رہی ہے۔"

"اچھا؟" برن ہارٹ نکتہ سنجی کے سے انداز میں مسکرایا۔

"مجھے بھی وہی اچھی لگتی ہے۔ لیکن میں نے سوچا کہ شاید تمہیں لیمپوں کی روشنی پسند ہو۔"

"آخر کیوں؟" مجھے فوراً اُس کے لہجے سے بدگمانی پیدا ہوئی۔

"پتہ نہیں۔ میں نے تمہارے کردار کا جو تصوّر قائم کر رکھا ہے یہ بھی اُسی کا ایک حصّہ ہے۔ میں بھی کیسا بے وقوف ہوں!"

برنہارٹ کی آواز میں تمسخر تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اُٹھا اور سارے لیمپ بجھا دیئے، بس میرے قریب میز پہ ایک لیمپ جلتا رہنے دیا۔ بڑی دیر تک خاموشی رہی۔

"ریڈیو سنو گے؟"

اس دفعہ مجھے اُس کے لہجے پر ہنسی آ گئی: "میری خاطر مدارات کرنے کی کیا ضرورت ہے! میں آگ کے قریب بڑے مزے سے بیٹھا ہوں۔"

"مزے میں بیٹھے ہو تو پھر ٹھیک ہے..... میری بیوقوفی دیکھو، میں نے اس سے بالکل مختلف رائے قائم کی تھی۔"

"کیا معنی؟"

"مجھے ڈر تھا کہ تمہیں کوفت ہو رہی ہے۔"

"بالکل نہیں! قطعاً غلط ہے!"

"تم بڑے خوش اخلاق ہو، کرسٹفر۔ تم ہمیشہ خوش اخلاقی سے کام لیتے ہو۔ لیکن میں تمہارے چہرے سے صاف پتہ چلا سکتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو....." برنہارٹ کی آواز کا یہ انداز میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے لہجے میں بڑی معاندت تھی۔

"تم یہ تعجب کر رہے ہو کہ میں تمہیں اس مکان میں کیوں لایا۔ سب سے زیادہ تمہیں اس پر تعجب ہے کہ میں نے ابھی تم سے جو بات کہی ہے وہ کیوں کہی۔"

"مجھے تو خوشی ہے کہ تم نے یہ بات مجھ سے کہہ دی....."

"نہیں، کرسٹفر۔ یہ درست نہیں ہے۔ تمہیں یہ بات سن کر دھکا سا لگا ہے۔ تم سوچ رہے ہو کہ ایسی باتیں کہی نہیں جایا کرتیں۔ اس یہودی جذباتیت سے تمہیں نفرت پیدا ہوتی ہے، آخر تمہاری تربیت انگلستان کے پبلک اسکول میں ہوئی ہے نا! تم یہ سوچ سوچ کر اپنا دل خوش کرتے رہتے ہو کہ میں دنیا دار آدمی ہوں اور کسی قسم کی کمزوری مجھے ناگوار نہیں گزرتی، لیکن تمہاری تربیت تمہارے بس کی چیز تھوڑی ہے، اس کو کیا کرو؟

تم محسوس کرتے ہو کہ لوگوں کو آپس میں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ شائستگی کے خلاف ہے؟"

"برن ہارٹ، تمہارا تخیل بڑے زوروں پہ ہے!"

"واقعی؟ شاید ایسا ہی ہو..... لیکن میں تو نہیں سمجھتا۔ خیر کوئی پروا نہیں...... تم جاننا ہی چاہتے ہو تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں تمہیں کیوں لایا..... میں ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا۔"

"تجربہ؟ تمہارا مطلب ہے، مجھ پر؟"

"نہیں۔ خود اپنے اُوپر تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ..... دس سال سے میں نے کسی آدمی سے اتنی بے تکلفی کے ساتھ باتیں نہیں کی ہیں جیسی آج رات تم سے کی ہیں..... پتہ نہیں تم اپنے آپ کو میری جگہ رکھ کے سوچ بھی سکتے ہو یا نہیں۔ ذرا تصوّر تو کرو اس کے کیا معنی ہیں؟ اور آج شام..... غالباً اس بات کی تصریح بالکل ناممکن ہے...... اچھا، دوسرے طریقے سے سمجھاتا ہوں۔ میں تمہیں اس مکان میں لے کے آتا ہوں جس سے تمہاری کوئی یاد وابستہ نہیں ہے۔ ماضی تمہیں تنگ نہیں کرتا، اور نہ تمہارے پاس اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔ پھر میں تمہیں اپنی کہانی سناتا ہوں..... ممکن ہے کہ اس طرح ماضی کے بھوتوں کو اپنے سر سے اُتارا جا سکے... میں اپنا مطلب ٹھیک طرح سمجھا نہیں سکتا، میرا پیرایۂ بیان بڑا خراب ہے۔ کیا میری باتیں بہت مہمل معلوم ہوتی ہیں؟"

"نہیں۔ ذرا بھی نہیں..... لیکن اپنے تجربے کے لئے تم نے مجھ ہی کو کیوں چھانٹا؟"

"کرسٹفر، جب تم نے یہ بات کہی ہے تو تمہاری آواز بڑی سخت تھی۔ تم سوچ رہے ہو کہ تم مجھے حقیر سمجھتے ہو۔"

"نہیں برن ہارٹ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ تم مجھے حقیر سمجھ رہے ہو گے ..... میں اکثر تعجب کیا کرتا ہوں کہ نہ معلوم تم مجھ سے کیوں ملتے جلتے ہو۔ بعض دفعہ تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تم واقعی مجھے ناپسند کرتے ہو، اور اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرنے کے لئے ایسی باتیں کرتے اور کہتے ہو ـــــ مگر پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ ایک طرح تم مجھے ناپسند بھی نہیں کرتے، ورنہ مجھ سے آکے ملنے کو نہ کہتے رہتے ...... بہرصورت میں اب تمہاری ان باتوں سے تھک چلا ہوں جنہیں تم تجربے کہتے ہو۔ آج والا تجربہ کوئی پہلا تجربہ تھوڑئی تھا۔ تمہارے تجربے ناکامیاب ہو جاتے ہیں، اور پھر تمہیں میرے اُوپر غصہ آجاتا ہے میرے خیال میں تو یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے ..... لیکن ایک بات میں برداشت نہیں کرسکتا، وہ یہ کہ تم اپنی خفگی کا اظہار کرنے کے لئے یہ مصنوعی انکسار کا انداز اختیار کر لیتے ہو ..... اور حقیقت یہ ہے کہ منکسر مزاجی سے تمہیں دور کا بھی واسطہ نہیں"

برن ہارٹ خاموش رہا۔ اُس نے سگرٹ جلا لی تھی اور ناک سے آہستہ آہستہ دھوآں نکال رہا تھا۔ آخر کار وہ کہنے لگا: "مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ کہیں تمہاری بات ٹھیک ہی تو نہیں ..... میرا خیال ہے کہ پوری طرح ٹھیک نہیں؛ البتہ تھوڑی سی ٹھیک ضرور ہے ..... تمہارے اندر کوئی ایسی صفت ہے جو میرا دل اپنی طرف کھینچتی ہے اور جس کی وجہ سے مجھے تمہارے اُوپر رشک آتا ہے۔ مگر تمہاری یہی صفت میرے اندر تمہاری طرف سے مخالفت کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہے ..... شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بھی تھوڑا سا انگریز ہوں، اور تم خود میرے کردار کے ایک پہلو کی نمائندگی کرتے ہو ..... نہیں، یہ بات بھی ٹھیک نہیں ہے ..... معاملہ اتنا آسان اور سیدھا سادا نہیں ہے جتنا میں چاہتا ہوں ......" برن ہارٹ نے بڑی تھکن کے ساتھ مزاحیہ انداز

میں نے اپنے ماتھے اور آنکھوں پر ہاتھ پھیرا۔ "میری فطرت بھی بڑی پیچیدہ ہے اور وہ بھی بالکل بے ضرورت۔"

ذرا سی دیر خاموشی رہی۔ پھر وہ بولا: "میں بھی کیا احمقانہ اور خود پرستانہ باتیں کر رہا ہوں۔ معاف کرنا۔ مجھے تم سے ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا، ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتا ہوا کمرے کے دوسری طرف گیا، اور ریڈیو کھول دیا۔ اُٹھتے ہوئے اُس نے ایک لمحے کے لئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ریڈیو پر موسیقی شروع ہوگئی، اور وہ مسکراتا ہوا آکے آگ کے قریب کرسی پہ بیٹھ گیا۔ اُس کی مسکراہٹ بڑی ملائم تھی، مگر ایک عجیب سی معاندت لئے ہوئے۔ یہ معاندت کچھ ایسی تھی جیسے کسی بہت ہی قدیم چیز کی۔ میری نظروں میں اس مکان کا ایک چھوٹا سا مشرقی مجسّمہ پھرنے لگا۔

"آج شام ریڈیو والے "ڈی مائسٹر سانگر" کا آخری ایکٹ ریلے کر رہے ہیں۔"

وہ ملائم سے انداز میں مسکرایا۔

"بڑی دلچسپ چیز ہے،" میں نے کہا۔

آدھ گھنٹے بعد برن ہارٹ مجھے میرے سونے کے کمرے کے دروازے تک لے گیا۔ اُس کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا، اور وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اگلے دن صبح کو ناشتے کے وقت وہ تھکا ہوا سا معلوم ہوتا تھا، لیکن تھا بڑا خوش خوش، اور اُس کی باتیں بھی بڑی پُر لطف تھیں۔ اُس نے کل شام والی گفتگو کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ ہم برلن واپس آگئے، اور اُس نے مجھے نولن ڈورف پلاٹز کے نکڑ پر اُتار دیا۔

"مجھے جلدی ہی فون کرنا۔" میں نے کہا۔
"ضرور۔ اگلے ہفتے کے شروع ہی میں کروں گا۔"
"تمہارا بہت شکریہ۔"
"تمہارے آنے کا بہت بہت شکریہ، پیارے کرسٹفر۔"

اس کے بعد کوئی چھ مہینے تک اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔
شروع اگست کا ذکر ہے کہ ایک دن اتوار کو بریونٹگ حکومت کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے عوام سے استصواب رائے ہوا۔ میں فراؤلین شریڈر کے یہاں واپس آگیا تھا، اور ایسے حسین گرم موسم کے باوجود بستر پر پڑا اپنے پیر کے انگوٹھے کو کوس رہا تھا۔ ریوگن میں آخری دفعہ نہاتے ہوئے میرا انگوٹھا ٹین کے ٹکڑے سے کٹ گیا تھا اب یہ زخم یکایک پک گیا تھا اور اس میں زہر پھیل گیا تھا۔ اس دن برن ہارٹ نے بالکل غیر متوقع طور پر مجھے فون کیا تو میں بڑا خوش ہوا۔
"تمہیں وان سی کے کنارے ایک چھوٹا سا بنگلہ یاد ہے؟ اچھا، یاد ہے؟ میں سوچ رہا تھا کہ تم آج تیسرے پہر کو دو چار گھنٹے کے لئے وہاں چلو گے یا نہیں...... ہاں تمہاری مکان دارنی نے ابھی بتایا ہے کہ تمہارے انگوٹھے میں تکلیف ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہے...... میں تمہارے لئے کار بھیج سکتا ہوں۔ اس شہر سے تھوڑی دیر کے لئے چھٹکارا تو ملے گا۔ مزا رہے گا نا؟ تم جو چاہو کرنا — چپ چاپ لیٹے آرام کرتے رہنا۔ تمہاری آزادی میں کوئی مخل نہیں ہوگا۔"
دوپہر کے کھانے کے ذرا سی دیر بعد ہی موٹر مجھے لینے آگئی۔ تیسرے پہر کا موسم

بڑا شاندار تھا، اور کار میں سفر کرتے ہوئے میں برن ہارٹ کو دعائیں دے رہا تھا کہ اُس نے مجھ پر اتنی عنایت کی. لیکن جب ہم بنگلے پہنچے تو مجھے بڑا دھکا سا لگا ـــــ باہر میدان میں لوگ بھرے ہوئے تھے.

میں واقعی چڑچڑا سا گیا. میں نے سوچا کہ برن ہارٹ نے مجھ سے بڑا دھوکا کیا ہے میں اپنے سب سے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا، اور میرے ایک پیر میں پٹی بندھی ہوئی تھی اور چھڑی ٹیک ٹیک کر چل رہا تھا. اور ایسی حالت میں بہلا پھُسلا کے وہ مجھے ایسی فیشن ایبل دعوت میں گھسیٹ لایا تھا! اتنے میں مجھے برن ہارٹ نظر آیا، اُس نے فلالین کا پتلون اور لڑکوں کی سی قمیص پہن رکھی تھی. یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ وہ بڑا جوان معلوم ہو رہا ہے. لوہے کی نیچی سی ٹٹی پھلانگ کے وہ اچھلتا ہوا مجھ سے ملنے آیا: "کرسٹفر! آخر تم آگئے! آؤ آرام سے بیٹھو!"

میرے احتجاج کے باوجود اُس نے میرا کوٹ اور ہیٹ زبردستی اُتار دیا. بدقسمتی دیکھئے کہ میں نے گیلس لگا رکھی تھی. زیادہ تر مہمان فلالین کے ردبرا کے ساحل والے بڑے شاندار پتلون پہنے ہوئے تھے. میں جبلّی طور پر کچھ تیکھا اور سنکی سا بن گیا. ایسے موقعوں پر یہ انداز میرے لئے زرہ بکتر کا کام دیتا ہے ـــــ اور میں ایک پیر پر اچھلتا ہوا اُن لوگوں کے درمیان پہنچا. گراموفون بج رہا تھا، اور اُس کی آواز پر کئی جوڑے ناچ رہے تھے. دو نوجوان گدّوں سے لڑ رہے تھے، اور ان سے متعلق عورتیں اُن کی ہمت افزائی کر رہی تھیں. زیادہ تر لوگ گھاس پر کمبل بچھاتے لیٹے تھے اور گپ اڑا رہے تھے. ماحول بڑی بے تکلفی کا تھا، اور خادم اور شوفر بڑی احتیاط سے الگ کھڑے اُن کی حرکتیں دیکھ رہے تھے، جیسے نوابوں کے بچوں کی آیائیں.

یہ لوگ یہاں کیا کر رہے تھے ؟ برن ہارٹ نے انہیں کیوں بلایا تھا ؟ کیا اپنے سر سے بھوت اتارنے کی یہ ایک نئی کوشش تھی ــــ اور پہلے سے زیادہ سازوسامان کے ساتھ؟ میں نے فیصلہ کیا کہ نہیں۔ غالباً یہ ایسی دعوت تھی جو سال میں ایک دفعہ خاندان کے سارے رشتہ داروں، دوستوں اور متوسلین کو فرض کے طور پہ دی جاتی تھی۔ اور اس فہرست میں کہیں نیچے جاکے میرا نام بھی تھا جس پہ نشان لگانا ضروری تھا۔ بہرحال ناشکرگزاری کرنا تو بے وقوفی تھی۔ اب تو میں یہاں آ ہی گیا تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ خوب لطف لوں گا۔

پھر یہ دیکھ کر مجھے بے انتہا حیرت ہوئی کہ ناٹالیا بھی موجود ہے۔ وہ ہلکے سے نیلے رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی جس کی آستینیں چھوٹی چھوٹی اور پھولی ہوئی تھیں، اور اس کے ہاتھ میں تنکوں کا بڑا سا ہیٹ تھا۔ وہ ایسی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی کہ پہچاننے میں بھی مشکل سے آتی تھی۔ وہ ہنستی ہوئی میرا استقبال کرنے آگے بڑھی۔ "آہا، کرسٹفر! تم سے مل کے بڑی مسرت ہوئی ہے!"

"اتنے دن کہاں رہیں؟"

"پیرس میں..... تمہیں معلوم نہیں تھا؟ واقعی؟ میں تمہارے خط کا انتظار کرتی رہی ــــ لیکن کوئی آیا ہی نہیں!"

"لیکن، ناٹالیا، تم نے مجھے اپنا پتہ ہی نہیں لکھا۔"

"میں نے تو لکھا تھا!"

"تو پھر مجھے خط ہی نہیں ملا..... میں بھی ان دنوں باہر رہا ہوں۔"

"اچھا؟ باہر رہے ہو؟ پھر تو مجھے افسوس ہے..... میرے بس کی بات نہیں!"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اُس کی ہر چیز کی طرح ناٹالیا کی ہنسی بھی بدل گئی تھی۔ اب یہ ہنسی سخت مزاج اسکول کی لڑکی والی ہنسی نہیں رہی تھی جس نے مجھے جیکبسن اور گیٹے کی کتابیں پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ اب اُس کے چہرے پر ایک خوابناک اور مسرّت انگیز ہنسی نظر آ رہی تھی ـــــ جیسے بڑی شوخ اور خوشگوار موسیقی سن رہی ہو۔ یہ تو خیر صاف ظاہر تھا کہ مجھ سے دوبارہ مل کے اُسے بڑی خوشی ہوئی ہے، لیکن اس کے باوجود معلوم ہوتا تھا کہ وہ گفتگو میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی ہے۔

"تم پیرس میں کیا کر رہی ہو؟ آرٹ سیکھ رہی ہو، جیسا کہ تم چاہتی تھیں؟"

"ہاں، اور کیا!"

"تمہیں یہ کام پسند ہے؟"

"بہت ہی عجیب و غریب ہے!" نٹالیا نے زور سے سر ہلایا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ان الفاظ کا مقصد کسی اور چیز کی تعریف کرنا ہے۔

"تمہاری والدہ تمہارے ساتھ ہیں؟"

"ہاں۔ ہاں ....."

"تم اُن کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتی ہو؟"

"ہاں ....." اُس نے پھر سر ہلایا۔ "مکان ..... ہاں، بڑا نفیس ہے!"

"تم وہاں جلدی ہی واپس جانے والی ہو کیا؟"

"ہاں ..... بالکل! کل ہی!" اُسے بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے سوال کیسے پوچھا ـــــ حیرت ہو رہی تھی کہ ساری دنیا کو کیوں نہیں معلوم ...... میں اس احساس سے خوب واقف تھا! اب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ ناٹالیا عشق میں مبتلا ہے۔

ہم کئی منٹ تک اور باتیں کرتے رہے ــــــ ناٹالیا برابر مسکراتی رہی، خوابناک انداز میں برابر سُنتی رہی، لیکن میری باتیں نہیں. پھر یکایک وہ بولی کہ مجھے بڑی جلدی ہے کافی دیر ہوچکی ہے اور مجھے سامان باندھنا ہے، چنانچہ فوراً چلنا چاہیئے. اُس نے میرا ہاتھ دبایا اور میں دیکھتا رہا کہ وہ میدان میں بڑی خوش خوش اُس کار کی طرف بھاگی چلی جارہی ہے جو اُس کی منتظر تھی. اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ مجھ سے خط لکھنے کو کہے یا مجھے اپنا پتہ دے دے. جب میں نے خدا حافظ کہنے کے لیئے اُس کی طرف ہاتھ ہلایا تو رشک کے مارے میرے انگوٹھے میں درد کی بڑی تیز چمک پیدا ہوئی.

دعوت میں جتنے نوجوان لوگ آئے تھے، تھوڑی دیر بعد نہانے لگے، اور پتّھر کی سیڑھیوں کے نیچے جھیل کے گدلے پانی میں چھپ چھپ کرتے پھرنے لگے. برن ہارٹ بھی نہایا اُس کا جسم سفید اور بڑا عجیب قسم کا معصوم سا تھا جیسے کسی چھوٹے سے بچّے کا. اُس کا پیٹ بھی بچّے کا سا تھا، اور کچھ یوں ہی سا آگے کو نکلا ہوا تھا. وہ ہنس رہا تھا، پانی اُڑا رہا تھا اور سب سے زیادہ زور زور سے چیخ رہا تھا. جب میری اُس سے آنکھیں دوچار ہو جاتیں تو وہ پہلے سے بھی زیادہ چیخنے لگتا ــــــ میں نے سوچا کہ یہ ایک قسم کی دعوتِ مبارزت تو نہیں ہے؟ کیا وہ میری ہی طرح اُن باتوں کے متعلق سوچ رہا تھا جو اس نے چھ مہینے ہوئے اسی جگہ کھڑے ہوکے مجھ سے کہی تھیں؟ "تم بھی آجاؤ کرسٹفر!" اُس نے چیخ کے کہا. "اس سے تمہارے پیر کو آرام آئے گا!" آخر کار جب وہ سب لوگ پانی میں سے نکل آئے اور اپنا بدن سکھا رہے تھے تو برن ہارٹ اور دو چار دوسرے نوجوان باغ کے درختوں میں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑنے لگے اور قہقہے لگانے لگے.

لیکن برن ہارٹ کی اچھل کود کے باوجود پارٹی کچھ ٹھیک طرح کامیاب نہیں ہو رہی تھی

سب لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گئے تھے۔ جب دھا چوکڑی پورے زوروں پہ تھی اُس وقت بھی کم سے کم ایک چوتھائی مہمان نیچی نیچی سنجیدہ آواز میں سیاسیات کے متعلق باتیں کر رہے تھے: دراصل اُن میں سے بعض تو برن ہارٹ کے یہاں صرف ایک دوسرے سے ملنے اور اپنے ذاتی معاملات پر گفتگو کرنے آئے تھے۔ انہیں اتنی تکلیف بھی گوارا نہیں تھی کہ اور نہیں تو جھوٹ موٹ ہی ہنسی مذاق میں شامل ہو جائیں۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ لوگ اپنے دفتر میں یا گھر میں بیٹھے ہوں، ذرا بھی تو فرق نہیں تھا۔

جب اندھیرا ہو گیا تو ایک لڑکی گانے لگی۔ وہ روسی زبان میں گا رہی تھی، اور گانا ہمیشہ کی طرح بڑا غمناک معلوم ہو رہا تھا۔ خادم گلاس اور شراب کا بڑا سا پیالہ لے آیا۔ میدان میں سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ آسمان پہ لاکھوں ستارے چمک رہے تھے۔ زبردست اور اُودی رنگ بھری ہوئی پرسکون جھیل میں کشتیوں کے بھوتوں جیسے بادبان رات کی ہلکی ہلکی ہوا میں ہل رہے تھے۔ ایک طرف گراموفون بج رہا تھا۔ میں گدّوں پر لیٹا ایک یہودی ڈاکٹر کی باتیں سن رہا تھا جو یہ بحث کر رہا تھا کہ فرانس جرمنی کو نہیں سمجھ سکتا کیونکہ جنگ کے بعد جرمنوں کو اعصابی زندگی کا جیسا تجربہ ہوا ہے وہ فرانسیسیوں کو نہیں ہوا۔ نوجوان مردوں کی ایک ٹولی کے بیچ میں سے یکایک ایک لڑکی بھرائی ہوئی آواز میں ہنسنے لگی۔ اس وقت راتیں گہری جا رہی تھیں۔ مجھے ناٹالیا کا خیال آیا — وہ اپنی جان بچا کے بھاگ گئی ہے — اور وہ بھی شاید کچھ ایسے ٹھیک وقت پہ نہیں۔ چاہے فیصلے میں کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو جائے، مگر ان لوگوں کی قسمت میں آخر بربادی لکھی ہے۔ آج شام گویا اُس زبردست حادثے کا ریہرسل ہو رہا ہے۔ یہ گویا ایک پورے دور کی آخری رات ہے۔ ساڑھے دس بجے مجلس برخاست ہونے لگی۔ ہم سب بڑے کمرے میں یا سامنے کے

دروازے کے آس پاس کھڑے ہو گئے، اور ایک آدمی نے برلن فون کر کے خبریں پوچھیں
سب لوگ بالکل چپ چاپ کھڑے انتظار کرتے رہے۔ جو آدمی فون کر رہا تھا آخر چند لمحے
بعد اُس کا تنا ہوا چہرہ کچھ ڈھیلا پڑا اور وہ مسکرانے لگا۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ حکومت
صحیح سلامت ہے۔ کئی مہمانوں نے نیم طنزیہ انداز میں، مگر پریشانی دور ہونے پر اطمینان
کا اظہار کرتے ہوئے تالیاں بجائیں۔ میں مڑا تو دیکھا برن ہارٹ میرے برابر کھڑا ہے:
"ایک مرتبہ پھر سرمایہ داری جان سلامت لے گئی۔" وہ ایک عجیب پر اسرار انداز
میں مسکرا رہا تھا۔

اُس نے انتظام کر دیا تھا کہ ایک برلن جانے والی کار میں مجھے بھی بٹھا کے پہنچا دیا
جائے۔ جب ہم شہر پہنچے تو اخبار والے اخبار بیچتے پھر رہے تھے جس میں یہ خبر تھی کہ
بیولو پلاٹس میں گولی چلی ہے۔ مجھے وہ پارٹی یاد آئی کہ لوگ جھیل کے کنارے گھاس
پہ لیٹے شراب پی رہے ہیں اور گراموفون بج رہا ہے؛ اُس کے ساتھ ہی ایک یہ منظر میری
آنکھوں کے سامنے آیا کہ ایک پولیس کا افسر ریوالور ہاتھ میں لئے بری طرح زخمی لڑکھڑاتا
ہوا سینما کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے اور مر کے گتے کے بنے ہوئے آدمی کے قدموں پہ
گر پڑتا ہے۔ جو ایک مزاحیہ فلم کا اشتہار ہے۔

اس کے بعد ایک اور وقفہ آتا ہے —— اس مرتبہ آٹھ مہینے کا۔ اور اب میں کھڑا
برن ہارٹ کے مکان کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ ہاں، وہ اندر تھا۔
"تم نے میری بڑی عزت افزائی کی کرسٹفر۔ افسوس یہ ہے کہ مجھے یہ عزت
شاذ و نادر ہی حاصل ہوتی ہے۔"

"ہاں، مجھے بھی افسوس ہے۔ میں نے بہت دفعہ تم سے ملنے کو آنا چاہا..... پتہ نہیں کیوں نہیں آیا....."

"اس زمانے میں برلن ہی میں رہے ہو یا اور کہیں؟ میں نے دو دفعہ فراؤلین شرِیڈر کے یہاں فون کیا؛ کسی عجیب سی آواز نے جواب دیا اور بتایا کہ تم انگلستان چلے گئے۔"

"میں نے فراؤلین شریڈر سے یہی کہہ دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا انہیں معلوم ہو کہ میں ابھی یہیں ہوں۔"

"اچھا؟ کچھ لڑائی ہو گئی تھی؟"

"نہیں، بلکہ اس کے بالکل برخلاف بات ہے۔ میں نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ میں انگلستان جا رہا ہوں، کیونکہ اگر میں یہ نہ کہتا تو وہ اصرار کرتیں کہ تمہارا خرچ میں برداشت کروں گی اُس زمانے میں میرا ہاتھ کچھ تنگ ہو رہا تھا..... اب تو خیر معاملہ ٹھیک ہے۔" برنہارٹ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار دیکھتے ہی میں نے کہا۔

"کوئی پریشانی کی بات نہیں؟ مجھے بڑی خوشی ہوئی..... لیکن تم اس تمام عرصے کیا کرتے رہے؟"

"میں ہالیشس تور میں ایک خاندان کے ساتھ اُوپر کی منزل میں رہتا تھا۔ رہنے والے پانچ آدمی تھے اور کمرے دو۔"

برنہارٹ مسکرایا۔ "خدا کی قسم، کرسٹفر، تمہاری زندگی بھی کیسی رومانی ہے!"

"مجھے یہ سُن کے خوشی ہوئی کہ تم اس قسم کی زندگی کو رومانی کہتے ہو۔ میں تو نہیں کہتا!"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"بہرحال،" برنہارٹ بولا، "تمہیں تو بہت موافق آئی ہے، تندرستی پھٹی پڑ رہی ہے۔"

میں اس کے جواب میں کوئی تعریفی جملہ نہ کہہ سکا۔ برن ہارٹ ایسا بیمار سا لگ رہا تھا کہ میں نے آج تک اُس کی ایسی حالت نہیں دیکھی۔ اس کا چہرہ بالکل زرد اور سُتا ہوا تھا۔ مسکراتے ہوئے بھی اُس کے چہرے سے تھکاوٹ کے آثار دور نہیں ہوتے تھے۔ اُس کی آنکھوں کے نیچے سیاہی مائل زرد گہرے گہرے حلقے تھے۔ اُس کے بال تیلے پڑ گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی عمر ایک ساتھ دس سال بڑھ گئی ہے۔

"اور تمہاری زندگی کیسی گزر رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے مقابلے میں تو میری زندگی بڑی بے ڈھنگی اور افسوسناک ہے..... بہرحال کبھی نہ کبھی نیم مزاحیہ اور نیم المناک واقعات ہوتے رہتے ہیں جن سے دل بہل جاتا ہے۔"

"کس قسم کے واقعات؟"

"مثلاً ایسے ——" برن ہارٹ اپنی میز کے پاس پہنچا اور ایک کاغذ اٹھا کے مجھے دیا۔ "یہ آج صبح کی ڈاک سے ملا ہے۔"

میں نے ٹائپ میں لکھے ہوئے لفظ پڑھے: "برن ہارٹ لانڈاور، خبردار! ہم تم سے اور تمہارے چچا سے اور سارے ملعون یہودیوں سے بدلہ چکانے والے ہیں۔ ہم تمہیں چوبیس گھنٹے دیتے ہیں۔ اس عرصے میں جرمنی سے نکل جاؤ، ورنہ اپنے آپ کو مردہ سمجھو۔"

برن ہارٹ ہنسنے لگا۔ "خون کی بو آتی ہے، کیوں ہے نا؟"

"بڑی ناقابلِ یقین سی بات ہے..... تمہارے خیال میں کس نے بھیجا ہے؟"

"شاید کوئی ملازم بدخاست ہوگیا ہے اُس نے بھیجا ہوگا، یا کسی مسخرے نے۔ یا کوئی پاگل ہوگا، یا کوئی اسکول میں پڑھنے والا سرپھرا نازی لونڈا۔"

"اب تم کیا کروگے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"پولیس کو تو بتاؤگے ہی؟"

"پیارے کرسٹفر، ایسی حماقت کی باتیں سنتے سنتے تو پولیس تھک جائے گی۔ ہمیں ہر ہفتے ایسے تین چار خط ملتے ہیں۔"

"پھر بھی ممکن ہے یہ خط سنجیدگی سے لکھا گیا ہو..... نازی لوگ لکھنے تو ہیں اسکول کے لڑکوں کی طرح، مگر ان سے کچھ بعید نہیں۔ یہی تو ان میں خطرناک بات ہے۔ لوگ ان پر آخری لمحے تک ہنستے رہتے ہیں....."

برن ہارٹ اپنے تھکے ہوئے سے انداز میں مسکرانے لگا: "میرے لئے جو تم اتنے فکرمند ہو رہے ہو، میں اس کی قدر کرتا ہوں، لیکن میں اس کا اہل نہیں ہوں..... میری زندگی میرے لئے یا دوسروں کے لئے کوئی ایسی زبردست اہمیت نہیں رکھتی کہ میری حفاظت کے لئے قانون کی قوتوں کو دعوت دی جائے..... جہاں تک میرے چچا کا تعلق ہے تو وہ آج کل وارسا میں ہیں....."

میں نے دیکھا کہ وہ موضوع بدلنا چاہتا ہے: "تمہیں ناٹالیا اور فراؤ لانڈاور کی کوئی خبر ملی؟"

"ہاں، کیوں نہیں! ناٹالیا کی شادی ہو گئی۔ تمہیں پتہ نہیں چلا؟ ایک نوجوان فرانسیسی ڈاکٹر سے ہوئی ہے...... سنتا ہوں کہ وہ دونوں بہت خوش ہیں۔"

"یہ خبر سن کے مجھے بڑی خوشی ہوئی!"

"ہاں،...... یہ سن کے مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے دوست خوش ہیں۔ ہے نا یہی بات؟" برن ہارٹ ردی کی ٹوکری کی طرف گیا اور یہ خط اس میں ڈال دیا۔ "خاص طور سے

جب وہ کسی دوسرے ملک میں ہوں....." وہ اپنے ملائم اور غمناک انداز میں مسکرایا۔
"تمہارے خیال میں اب جرمنی کا کیا ہونے والا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "نازی لوگ حکومت پر قبضہ کرلیں گے، یا کمیونسٹ انقلاب ہوگا؟"
برنہارٹ ہنسنے لگا۔ "ابھی تمہارا جوش وخروش کم نہیں ہوا! کاش کہ یہ سوال مجھے بھی اتنا ہی اہم معلوم ہوتا جتنا تمہیں معلوم ہوتا ہے....."
"دوچار دن اور ٹھہر جاؤ، اپنے آپ اہم معلوم ہونے لگے گا۔"—— یہ تلخ جواب میرے ہونٹوں تک آگیا، مگر اب مجھے خوشی ہے کہ میں نے یہ لفظ کہے نہیں۔ اس کے بجائے میں نے پوچھا، "کیوں، تم یہ کیوں چاہتے ہو؟"
"کیونکہ یہ میرے کردار میں کسی صحت مندانہ عنصر کی علامت ہوگی..... آجکل یہی ٹھیک ہے کہ آدمی کو ایسی باتوں سے دلچسپی ہو۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ یہ صحت مندی کی بات ہے اور ہوشمندی کی بھی..... چونکہ یہ ساری باتیں مجھے کچھ غیر حقیقی سی اور کچھ —— کرسٹفر بُرا مت ماننا —— حقیر سی معلوم ہوتی ہیں، اس لئے میں جانتا ہوں کہ میں زندگی سے بے تعلق ہوتا جارہا ہوں۔ یہ بات بُری ہے..... آدمی کو تناسب کا احساس قائم رکھنا چاہیئے..... تمہیں معلوم ہے، بعض وقت جب میں شام کو یہاں اپنی کتابوں اور مجسموں کے درمیان اکیلا بیٹھا ہوتا ہوں تو میرے اُوپر ایک عجیب احساس طاری ہوجاتا ہے اور ہر چیز مجھے غیر حقیقی معلوم ہونے لگتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میری ساری زندگی بے حقیقت ہو۔ واقعی، بعض دفعہ مجھے شک ہوا ہے کہ ہماری دکان —— وہ بڑی عمارت جس میں اُوپر سے نیچے تک ہماری جمع کی ہوئی چیزیں بھری پڑی ہیں —— یہ دکان میرے تصوّر کے علاوہ موجود بھی ہے یا نہیں..... اور پھر جیسا خواب میں

ہوا کرتا ہے مجھے یہ ناخوشگوار احساس بھی ہوتا ہے کہ میرا وجود ہی نہیں ہے۔ یہ بات بڑے غیر متوازن اور بیمار دماغ کی علامت ہے..... کرسٹفر، میں تمہارے سامنے ایک اعتراف کرتا ہوں..... ایک دن شام کو میرے دماغ پر یہ احساس طاری ہو گیا کہ لانڈاور والی دکان موجود نہیں ہے، اور اس سے مجھے اتنی پریشانی ہوئی کہ میں نے فون اُٹھا لیا اور رات کے ایک پہرے دار سے بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا، اور اُسے تکلیف دینے کے احمقانہ عذر پیش کرتا رہا۔ بس میں اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا تھا۔ سمجھ گئے نا؟ غالباً میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا تو یہ خیال نہیں ہے..... یہ تو زیادہ کام کرنے کا نتیجہ تھا اور یہ بات ہر آدمی کو پیش آسکتی ہے۔"

"تو پھر تمہارے خیال میں میں تھوڑے دن کی چھٹی لے لوں؟ بہار کے شروع میں ایک مہینہ اٹلی میں گزار آؤں؟ ہاں..... مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے کہ جب ایک مہینہ اٹلی کی دھوپ کھا کے میرے سارے مسئلے حل ہو سکتے تھے۔ لیکن افسوس کہ اب یہ دوا کام نہیں کرتی۔ یہ عجیب اجتماعِ ضدین ہے! لانڈاور کی دکان اب میرے لئے حقیقی نہیں رہی، لیکن میں ہمیشہ سے زیادہ اس کا غلام بن کے رہ گیا ہوں! تم نے گندی مادہ پرستی کی سزا دیکھی۔ مجھے اس چکی سے ہٹا دو تو میرے دن مصیبت سے گزرنے لگیں گے..... آہ کرسٹفر، میری زندگی سے سبق لو!"

وہ مسکراتا جا رہا تھا، اور ہلکے ہلکے نیم تمسخرانہ انداز میں بول رہا تھا۔ میں نے اس موضوع پر زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہیں۔

"تمہیں معلوم ہے،" میں نے کہا، "اب تو میں واقعی انگلستان جا رہا ہوں۔ تین چار دن

میں چلا جاؤں گا۔"

"یہ سُن کے مجھے بڑا افسوس ہوا۔ تم وہاں کتنے دن ٹھیرو گے؟"

"شاید ساری گرمیاں وہیں گزاروں گا۔"

"آخر برلن سے تھک ہی گئے؟"

"نہیں..... مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے برلن مجھ سے تھک گیا ہے۔"

"پھر تم واپس آؤ گے؟"

"ہاں، امیّد تو ہے۔"

"مجھے یقین ہے کرسٹفر، کہ تم ہمیشہ برلن لوٹ آؤ گے۔ تم تو بالکل یہیں کے معلوم ہوتے ہو۔"

"شاید ایک طرح ہوں بھی۔"

"یہ عجیب بات ہے کہ بعض لوگ بالکل ایک خاص جگہ کے معلوم ہوتے ہیں، —— خاص طور سے اُن جگہوں کے جہاں وہ پیدا نہ ہوئے ہوں..... جب میں پہلی مرتبہ چین گیا تو اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے گھر ہوں..... شاید جب میں مرجاؤں گا تو میری روح اُڑ کے پیکنگ چلی جائے گی۔"

"اس سے بہتر تو یہ ہو گا کہ تم جلدی سے جلدی اپنے جسم کو ٹرین کے ذریعے وہاں پہنچا دو!"

برنہارٹ ہنسنے لگا۔ "اچھی بات ہے..... میں تمہاری نصیحت پر عمل کروں گا! لیکن دو شرطیں ہیں —— ایک تو یہ کہ تم میرے ساتھ چلو۔ اور دوسرے یہ کہ ہم آج شام ہی برلن سے روانہ ہو جائیں۔"

"کیا واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو؟"

"ہاں، بالکل۔"

"کیسے افسوس کا مقام ہے! میں ضرور چلتا..... مگر بدقسمتی سے میرے پاس صرف ڈیڑھ سو مارک ہیں۔"

"مگر تم تو میرے مہمان ہو گے۔"

"اوہو، برنہارٹ، بڑا مزا رہے گا! پاسپورٹ لینے کے لئے ہم چند دن وارسا ٹھیریں گے۔ وہاں سے سائبیریا جانے والی گاڑی میں سوار ہو جائیں گے....."

"تو پھر تم چل رہے ہو؟"

"ہاں، بالکل!"

"آج شام ہی؟"

میں جھوٹ موٹ کچھ سوچنے لگا۔ "آج شام تو نہیں چل سکتا..... پہلے تو مجھے دھوبی کے یہاں سے کپڑے لانے ہیں..... کل کیسا رہے گا؟"

"کل تو بہت دیر ہو جائے گی۔"

"بڑے افسوس کا مقام ہے!"

"ہاں، یہی بات ہے نا؟"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ برن ہارٹ کو اپنے مذاق پر خاص طور سے ہنسی آ رہی ہے۔ اُس کے قہقہے میں کچھ مبالغے کا عنصر تھا، جیسے اُس کے جملے میں مذاق کی ایک اور تہ تھی جس تک میں نہیں پہنچ سکا تھا۔ جب میں رخصت ہوا تو ہم دونوں ابھی تک ہنس رہے تھے۔

شاید میں مذاق کو ذرا دیر میں سمجھتا ہوں۔ بہرحال اس مذاق کا مطلب سمجھنے میں مجھے اٹھارہ مہینے لگے، تب جا کے مجھے پتہ چلا کہ یہ ہم دونوں پر برنہارٹ کا آخری، سب سے زیادہ جرأت آمیز اور انتہائی تلخ تجربہ تھا۔ اب مجھے پورا پورا یقین ہے کہ اس نے بات پوری سنجیدگی سے کہی تھی اور اُس کی پیشکش میں ذرا بھی مذاق شامل نہیں تھا۔

جب میں ۱۹۳۲ء کے موسم خزاں میں برلن واپس آیا تو میں نے برن ہارٹ کو فون کیا۔ کسی نے مجھے بتایا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں ہیمبرگ گیا ہوا ہے۔ اب میں اپنے آپ کو الزام دیا کرتا ہوں —— بعد میں آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو الزام دیتا ہے —— کہ میں نے پھر کیوں فون نہیں کیا۔ لیکن میرے پاس کام بہت تھا۔ اتنے سارے شاگرد تھے، اور پھر بہت سے دوسرے آدمیوں سے ملنا تھا۔ چنانچہ ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ آخر کرسمس آگیا —— میں نے برنہارٹ کو ایک کارڈ بھیجا، لیکن اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ شاید وہ پھر باہر گیا ہوا تھا۔ اور اس کے بعد نیا سال شروع ہو گیا۔

مثلاً آیا، رائخشٹاگ میں آگ لگی، نقلی انتخابات ہوئے، میں سوچا کرتا تھا کہ نہ معلوم برن ہارٹ پر کیا گزر رہی ہے۔ میں نے اُسے تین دفعہ فون کیا —— اور ہر دفعہ پبلک کے استعمال کے فون سے، کیونکہ میں ڈرتا تھا کہیں فراؤلین شرائیڈر کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں —— مگر مجھے کبھی کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر اپریل کے شروع میں ایک دن شام کو میں اُس کے گھر گیا۔ دربان نے چھوٹی سی کھڑکی میں سے اپنا سر نکالا۔ وہ ہمیشہ سے زیادہ بدگمان معلوم ہوتا تھا۔ پہلے تو ایسا معلوم ہوا وہ کہہ دے گا میں برنہارٹ کو جانتا ہی

نہیں، پھر اُس نے سختی سے جواب دیا، "مہر لانڈاور چلے گئے ...... بالکل چلے گئے۔"
"تمہارا مطلب ہے کہ انہوں نے یہ مکان چھوڑ دیا؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم مجھے اُن کا پتہ دے سکتے ہو؟"
"وہ چلے گئے۔" دربان نے دہرایا اور جھٹ سے کھڑکی بند کر دی۔
میں نے بات یہیں ختم کر دی ــــ اور فطری طور پر یہ فیصلہ کیا کہ برن ہارٹ صحیح سلامت کسی دوسرے ملک میں ہے۔

جس دن یہودیوں کا بائیکاٹ شروع ہوا ہے اُس روز صبح کو میں ٹہلتا ہوا لانڈاور لوگوں کی دکان کی طرف گیا۔ ظاہر میں تو کوئی بات معمول کے خلاف نظر نہیں آتی تھی۔ دونوں بڑے دروازوں پر دو تین وردی پوش نازی رضا کار تعینات تھے۔ جب کوئی گاہک آتا تو اُن میں سے ایک نازی کہتا: "یاد رکھیئے، یہ یہودی کی دکان ہے!" یہ نازی لڑکے بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے، اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ راہ گیروں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں تماشہ دیکھنے کے لئے کھڑی تھیں، کچھ لوگوں کو دلچسپی تھی، کچھ لوگ لطف لے رہے تھے، اور کچھ لوگ بالکل بے پرواہ تھے۔ لیکن یہ لوگ ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ اس چیز کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھیں یا نہ دیکھیں۔ یہاں چھوٹے قصبوں کی سی فضا بالکل نہیں تھی جس کے متعلق بعد میں اخباروں سے معلوم ہوا کہ خریدنے والوں کے ماتھے یا گال پر زبردستی روشنائی سے مُہر لگا دی جاتی تھی۔ یہاں تو بہت سے لوگ دکان کے اندر چلے جاتے تھے۔ میں خود بھی اندر چلا گیا اور سب سے پہلے جو چیز نظر پڑی خرید لی ــــ یہ ایک کدوکش تھا ــــ اور اپنے چھوٹے سے

بنڈل کو ہاتھ میں نچاتا باہر آگیا۔ دروازے پر جو لڑکے کھڑے تھے ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کی طرف آنکھ ماری اور کچھ کہا۔ مجھے یاد آیا کہ جس زمانے میں میں نووا ک لوگوں کے یہاں رہتا تھا میں نے اس لڑکے کو ایک دو دفعہ الگزینڈر کیسینو میں دیکھا تھا۔

مئی میں میں آخری مرتبہ برلن سے چلا آیا۔ میرا پہلا قیام پراہا میں ہوا —— یہاں ایک دن شام کو ایک خراب سے رسٹورنٹ میں اکیلے بیٹھے ہوئے میں نے بالواسطہ طور پر لانڈاور خاندان کے متعلق کچھ باتیں سنیں اس کے بعد مجھے خبر نہیں ملی اُن کا کیا ہوا کیا نہیں ہوا۔

میرے برابر والی میز پر دو آدمی بیٹھے تھے اور جرمن میں باتیں کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک تو یقیناً آسٹریا کا تھا۔ دوسرے کے متعلق میں ٹھیک طرح کہہ نہیں سکتا۔ وہ موٹا اور چکنا چپڑا سا تھا، اُس کی عمر کوئی پینتالیس سال ہوگی، اور بیلگراڈ سے لیکر اسٹاک ہالم تک یورپ کے کسی بھی دارالسلطنت میں اُس کا چھوٹا موٹا کاروبار ہو سکتا تھا۔ بے شک و شبہ دونوں کے دونوں خوش حال تھے، اصطلاحی اعتبار سے آریائی اور سیاسی اعتبار سے غیر جانبدار۔ موٹے آدمی نے ایک ایسی بات کہی جس سے میں چونک پڑا، اور غور سے سننے لگا۔

"تم لانڈاور لوگوں کو جانتے ہو؟ برلن کے لانڈاور لوگوں کو؟"

آسٹریا والے نے سر ہلایا۔ "ہاں، خوب...... ایک زمانے میں اُن سے بہت کاروبار رہا ہے..... وہاں اُن کا بڑا اچھا مکان ہے۔ کافی لاگت آئی ہوگی......"

"صبح کا اخبار دیکھا ہے؟"

"نہیں۔ وقت ہی نہیں ملا..... اپنے نئے مکان میں سامان لے جا رہا ہوں۔ بیوی

آرہی ہے۔"

"واپس آرہی ہیں؟ سچ کہہ رہے ہو! دیانا میں ہی تھیں نا؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"اچھا وقت گزرا؟"

"اس معاملے میں تو میری بیوی طاق ہے! بہر حال کافی روپیہ خرچ ہوا۔"

"آج کل دیانا میں بہت خرچ ہوتا ہے۔"

"ہاں بہت۔"

"کھانے کی چیزیں بہت گراں ہیں۔"

"یہ تو ہر جگہ ہی گراں ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" موٹا آدمی دانت کریدنے لگا۔ "میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"تم لانڈا اور لوگوں کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔"

"ہاں ٹھیک ہے..... تم نے آج صبح کا اخبار پڑھا؟"

"نہیں، میں نے نہیں پڑھا۔"

"اخبار میں کچھ برنہارٹ لانڈا اور کے متعلق تھا۔"

"برنہارٹ؟" آسٹریلیا والے نے کہا۔ "ذرا سوچنے دو — یہ تو بٹیلا ہے نا؟"

"مجھے تو معلوم نہیں....." موٹے آدمی نے خلال کی نوک سے گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا نکالا، اور اسے روشنی کی طرف اٹھا کے غور سے دیکھنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ بٹیا ہے۔" آسٹریا والے نے کہا۔ یا شاید بھتیجا ہو..... نہیں میرا تو خیال ہے کہ بٹیا ہے۔"

"جو کوئی بھی ہو،" موٹے نے جھٹکا دے کر گوشت کا ٹکڑا بڑی بدمزگی سے پلیٹ پر پھینکا، "وہ مر گیا۔"

"سچ کہہ رہے ہو!"

"دل کی حرکت بند ہو گئی۔" موٹے کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ڈکار روکنے کے لئے اُس نے منھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اُس نے سونے کی تین انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں: "اخبار تو یہی کہتے ہیں۔"

"دل کی حرکت بند ہو گئی!" آسٹریا والے نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔ "سچ کہنا!"

"آجکل تو جرمنی میں بہت لوگوں کے دل کی حرکت بند ہو رہی ہے۔" موٹے نے کہا۔

آسٹریا والے نے سر ہلایا۔ "سُنی ہوئی بات کا کیا یقین۔ اصل بات تو یہ ہے۔"

"مجھ سے پوچھو،" موٹے نے کہا، "جس آدمی کے دل میں گولی پہنچ جائے، اُس کے دل کی حرکت بند ہو سکتی ہے۔"

آسٹریا والا بڑا بےچین نظر آنے لگا۔ "یہ نازی لوگ...." اُس نے کہنا شروع کیا۔

"یہ لوگ کچھ نہ کچھ ضرور کر ڈالیں گے۔" معلوم ہوتا تھا کہ موٹے کو اپنے دوست کو ڈرانے میں مزا آرہا ہے۔ "میرے لفظ لکھ لو، یہ لوگ یہودیوں کو جرمنی سے بالکل نکال دیں گے۔ صاف نکال دیں گے۔"

آسٹریا والے نے سر ہلایا۔ "مجھے یہ بات پسند نہیں۔"

نظر بندوں کے کیمپ،" موٹے نے سگار جلاتے ہوئے کہا، "بس نازی لوگ انہیں وہاں بند کر دیتے ہیں اور کاغذوں پر دستخط کرا لیتے ہیں..... پھر اُن کے دلوں کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔"

"مجھے یہ بات پسند نہیں" آسٹریا والے نے کہا۔ "اس سے تجارت کو نقصان پہنچتا ہے"

"ہاں۔" موٹے نے تائید کی۔ "تجارت کو تو نقصان پہنچتا ہے۔"

"کسی بات کا ٹھیک رہتا ہی نہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس سے کاروبار کر رہے ہیں" موٹا ہنسنے لگا اپنے مخصوص انداز میں اُس کی باتیں بھی بڑی ہیبتناک تھیں۔ "کیا خبر کوئی لاش ہی ہو۔"

آسٹریا والا تھوڑا سا کانپ گیا "بڈھے لانڈاور کا کیا ہوا؟ کیا اُسے بھی پکڑ لیا؟"

"نہیں، وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ وہ اتنا چالاک ہے کہ اُن کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ آج کل وہ پیرس میں ہے۔"

"سچ کہہ رہے ہو!"

"میرا خیال ہے کہ نازی اُس کے کاروبار پر قبضہ کرلیں گے۔ بلکہ کر ہی لیا ہوگا" تب تو بڈھا لانڈاور بالکل برباد ہو جائے گا۔"

"وہ نہیں برباد ہو سکتا!" موٹے نے حقارت کے ساتھ اپنے سگار سے راکھ جھاڑی "اُس نے کہیں ضرور کچھ نہ کچھ بچا کے رکھا ہوگا۔ تم خود دیکھ لینا، وہ کوئی اور کاروبار شروع کردے گا۔ یہودی لوگ بڑے تیز ہوتے ہیں۔۔۔۔۔"

"بالکل ٹھیک ہے" آسٹریا والے نے تائید کی۔ "یہودی کو دبا کے رکھنا بڑا مشکل ہے" معلوم ہوتا تھا کہ اس خیال سے اُس کا دل کچھ خوش ہوا۔ اُس کے چہرے پر چمک آگئی "ہاں خوب یاد آیا! میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں کوئی بات سنانی ہے۔۔۔۔۔ تم نے وہ کہانی سُنی ہے، وہ اُس یہودی اور گوبیئے کی لڑکی کی؟ وہی لڑکی جس کے لکڑی کی ٹانگ لگی ہوئی ہے؟"

"نہیں تو۔" موٹے نے سگار کا کش لیا۔ اب اُس کے ہاضمے کی مشین خوب کام کر رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد اب اُس کا گپ اُڑانے کو جی چاہ رہا تھا۔ "تو پھر سناؤ۔۔۔۔۔"

برلن کا روزنامچہ

موسم سرما ۳۳-۱۹۳۲ء

اب کے سردیوں میں آج رات پہلی مرتبہ اتنی سردی پڑی ہے. موت کی سی سردی سارے شہر پر چھائی ہوئی ہے اور ایسی خاموشی طاری ہے جیسے گرمیوں کی تیز دوپہر کی خاموشی معلوم ہوتا ہے کہ سردی کے مارے شہر سکڑ گیا ہے اور گھٹ کے ایک چھوٹا سا نقطہ رہ گیا ہے، جو بالکل ویسا ہی نقطہ ہے جیسے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے نقطے یورپ کے زبردست نقشے پر پھیلے ہوئے ہیں، ایک دوسرے سے بالکل الگ اور مشکل سے ہاتھ آنے والے. رات کی تاریکی میں باہر، کنکریٹ کے نئے بنے ہوئے مکانوں سے اُدھر جہاں سڑکیں برف آلود باغوں میں ختم ہوتی ہیں، پردشا کے میدان پھیلے ہوئے ہیں۔ آج رات تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ میدان ایک زبردست اور ویران سمندر کی طرح شہر کو نگلنے کے لئے کھسکتے چلے آ رہے ہیں —— ان میدانوں میں بے پتوں کی جھاڑیاں، برف سے جمی ہوئی جھیلیں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں بکھرے ہوئے ہیں جنہیں صرف اس طرح یاد رکھا جاتا ہے جیسے بھولی ہوئی لڑائیوں میں وزنگا ہوں میں

کے اجنبی سے نام۔ برلن کا ایک ڈھانچا ہے جو سردی کے مارے دکھ رہا ہے ـــــ یہ خود میرا ڈھانچا ہے جو دکھ رہا ہے۔ ریلوے کے گاٹروں، چھجوں کے جنگلوں، پلوں، ٹرام کی پٹریوں، روشنی کے کھمبوں اور پنجالوں میں جو کہرا پڑ رہا ہے اُس کا تیز تیز درد میری ہڈیوں میں محسوس ہو رہا ہے۔ سردی کے مارے لوہا پھڑک رہا ہے اور سکڑتا جاتا ہے۔ پتھر اور اینٹیں خاموشی سے دُکھ سہہ رہی ہیں، پلستر بالکل بے حس ہے۔

برلن ایک ایسا شہر ہے جس کے دو مرکز ہیں ـــــ ایک تو یادگار والے گرجا کے چاروں طرف بیش قیمت ہوٹلوں، شراب خانوں، سنیماؤں اور دکانوں کا جھنڈ۔ شہر کے گدلے سے جھٹپٹے میں یہ حصّہ روشنی کے چمکتے ہوئے کولے کی طرح معلوم ہوتا ہے، جیسے کوئی نقلی ہیرا ہو۔ اور دوسرا اُونٹرڈین لنڈین کے گرد پبلک عمارتوں کا مرکز ہے جنہیں بڑی احتیاط سے ترتیب دیا گیا ہے اور جن سے بڑی خود آگاہی ٹپکتی ہے۔ یہ عمارتیں مختلف شاندار بین الاقوامی نمونوں کی ہیں اور نقلوں کی بھی نقلیں ہیں، اور دارالسلطنت کی حیثیت سے برلن کی شان و شوکت کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ مجلس قانون ساز کا ایوان، دو عجائب خانے، ایک ریاستی بینک، ایک گرجا، ایک آپیرا، ایک درجن سفارت خانے، اور فتح کی یادگار میں ایک محراب ـــــ غرضکہ کوئی چیز بھی نہیں چھوڑی گئی۔ یہ سب عمارتیں بڑی شاندار اور باضابطہ ہیں ـــــ سوائے گرجا کے۔ جس کے طرزِ تعمیر میں اُس جنون کی ایک چنگاری چمکتی ہے جو پروشا کی ہر سنجیدہ اور بے رنگ ہیئت کے پیچھے بھڑکتی رہتی ہے۔ اس گرجا کی ساری چمک دمک اس کے مہمل گنبد نے خراب کر دی ہے۔ پہلی نظر میں گرجا اتنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اس کے لئے کوئی مناسب سا مضحکہ خیز نام ڈھونڈنے لگتا ہے۔

لیکن برلن کا اصلی دل ایک چھوٹا سا سیاہ نم آلود جنگل ہے ـــــ یعنی ٹیر گارٹن

سال کے اس حصے میں چونکہ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں سردی سے کوئی بچاؤ نہیں ہوتا اس لئے کسانوں کے لڑکے مجبور ہوکر روٹی اور کام کی تلاش میں شہر آجاتے ہیں، لیکن جو شہر میدانوں کے اوپر رات کے آسمان میں اتنا چمکتا تھا اور دعوت دیتا معلوم ہوتا تھا، اب بڑا سرد بے رحم، اور مردہ نظر آتا ہے۔ اس کی گرمی محض ایک نظری دھوکا ہے، جاڑے کے ریگستان کا ایک بہت بڑا سراب۔ شہر ان لڑکوں کا استقبال نہیں کرتا۔ اس کے پاس انہیں دینے کو کچھ نہیں ہے۔ سردی کے ہاتھوں مجبور ہوکر یہ لڑکے سڑکوں سے اس جنگل میں آجاتے ہیں جو شہر کا بے رحم دل ہے، اور وہاں وہ سکڑ سمٹ کر بنچوں پہ لیٹ جاتے ہیں، بھوکے مرتے رہتے ہیں اور سردی میں سسکتے رہتے ہیں —— اور اپنی دور دراز جھونپڑیوں کے چولھوں کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔

فراؤلین شریڈر کو سردی سے بڑی نفرت ہے۔ اپنا مخمل کا سمور دار کوٹ پہنے ہوئے پیر چولھے پر رکھ لیتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ سگرٹ پینے لگتی ہیں، اور کبھی چائے کا گلاس ہاتھ میں لئے چسکی لگاتی جاتی ہیں، لیکن اکثر اوقات وہ بس یوں ہی بیٹھی بے معنی نظروں سے چولھے کے ٹائلوں کو دیکھتی رہتی ہیں جیسے اونگھ رہی ہوں۔ آج کل وہ بالکل اکیلی ہیں۔ فراؤلین میئر گانے ناچنے والی پارٹی کے ساتھ ہالینڈ چلی گئی ہے۔ چنانچہ میرے اور بوبی کے علاوہ کوئی اور آدمی ہے ہی نہیں جس سے وہ بات چیت کر سکیں۔

لیکن بوبی آج کل مورد عتاب ہے۔ ایک تو اس کی نوکری چھوٹ گئی ہے اور اس پہ تین مہینے کا کرایہ چڑھ گیا ہے، دوسرے فراؤلین شریڈر کو اندیشہ ہے کہ وہ ان کے بٹوے میں سے روپیہ چراتا ہے۔ "مہرا سے دوہ،" وہ مجھ سے کہتی ہیں "کوئی تعجب نہیں ہے کہ اسی

نے فراؤلین کوسٹ کے وہ پچاس مارک چرائے ہوں ...... اس سوٗر سے کچھ بعید نہیں ہے! اور پھر سوچئے کہ مجھے اس کے بارے میں کیسی غلط فہمی ہوئی! ہر اسی دُو، یقین مانئے گا، میں اس سے بالکل اپنے بیٹے جیسا سلوک کرتی تھی ــــ اور اُس کا مجھے یہ بدلہ ملا ہے! کہتا ہے اگر مجھے لیڈی ونڈرمیئر میں یہ ملازمت مل گئی تو میں کوڑی کوڑی چکا دوں گا ..... بس "اگر ہی "اگر" رکھتا ہے ....." فراؤلین شریڈر انتہائی حقارت سے پھنکارتی ہیں. "ٹھیک ہے! اگر میری دادی کے پہیے ہوتے تو وہ لاری ہوتیں!"

بوبی کو اس کے پرانے کمرے سے نکال دیا گیا ہے، اور وہ اوپر والی کوٹھری میں پہنچ گیا ہے. وہاں تو بڑی بوچھاڑ آتی ہوگی. بعض دفعہ تو سردی کے مارے بچارا بوبی بالکل نیلا پڑ جاتا ہے. پچھلے ایک سال میں وہ بہت بدل گیا ہے ــــ اُس کے بال ہلکے پڑ گئے ہیں، کپڑے میلے کچیلے رہتے ہیں، اور اُس کی شوخ چشمی کچھ سرکشانہ، بلکہ قابلِ رحم، بن گئی ہے. بوبی جیسے لوگوں کی پوری زندگی اُن کی ملازمت ہے ــــ انہیں ملازمت سے برخاست کر دیجئے تو اُن کی زندگی بہت حد تک ختم ہو جاتی ہے. بعض دفعہ وہ چوری چھپے بیٹھنے کے کمرے میں بھی آجاتا ہے. اُس کی حجامت بڑھی ہوتی ہے، اور وہ اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سیٹی بجاتا ہوا سرکشانہ انداز میں بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا ہے. سیٹی بجاتے ہوتے وہ جن ناچ کی گتوں کی نقل اُتارتا ہے اب وہ ایسی نئی نہیں رہیں. کبھی کبھی فراؤلین شریڈر اُس سے ایک آدھ لفظ کہہ دیتی ہیں، جیسے بادل ناخواستہ روٹی کا ٹکڑا ڈال رہی ہوں. لیکن اس کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتیں اور نہ چولھے کے قریب اُس کے لئے جگہ خالی کرتی ہیں. شاید انہوں نے ابھی تک ــــ اُسے فراؤلین کوسٹ سے عشق لڑانے کے معاملے میں معاف نہیں کیا. وہ گدگدیوں اور تھپیڑوں کے دن گئے.

کل فراؤلین کوسٹ ہم لوگوں سے ملنے آئی۔ اُس وقت میں باہر گیا ہوا تھا۔ جب میں واپس آیا تو دیکھا کہ فراؤلین شریڈر بڑے زوروں میں ہیں۔ " ذرا سوچئے تو، ہراسی دُو۔ میں تو اُسے پہچان بھی نہیں سکی! اب تو وہ بالکل شریف عورت معلوم ہوتی ہے۔ اُس کے جاپانی دوست نے اُس کے لئے سمور کا کوٹ خریدا ہے ـــــ اصلی سمور کا۔ خدا جانے اُس نے اس کوٹ پر کتنے روپے خرچ کئے ہونگے! اور اس کے جوتے ـــــ بالکل اصلی سانپ کی کھال کے ہیں! خیر، کیا بات ہے، کوسٹ نے ان سب چیزوں کے بدلے میں کام بھی تو پورا کیا ہوگا! یہی ایک کاروبار ہے جو اب بھی ٹھیک چل رہا ہے۔۔۔۔ میں تو سوچتی ہوں کہ مجھے بھی یہی پیشہ اختیار کرنا پڑے گا۔ " لیکن چاہے فراؤلین شریڈر، فراؤلین کوسٹ کے اخراجات کے متعلق کتنے ہی طنز سے کام کیوں نہ لیں، یہ صاف ظاہر تھا کہ اُن پر بڑا رعب پڑا ہے۔ جس بات نے اُن پر خاص طور سے رعب ڈالا تھا وہ جوتے یا سمور کا کوٹ نہیں تھا فراؤلین کوسٹ نے ایک بلند مقام حاصل کر لیا تھا، جسے فراؤلین شریڈر کی دنیا میں شرافت اور امارت کی نشانی سمجھا جاتا ہے ـــــ یعنی اُس نے ایک پرائیویٹ اسپتال میں آپریشن کرایا تھا " ہراسی دو، وہ بات نہیں ہے جو آپ سمجھے! اُس کے گلے میں کچھ خرابی تھی۔ اسپتال کا پورا خرچہ اُس کے دوست نے اٹھایا۔۔۔۔ ذرا سوچئے تو ـــــ ڈاکٹروں نے اُس کی ناک کے اندر کوئی چیز کاٹ دی، اور اب وہ اپنے منھ میں پانی بھر لیتی ہے اور نتھنوں سے اس طرح نکالتی ہے جیسے پچکاری! پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا لیکن اُس نے مجھے پانی نکال کے دکھایا! ایمان سے، ہراسی دُو، ایسی پچکاری مارتی ہے کہ یہاں سے وہاں جائے! اس میں کوئی شک نہیں کہ جب وہ یہاں رہا کرتی تھی اُس زمانے سے تو اُس کی حالت بہت سدھر

گئی ہے..... اگر وہ دو چار دن میں کسی بینک کے ڈائریکٹر سے شادی کرے تو مجھے بالکل تعجب نہیں ہوگا۔ ہاں، میری بات لکھ رکھیے، یہ لڑکی بہت ترقی کرے گی......"

میرے شاگردوں میں ایک نوجوان انجینیئر ہے جس کا نام ہر کرامف ہے۔ وہ سناتا ہے کہ جنگ اور مصنوعی افراطِ زر کے زمانے میں اُس کا بچپن کس طرح گزرا۔ جنگ کے آخری دنوں میں ریل گاڑیوں کی کھڑکیوں میں سے تسمے غائب ہو گئے تھے۔ لوگوں نے چمڑا اینٹھنے کے لیے انہیں کاٹ لیا تھا۔ بلکہ سڑک پر ایسے آدمی بھی دکھائی دیتے تھے جن کے لباس گاڑیوں کے گدوں پر سے ادھیڑے ہوئے کپڑے کے بنے ہوتے تھے۔ کرامف کے اسکول کے دوستوں کی ایک ٹولی رات کو ایک کارخانے میں گھس گئی اور چمڑے کی ساری پیٹیاں چُرا لائی۔ اُس زمانے میں ہر آدمی چوری کرتا تھا۔ ہر آدمی جو ہاتھ لگتا اُسے بیچ لیتا۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی۔ کرامف کی کلاس میں ایک چودہ سال کا لڑکا تھا جو اسکول کے گھنٹوں میں سڑکوں پر کوکین بیچتا تھا۔

کسان اور قصائی قادرِ مطلق ہو رہے تھے۔ اگر ترکاری یا گوشت لینا ہو تو اُن کی چھوٹی سے چھوٹی ضد پوری کرنی پڑتی تھی۔ کرامف خاندان ایک قصائی سے گوشت لیتا تھا۔ جو برلن کے باہر ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا اور جس کے پاس ہر وقت گوشت مل سکتا تھا لیکن اُس کے جنسی احساس نے ایک عجیب بے راہ روی اختیار کی تھی۔ اُسے سب سے زیادہ جنسی لذت اس بات میں ملتی تھی کہ کسی حسّاس اور شریف لڑکی یا عورت کے گالوں پر چانٹے مارے اور چٹکیاں لے۔ فراؤ کامف جیسی شریف خاتون کو ذلیل کرنے کے امکان سے اُسے بڑی زبردست خوشی ہوتی تھی۔ جب تک کہ اُسے اپنی ضد پوری کرنے کی اجازت

نہ ملے وہ خرید و فروخت کی بات ہی نہ کرتا تھا۔ چنانچہ ہر اتوار کو کرامف کی ماں اپنے بچوں کو لے کر گاؤں جاتی تھی اور گوشت کی تھوڑی سی بوٹیوں کے عوض بڑے صبر کے ساتھ اپنے گالوں پر تھپڑ لگواتی تھی اور نچواتی تھی۔

پوٹس ڈام اسٹراسے کے دوسرے کونے پر ایک میلے کا میدان ہے جہاں جھولے ہنڈولے اور ایسے ہی بہت سے کھیل تماشے لگے ہوئے ہیں۔ اس میدان کی ایک بہت ہی دلکش چیز وہ خیمہ ہے جہاں مکّے بازی کے مقابلے اور کشتیاں ہوتی ہیں۔ آپ ٹکٹ خرید کے اندر جاتے ہیں، پہلوان کشتی لڑنا شروع کر دیتے ہیں، اور دو تین پکڑ کے بعد ہی ایک آدمی اعلان کر دیتا ہے کہ اگر آپ اور کشتی دیکھنا چاہتے ہیں تو دس فیننگ اور دلوایئے ایک پہلوان گنجا ہے اور اس کی توند بہت بڑی ہے۔ وہ کرمچ کا پتلون پہنتا ہے جس کے پائنچے چڑھے رہتے ہیں جیسے وہ کشتی کھیلنے جا رہا ہو۔ اُس کا مخالف سیاہ برجس پہنتا ہے اور گھٹنوں پر پٹا باندھے رکھتا ہے جو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی گاڑی کے بڈھے سے گھوڑے کا ہو۔ پہلوان جتنا زیادہ ممکن ہو ایک دوسرے کو ادھر سے اُدھر پھینکتے ہیں اور حاضرین کی دلچسپی کے لئے ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہیں۔ موٹا ہارنے والے کا پارٹ ادا کرتا ہے۔ ہارنے کے بعد وہ ایسا بننے لگتا ہے جیسا بڑا غصّہ آگیا ہو، اور ریفری کو لٹنے کی دھمکیاں دینے لگتا ہے۔

مکے بازی کرنے والوں میں سے ایک حبشی ہے۔ ہر دفعہ وہی جیتتا ہے۔ مکّے بازی کرنے والے کھلے ہوئے دستانے سے ایک دوسرے کے مکّے مارتے ہیں اور بہت زیادہ شور غل مچاتے ہیں۔ دوسرا مکّے باز لمبے قد اور بڑے گٹھے ہوئے جسم کا ہے۔ وہ حبشی

سے کہیں زیادہ طاقتور ہے، اور عمر میں کوئی بیس سال کم ہے، لیکن یہ آدمی بڑی مہمل آسانی سے پٹ جاتا ہے وہ زمین پہ گر کے بڑے کرب سے تڑپنے لگتا ہے، اور جب گنتی دس تک پہنچتی ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح کھڑا ہو جاتا ہے مگر پھر کراہتا ہوا گر پڑتا ہے۔ اس مقابلے کے بعد ریفری ہر آدمی سے دس فیننگ اور لیتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔ کہ حاضرین میں سے کوئی آدمی مقابلے پہ آنا چاہے تو باہر نکلے۔ اس سے پہلے کہ حاضرین میں سے کوئی آدمی واقعی دعوتِ مبارزت قبول کرے ایک اور نوجوان جو کھلم کھلا پہلوانوں سے ابھی بات چیت اور مذاق کر رہا تھا، فوراً کود پڑتا ہے اور اپنے کپڑے اتار ڈالتا ہے اُس کے کپڑوں کے نیچے نکر ہوتا ہے، اور وہ کتّے بازی والے جوتے پہنے ہوتا ہے۔ ریفری اعلان کرتا ہے کہ جو آدمی جیتے گا اُسے پانچ مارک ملیں گے۔ اس دفعہ حبشی ہار جاتا ہے۔

حاضرین ان لڑائیوں کا تماشا بڑی سنجیدگی سے دیکھتے ہیں، چیخ چیخ کے لڑنے والوں کی ہمت افزائی کرتے جاتے ہیں، بلکہ نتیجے کے بارے میں آپس میں لڑتے ہیں اور شرط بدتے ہیں۔ تقریباً سارے لوگ اس خیمے میں اتنی ہی دیر سے تھے جتنی دیر سے میں تھا، اور میں چلا آیا تب بھی وہیں رہے۔ اس واقعے سے سیاست کے متعلق جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ بڑا مایوس کن ہے۔ ان لوگوں کو کسی بھی آدمی یا کسی بھی چیز کا معتقد بنایا جا سکتا ہے

آج شام میں کلائسٹ اسٹراسے پہ جا رہا تھا کہ دیکھا ایک کار کے گرد ایک چھوٹی سی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ کار کے اندر دو لڑکیاں تھیں۔ باہر کھڑنجے پر دو نوجوان یہودی کھڑے تھے، اور ایک لمبے قد کے گورے آدمی سے جو غالباً نشے میں تھا، بڑے زوروں میں جھگڑ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہودی کسی لڑکی کی تلاش میں سڑک پر آہستہ آہستہ کار چلا رہے تھے۔

انہوں نے ان لڑکیوں کو سیر کی دعوت دی تھی۔ ان دونوں نے دعوت قبول کر لی تھی اور کار میں بیٹھ گئی تھیں۔ اس وقت یہ گورا آدمی آدھمکا اور دخل اندازی کرنے لگا۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ وہ نازی تھا اور اس حیثیت سے اپنا فرض سمجھتا تھا کہ گندی غیر نورڈی نسلوں کے آدمیوں کے ہاتھوں سے جرمن عورتوں کی عزت محفوظ رکھے۔ یہ دونوں یہودی ذرا بھی خوفزدہ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ وہ بڑے پُرزور طریقے سے اس نازی سے کہہ رہے تھے کہ جاؤ اپنا کام دیکھو۔ اس دوران میں لڑکیوں نے اس جھگڑے سے فائدہ اٹھایا اور کار میں سے نکل کے بھاگ گئیں۔ نازی نے پولیس والے کو ڈھونڈنے کے لئے ایک یہودی کو اپنے ساتھ گھسیٹ لے جانا چاہا۔ نازی نے جس یہودی کا ہاتھ پکڑا تھا اُس نے ایسا پیچ مارا کہ وہ دھڑام سے کمر کے بل جا پڑا۔ جتنی دیر میں نازی اُٹھے اُٹھے، دونوں نوجوان کود کے کار میں جا بیٹھے اور چل دیئے۔ آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹ گئی، اور لوگ بحث کرتے ہوئے چل پڑے۔ بہت ہی کم لوگ نازی کی حمایت کر رہے تھے۔ کئی آدمی یہودیوں کی طرف سے بول رہے تھے۔ لیکن زیادہ تر لوگوں نے شک آمیز انداز میں سر ہلانے اور یہ کہنے پر اکتفا کی: "یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے!"

جب میں تین گھنٹے بعد اس جگہ سے دوبارہ گزرا تو نازی ابھی تک سڑک پر پہرا دے رہا تھا اور اس تلاش میں تھا کہ کسی اور جرمن عورت کی عزت خطرے میں ہو تو اُس کی حفاظت کرے۔

ابھی فراؤلین میئر کے پاس سے خط آیا ہے۔ فراؤلین شریڈر نے خط سنانے کے لئے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ فراؤلین میئر کو ہالینڈ پسند نہیں۔ اُسے تیسرے درجے کے شہروں میں

جاکر دوسرے درجے کے قہوہ خانوں میں گانا سنانا پڑا ہے۔ اُس کے سونے کے کمرے میں اکثر گرمی کا انتظام کافی نہیں ہوتا۔ وہ لکھتی ہے کہ ہالینڈ کے لوگوں میں ذرا بھی تہذیب نہیں ہوتی۔ اُسے صرف ایک مہذب اور تربیت یافتہ آدمی ملا ہے، جس کی بیوی مر چکی ہے یہ آدمی اُس سے کہتا ہے کہ تم میں واقعی نسائیت ہے ـــــ اُسے سُٹر دنگی نوجوان لڑکیاں بالکل پسند نہیں۔ فراؤلین میئر کے فن کی داد دینے کے لئے اُس نے لباس کے نیچے پہننے کے کپڑوں کا پورا سٹ تحفے میں دیا ہے۔

فراؤلین میئر کا اپنے ساتھ کی گانے والیوں سے بھی جھگڑا ہو چکا ہے۔ اس کی ایک رقیب ایکٹریس نے جسے فراؤلین میئر کی آواز پر بڑا حسد تھا، ایک دن ہیٹ میں لگانے کے پن سے اُس کی آنکھ پھوڑنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان دونوں میں نوچ کھسوٹ ہونے لگی۔ آخر جب لڑائی ختم ہوئی تو وہ ایکٹریس اتنی بُری طرح زخمی تھی کہ ہفتے بھر تک اسٹیج پر نہیں آسکی۔

کل رات فرٹز وینڈل نے تجویز پیش کی کہ عشرت گاہوں کا دورہ کیا جائے۔ یہ گویا ایک طرح کی رخصتی ملاقات تھی، کیونکہ پولیس نے ان جگہوں سے بڑی دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ ان پر کئی دفعہ دھاوا ہوا ہے اور وہاں آنے والوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ بلکہ سننے میں آیا ہے کہ برلن کی بالکل ہی صفائی ہونے والی ہے۔

میں نے اصرار کیا کہ سیلوے چلیں، کیونکہ میں نے یہ جگہ نہیں دیکھی تھی۔ یہ سُن کے فرٹز بڑا گڑبڑایا۔ عشرت گاہوں کے ماہر کی حیثیت سے وہ اس جگہ کو بڑی حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ دراصل یہ تو قحبہ خانہ ہے بھی نہیں۔ اسے تو صرف

برلن کے باہر سے آنے والے تماشائیوں کے لئے کھولا گیا ہے۔

سیلومے میں خرچ تو بہت ہوا مگر یہ جگہ نکلی اتنی مایوس کُن کہ میرے ذہن میں بھی نہیں تھا۔ استلذاذ بالمثل کی شوقین دو چار ایکٹرسیں اور کچھ نوجوان جن کی بھنویں اکھڑی ہوئی تھیں شراب کی میز کے گرد کھڑے تھے اور وقتاً فوقتاً عجیب و غریب آوازیں نکالتے تھے ـــــ جو غالباً اُن کے نزدیک لعنت زدہ لوگوں کے قہقہے کی نمائندگی کرتی تھیں ؛ یہاں ہر چیز کا رنگ سنہرا یا جہنّم کی طرح سُرخ تھا ـــــ بہت موٹے موٹے قرمزی رنگ کے گدّے تھے اور بڑے بڑے مطلّا آئینے لگے ہوئے تھے۔ کمرہ خوب بھرا ہوا تھا۔ حاضرین میں زیادہ تر ادھیڑ عمر کے شریف تاجر اور اُن کے خاندانوں کے لوگ تھے جو بڑے خوش دلانہ تحیّر کے ساتھ کہہ رہے تھے : "کیا واقعی یہ لوگ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں ؟" اور "اچھا ، میں نے تو آج تک نہیں سُنا!" اتنے میں ناچ گانا شروع ہوگیا۔ ایک نوجوان عورتوں کا سا زرکار لباس پہنے اور سینے پر انگیا کی سی جواہرات سے لپی ہوئی چڑیاں لگائے ایک عجیب تکلیف دہ انداز سے ناچنے لگا۔ ہم بیچ میں ہی اُٹھ کر چلے آئے۔

دروازے پر ہمیں کچھ امریکن نوجوان ملے، جو نشے میں دُھت تھے اور سوچ رہے تھے کہ اندر جائیں یا نہ جائیں۔ اُن کا رہنما ایک چھوٹے سے قد کا گٹھیلا نوجوان تھا جو بے کمانیوں کی عینک لگائے تھا ، اور جس کا جبڑا اتنا اُبھرا ہوا تھا کہ دیکھ کے جھنجلاہٹ ہوتی تھی۔

"کیوں ؟" اُس نے فرٹز سے پوچھا۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے ؟"

"عورتوں کے سے کپڑے پہنے ہوئے مرد ناچ رہے ہیں۔" فرٹز طنزاً مسکرایا۔

پستہ قد امریکن کو یقین نہ آیا۔ "عورتوں کے لباس میں مرد ؟ عورتوں کے لباس میں؟

تو تمہارا مطلب ہے کہ وہ بڑے عجیب معلوم ہوتے ہیں ؟"

"یوں تو ہم سب ہی عجیب قسم کے ہیں۔" فرٹز نے مغموم لہجے میں بڑی سنجیدگی سے کہا۔ اُس نوجوان نے ہمیں اُوپر سے نیچے تک دیکھا۔ وہ بھاگا ہوا آرہا تھا اور ابھی تک اس کا سانس پھول رہا تھا۔ باقی سب کچھ گڑبڑائے ہوئے سے اُس کے پیچھے جمع تھے اور ہر بات کے لئے تیار تھے ـــــ حالانکہ لیمپ کی ہری ہری روشنی میں اُن کے کھلے ہوئے منہ اور ناپختہ چہروں سے تھوڑا سا ڈر ٹپک رہا تھا۔

"تم بھی عجیب قسم کے ہو؟" پستہ قد امریکن نے یکایک میری طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "بہت عجیب۔"

وہ تھوڑی دیر اسی طرح ہانپتا ہوا اور اپنا جبڑا آگے نکالے میرے سامنے کھڑا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ میرے منہ پر گھونسہ مارے یا نہ مارے۔ پھر وہ مڑا اور کچھ کالج کی سے قسم کا وحشیانہ نعرہ لگایا اور سیدھا عمارت کے اندر گھس گیا۔ دوسرے لوگ بھی اُس کے پیچھے چلے گئے۔

"کبھی چڑیا گھر کے قریب کیمونسٹوں کی عشرت گاہ میں بھی گئے ہو؟" جب ہم سیلو سے واپس ہو رہے تھے تو فرٹز نے مجھ سے پوچھا۔ "وہاں بھی ایک نظر جھانک آنا چاہیئے ..... ممکن ہے چھ مہینے میں ہم سب لال قمیصیں پہنے ہوں۔"

میں تیار ہو گیا۔ مجھے تجسّس تھا کہ فرٹز کے دماغ میں "کیمونسٹ عشرت گاہ" کا تصوّر کس قسم کا ہے۔

یہ جگہ ایک سفید پُتی ہوئی کوٹھڑی تھی۔ بیٹھنے کے لئے لکڑی کی لمبی لمبی بنچیں تھیں، اور بڑی بڑی میزیں جن پر کوئی میز پوش نہیں تھا۔ کوٹھڑی میں کوئی ایک درجن

آدمی بیٹھے تھے. بس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی اسکول کا کھانے کا کمرہ، دیواروں پر پنسل کی بنائی ہوئی اظہار پرستانہ انداز کی تصویریں تھیں، جن میں اخباروں کے تراشے، تاش کے پتّے، شراب کے لیبل، دیا سلائی کے بکس، سگرٹ کی ڈبیاں اور فوٹو میں سے نکالے ہوئے سر چپکے ہوئے تھے. اس قہوہ خانے میں طالب علم بھرے ہوئے تھے. یہ سب کے سب لباس کے معاملے میں جارحانہ طور پر بے پروا تھے، اور اُن کے لباس سے اُن کی سیاست کا اظہار ہوتا تھا. مرد تو ملاحوں کے سے سویٹر اور داغ دار، ڈھیلے ڈھالے پتلون پہنے ہوئے تھے. اور لڑکیاں ایسے چھوٹے چھوٹے جمپر جو اُن کے ٹھیک آتے بھی نہ تھے. اُن کے دامن پنوں سے اس طرح جڑے ہوئے تھے کہ دور سے پن دکھائی دیتے تھے. انہوں نے بنجارنوں کی طرح گردن میں بڑی بے پروائی سے رومال باندھ رکھے تھے. قہوہ خانے کی مالکہ سگار پی رہی تھی. وہ لڑکا جو خادم کا کام کر رہا تھا ہونٹوں میں سگرٹ دبائے کبھی یہاں کھڑا ہو جاتا کبھی وہاں، اور گاہکوں سے آرڈر لیتے ہوئے اُن کی کمر تھپتھپاتا تھا.

یہاں کا ماحول بڑا مسرت خیز، زندہ دلانہ اور بالکل نقلی قسم کا تھا. یہاں آتے ہی آدمی مانوس ہو جاتا تھا. حسبِ معمول فرٹز کو یہاں بہت سے دوست مل گئے. اُس نے تین دوستوں سے میرا تعارف کرایا —— ان میں سے ایک آدمی کا نام تو مارٹن تھا دوسرا ورنر تھا جو آرٹ سیکھ رہا تھا، اور تیسری اُس کی محبوبہ اِنگے تھی. اِنگے چوڑی چکلی اور زندہ دل تھی. وہ ایک چھوٹا سا ہیٹ پہنے ہوئے تھی جس میں ایک پر لگا ہوا تھا. چنانچہ اُس کے اور ہنری ہشتم کے درمیان ایک عجیب قسم کی مشابہت پیدا ہو جاتی تھی. ورنر اور انگے تو برابر بولے چلے جا رہے تھے لیکن مارٹن خاموش بیٹھا تھا. وہ دُبلا پتلا

آدمی تھا۔ اُس کا رنگ بہت گہرا سُرخ اور چہرہ کلہاڑی جیسا تھا۔ وہ ایسے طعن آمیز انداز سے مسکراتا تھا جیسے اپنے آپ کو اوروں سے برتر سمجھ رہا ہو، اور اُسے اپنے سازشی ہونے کا علم ہو۔ تھوڑی دیر بعد جب فرٹز اور ورنر اور انگلے آگے بڑھ کے ایک اور ٹولی میں شامل ہو گئے تو مارٹن آنے والی خانہ جنگی کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ مارٹن نے بتایا کہ جب جنگ چھڑ جائے گی تو کمیونسٹ لوگ جن کے پاس بہت کم مشین گنیں ہیں، چھتوں پر جم جائیں گے۔ پھر وہ پولیس کو دستی بموں سے روکے رکھیں گے صرف تین دن تک مضبوطی سے جم کے لڑنا پڑے گا، کیونکہ روس کا سمندری بیڑا فوراً سوئنے مونڈے پہنچے گا اور فوجیں اُتارنا شروع کر دے گا۔ "میرا زیادہ وقت بم بنانے میں صرف ہوتا ہے۔" مارٹن نے کہا۔ میں نے سر ہلایا اور مسکرانے لگا۔ میں بڑے شش و پنج میں تھا کہ یہ شخص میرا مذاق اُڑا رہا ہے یا دیدہ دانستہ اتنی خوفناک ناعاقبت اندیشی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ نشے میں تو خیر وہ بالکل نہیں تھا، اور نہ وہ جنونی معلوم ہوتا تھا۔

اتنے میں کوئی سولہ سترہ سال کا بڑا خوبصورت لڑکا قہوہ خانے میں داخل ہوا۔ اُس کا نام روڈی تھا۔ وہ روسی قمیص، چمڑے کا نکرا اور بڑے بڑے بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ دلاورانہ انداز سے اکڑتا برتا ہماری میز کے پاس پہنچا جیسے کوئی ایلچی جو بڑی خطرناک مہم سے کامیابی کے ساتھ لوٹ آیا ہو۔ مگر یہ لڑکا کوئی پیغام نہیں لایا تھا۔ بگولے کی طرح اندر داخل ہونے، اور مختلف لوگوں سے فوجیوں کی طرح درشتی سے ہاتھ ملانے کے بعد وہ چپ چاپ آ کے ہمارے برابر بیٹھ گیا، اور چائے کا گلاس مانگا۔

آج شام میں "ان کمیونسٹ" قہوہ خانے میں پھر گیا۔ سازش اور پھر اس کے خلاف سازش کی یہ چھوٹی سی دنیا واقعی بڑی دلچسپ ہے۔ یہاں کا نپولین بم بنانے والا مارٹن ہے جس کی شکل ہی دیکھ کر بے چینی ہوتی ہے؛ ورنر یہاں کا داں توں ہے، اور روڈی ژاں دارک۔ یہاں ہر آدمی کو ہر دوسرے آدمی پر شبہ ہے۔ مارٹن مجھے ورنر کے خلاف تنبیہہ کر چکا ہے۔ مارٹن کا بیان ہے کہ ورنر "سیاسی اعتبار سے ناقابلِ اعتماد" ہے پچھلی گرمیوں میں اُس نے کمیونسٹ نوجوانوں کی ایک جماعت کا سارا روپیہ چرا لیا تھا۔ اور ورنر مجھے مارٹن سے آگاہ کر چکا ہے — وہ کہتا ہے کہ مارٹن یا تو نازیوں کا ایجنٹ ہے یا پولیس کا جاسوس، یا پھر اُسے فرانس کی حکومت سے پیسے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ مارٹن اور ورنر دونوں نے بڑے خلوص کے ساتھ مجھے نصیحت کی ہے کہ روڈی کے پاس بھی نہ پھٹکوں — لیکن انہوں نے یہ بالکل نہیں بتایا کہ آخر کیوں۔

لیکن روڈی کے پاس پھٹکنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا۔ وہ اپنے آپ میرے پاس آ بیٹھا اور فوراً باتیں کرنے لگا۔ وہ آدمی کیا ہے جوش و خروش کا ایک بگولا ہے۔ اُس کا محبوب فقرہ "بہت نفیس!" ہے۔ وہ اسکاؤٹ ہے۔ اُس نے پوچھا کہ انگلستان کے اسکاؤٹ کس قسم کے ہیں۔ "ان میں خطرے مول لینے کا جذبہ ہے یا نہیں؟" سارے کے سارے جرمن لڑکے دلیر ہوتے ہیں، اور خطرے مول لینے سے نہیں گھبراتے: خطرہ مول لینا بھی بہت نفیس چیز ہے۔ ہمارے اسکاؤٹ ماسٹر بہت نفیس آدمی ہیں۔ پچھلے سال وہ لیپ لینڈ گئے تھے اور گرمیوں بھر وہاں ایک جھونپڑی میں اکیلے رہے۔۔۔۔ آپ کمیونسٹ ہیں؟"

"نہیں۔ کیا آپ کمیونسٹ ہیں؟"

روڈی کو یہ سن کر بڑی تکلیف ہوئی.

"بالکل! یہاں تو ہم سب لوگ کمیونسٹ ہیں..... آپ چاہیں تو میں آپ کو کچھ کتابیں دوں..... آیئے کسی دن ہمارے کلب چلیے. بہت نفیس ہے..... وہاں ہم لوگ "لال جھنڈا" اور ایسے تمام گانے گاتے ہیں جن کی اجازت نہیں ہے...... آپ مجھے انگریزی پڑھا دیں گے؟ میں ساری زبانیں سیکھنا چاہتا ہوں."

میں نے پوچھا کہ آپ کی اسکاؤٹوں کی جماعت میں کچھ لڑکیاں بھی ہیں. روڈی اس طرح چونک پڑا جیسے میں نے کوئی گندی بات کہہ دی ہو.

"عورتیں بے کار ہوتی ہیں" اُس نے بڑی تلخی سے کہا. "وہ تو ہر کام بگاڑ دیتی ہیں. اُن میں خطرے مول لینے کی ہمّت نہیں ہوتی. مرد جب اکٹھّے مل کر بیٹھتے ہیں اور کوئی عورت قریب نہیں ہوتی، تو وہ ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں. پیٹر چچا (یعنی ہمارے اسکاؤٹ ماسٹر) کہتے ہیں کہ عورتوں کو تو چاہیئے کہ گھر بیٹھی جرابوں کی مرمّت کیا کریں. وہ تو بس اسی قابل ہیں!"

"کیا پیٹر چچا بھی کمیونسٹ ہیں؟"

"ہاں، بالکل!" رُوڈی نے شبہے کی نظروں سے میری طرف دیکھا. "آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"نہیں، کوئی خاص بات نہیں،" میں نے جلدی سے جواب دیا. "شاید مجھے اُن پر ایک اور آدمی کا شبہ ہو رہا تھا....."

آج [illegible] کہ جب خاں نے اپنے ایک شاگرد [illegible] سے ملنے گیا

جو وہاں ماسٹر ہے۔ وہ پستہ قد اور چوڑے کندھوں والا آدمی ہے۔ اُس کے بال پتلے پتلے اور مردہ سے ہیں، آنکھیں بہت ملائم ملائم، ماتھا بہت بھاری اور آگے کو نکلا ہوا جیسے محض ترکاریاں کھانے والے کسی جرمن عقلیت پرست کا۔ وہ چپلیں اور کھلے گلے کی قمیصیں پہنتا ہے۔ وہ مجھے ورزش گاہ میں ملا جہاں وہ دماغی طور پر بے فہم بچوں کی کلاس کو ورزش کرا رہا تھا۔ اس کلاس میں ایسے بچے بھی تھے جن کے دماغ میں کوئی خرابی تھی اور ایسے بھی تھے جنہوں نے کوئی جرم کیا ہو۔ اُس نے ایک عجیب غمناک فخر کے ساتھ مختلف بچوں کی طرف اشارہ کر کے اُن کے واقعات سنائے۔ ایک چھوٹے سے لڑکے کو خاندانی آتشک تھا۔ وہ بے انتہا بھینگا تھا۔ ایک اور بچہ تھا جس کے ماں باپ بہت کافی عمر کے تھے اور بہت شراب پیتے تھے۔ یہ بچہ اتنا ہنستا تھا کہ رُکنے ہی میں نہ آتا تھا۔ بچے بندروں کی طرح سلاخوں پر چڑھے ہوئے تھے اور ہنس ہنس کے باتیں کر رہے تھے، اور بے انتہا خوش معلوم ہوتے تھے۔

پھر ہم کارخانے کی طرف گئے۔ یہاں کچھ بڑی عمر کے لڑکے جو سب کے سب سزا یافتہ مجرم تھے پیڑے پہنے ہوئے جوتے بنا رہے تھے۔ جب برنگ اندر داخل ہوا تو زیادہ تر لڑکے اوپر دیکھ کر مسکرانے لگے۔ صرف دو چار لڑکے افسردہ سے بیٹھے رہے لیکن میں اُن لڑکوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ دیکھ سکا۔ مجھے بڑی شرم آ رہی تھی اور اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں انہیں قید میں رکھنے والوں کا، سرمایہ دارانہ سماج کا واحد نمائندہ ہوں میں سوچ رہا تھا کہ ان میں سے کوئی لڑکا انگلینڈ کے سینما میں تو گرفتار نہیں ہوا۔ اور اگر ایسا ہے تو اُس نے مجھے پہچانا یا نہیں۔

ہم نے میٹرن کے کمرے میں کھانا کھایا۔ ہر برنک نے معافی مانگی کہ آپ کو وہی کھانا دے رہا ہوں جو لڑکے کھاتے ہیں — یعنی آلو کا شوربا، گوشت کے دو ٹکڑے اور رُبھنے ہوئے سیب اور آلوچے۔ میں نے کہا کہ نہیں، بہت اچھا ہے — دراصل وہ مجھ سے یہی کہلوانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ خیال کہ اس عمارت میں لڑکوں کو یہ یا کسی اور قسم کا کھانا کھانا پڑتا ہے، میرے حلق سے نوالا اُترنے نہیں دے رہا تھا۔ کسی ادارے کے کھانے میں ایک ناقابلِ بیان قسم کا مزا ہوتا ہے، بلکہ شاید مزا ہوتا ہی نہیں صرف تخیّل کو ایسا محسوس ہوتا ہے (مجھے اپنی اسکول کی زندگی کی جتنی ناخوشگوار باتیں یاد ہیں اُن میں سے ایک معمولی سفید روٹی کی بُو ہے۔)

"یہاں نہ تو سلاخیں ہیں نہ دروازوں میں تالا پڑا ہوا ہے" میں نے کہا۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ بچّوں کے سارے جیل خانوں میں یہ چیزیں ہوتی ہونگی..... آپ کے لڑکے بھاگتے نہیں؟"

"بہت کم،" برنک نے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس اعتراف سے اُسے بڑی تکلیف ہوئی ہے۔ اُس نے بڑی خستگی کے ساتھ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ "بھاگ کر جائیں تو کہاں؟ یہ جگہ بُری ہے۔ مگر گھر تو اس سے بھی بدتر ہے۔ یہ بات سب لڑکے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"لیکن آزادی کی خواہش بھی تو انسان کی فطرت میں داخل ہے؟"

"ہاں آپ درست فرما رہے ہیں۔ لیکن تھوڑے دن بعد لڑکوں میں یہ خواہش باقی ہی نہیں رہتی۔ یہاں کے طور طریقے ہی ایسے ہیں کہ آزادی کی خواہش باقی رہ ہی نہیں سکتی۔ میرا خیال ہے کہ شاید جرمنوں میں یہ خواہش بہت شدید ہوتی ہی نہیں۔

"تو یہاں آپ لوگوں کو زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی؟"

"ہاں کبھی کبھی..... تین مہینے ہوئے ایک بڑی ہولناک بات ہوئی۔ ایک لڑکے نے دوسرے لڑکے کا اوورکوٹ چرالیا۔ اس نے شہر میں جانے کی اجازت مانگی ——— لڑکوں کے شہر جانے پر پابندی نہیں ہے۔ شاید وہ اسے بیچنا چاہتا تھا، لیکن جس لڑکے کا وہ کوٹ تھا وہ اس کے پیچھے پیچھے گیا اور ان دونوں کی خوب لڑائی ہوئی۔ جس لڑکے کا اوورکوٹ تھا اس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور دوسرے لڑکے کے کھینچ مارا۔ اس لڑکے نے جو دیکھا کہ میرے چوٹ لگ گئی ہے۔ تو اس نے جان بوجھ کے زخم پر مٹی مل لی، تاکہ زخم کی حالت خراب ہو جائے اور وہ سزا سے بچ جائے۔ زخم کی حالت خراب ہوگئی اور خون میں زہر پھیل گیا۔ تین دن کے اندر لڑکا مر گیا۔ جب دوسرے لڑکے کو اس کا پتہ چلا تو اس نے باورچی خانے کی چھری سے خودکشی کر لی..... " برنک نے بڑا گہرا سانس لیا۔ "بعض دفعہ تو میں بڑا ناامید ہو جاتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ایک قسم کی بدی وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔"

"لیکن آپ لوگ ان لڑکوں کی اصلاح کس طرح کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان لوگوں میں بہت ہی کم تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ ہم انہیں کوئی نہ کوئی کام سکھا دیتے ہیں، پھر انہیں کہیں نوکر رکھانے کی کوشش کرتے ہیں ——— جو تقریباً ناممکن ہے۔ اگر انہیں کہیں قریب نوکری مل جائے تو وہ رات کو یہاں سو بھی سکتے ہیں..... پرنسپل صاحب کا عقیدہ ہے کہ عیسوی مذہب کی تعلیم سے ان لوگوں کی زندگیوں کو بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن مجھے یہ بات ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ مسئلہ اتنا سیدھا سادا نہیں ہے۔ اگر ان لوگوں کو کام نہ ملا تو ان میں سے زیادہ تر جرائم پیشہ ہو جائیں گے۔ آخر آپ لوگوں کو بھوکا مرنے پر تو مجبور نہیں کر سکتے؟"

"کیا کوئی اور صورت نہیں نکل سکتی ؟"

برنک اٹھا اور مجھے کھڑکی کے پاس لے گیا۔

"آپ وہ دو عمارتیں دیکھ رہے ہیں ؟ ایک تو انجنیئری کا کارخانہ ہے، دوسرا جیل خانہ۔ اس علاقے کے لڑکوں کے لئے یہی دو صورتیں تھیں..... لیکن اب کارخانے کا دوالہ نکل گیا ہے۔ اگلے ہفتے کارخانہ بند ہو جائے گا۔"

آج صبح میں روڈی کا کلب دیکھنے گیا۔ یہ اسکاؤٹوں کے ایک رسالے کا دفتر بھی ہے، اس رسالے کا ایڈیٹر اور اسکاؤٹ ماسٹر چچا پیٹر ایک بڑا وحشت زدہ اور نوجوان نما آدمی ہے اس کا چہرہ چرمی کاغذ کے سے رنگ کا ہے' اور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی ہیں۔ وہ موٹے سے کپڑے کی جیکٹ اور نکر پہنتا ہے۔ روڈی تو بس بالکل اس کی پرستش کرتا ہے۔ روڈی کی باتیں اگر کبھی بند ہوتی ہیں تو صرف اس وقت جب چچا پیٹر کچھ کہنا چاہتا ہو۔ ان دونوں نے مجھے لڑکوں کے درجنوں فوٹو دکھائے۔ یہ سب تصویریں کیمرہ کا منھ اوپر کرکے نیچے سے لی گئی تھیں چنانچہ لڑکے بادلوں کے پس منظر کے ساتھ رزمیہ داستانوں کے دیوؤں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ رسالے میں شکار کھیلنے، راستہ ڈھونڈنے اور کھانا پکانے کے متعلق مضامین ہیں ــــــ یہ سب مضامین انتہائی جوش و خروش کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور ان میں ایک عجیب قسم کا جنون جھلکتا ہے گویا ان مضمونوں میں جن چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ کسی مذہبی یا شہوانی رسم کا حصہ ہیں۔ اس کمرے میں ہمارے ساتھ کوئی آدھی درجن اور لڑکے تھے۔ سب کے سب سپاہیانہ نیم برہنگی کی حالت میں تھے۔ حالانکہ موسم اتنا سرد ہے مگر یہ لوگ بہت ہی مختصر نکر، بڑی باریک قمیصیں پہنے ہوئے تھے۔

جب میں تصویریں دیکھ چکا تو روڈی مجھے اس کمرے میں لے گیا جہاں کلب کے ممبروں کا جلسہ ہوتا ہے۔ دیواروں پر لمبے لمبے رنگین جھنڈے لٹکے ہوئے تھے جن پر حروف اور پراسرار قسم کے نشانات کڑھے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایک سرے پر ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی جو قرمزی رنگ کے زرکار کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی ـــــ یہ ایک قسم کی قربان گاہ تھی میز پر پیتل کے شمع دانوں میں موم بتیاں رکھی تھیں۔

"یہ بتیاں ہم جمعرات کے دن جلاتے ہیں۔" روڈی نے بتایا "اُس دن ہمارا مشاورتی جلسہ ہوتا ہے، کیمپ لگتا ہے اور آگ جلائی جاتی ہے۔ پھر ہم فرش پر حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور گانے گاتے ہیں، کہانیاں سناتے ہیں۔"

موم بتیوں والی میز پر ایک چوکھٹے دار تصویر لگی ہوئی تھی جسے یہاں گویا پوجنے کے لئے رکھا گیا تھا۔ اس تصویر میں ایک اسکاؤٹ دکھایا گیا تھا جو حسن میں فرشتوں کا مقابلہ کرتا تھا، اور ہاتھ میں جھنڈا لئے ہوئے سخت نظروں سے کہیں دور دیکھ رہا تھا۔ یہاں کی فضا کچھ ایسی تھی کہ میں بڑی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ جتنی جلدی ہو سکا میں نے معافی مانگی اور وہاں سے چلا آیا۔

یہ گفتگو میں نے ایک قہوہ خانے میں سنی:۔ ایک نوجوان نازی اپنی محبوبہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ وہ اپنی جماعت کے مستقبل کے بارے میں بحث کر رہے ہیں۔ نازی نشے میں ہے۔

"یہ تو مجھے معلوم ہے کہ ہماری فتح ضرور ہوگی۔" وہ بڑے اضطراب کے ساتھ کہتا ہے،

"لیکن یہ کافی نہیں ہے!" وہ میز پر مکے مارتا ہے "خون ضرور بہنا چاہیئے!"

لڑکی اُسے یقین دلانے کے لئے اُس کا بازو تھپکتی ہے۔ وہ اُسے گھر چلنے پر آمادہ کرتی

ہے۔" ہاں ہاں، خون ضرور بہے گا، پیارے۔" وہ اُسے تسلّی دیتے ہوئے فاختہ کی سی آواز بنا کے کہتی ہے۔" ہمارے قائد نے وعدہ کر لیا ہے کہ یہ چیز ہمارے پروگرام میں شامل ہے۔"

آج "نقرئی اتوار" ہے۔ سڑکوں پہ خرید و فروخت کرنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ ٹاؤنٹنٹ زین اسٹراسے پر مرد، عورتیں اور لڑکے کارڈ، پھول، گانوں کی کتابیں، سر میں لگانے کا تیل اور کنگن بیچتے پھر رہے ہیں۔ ٹریم کی بیچ والی لائن کے راستے میں کرسمس کے درخت ٹھساٹھس بھرے ہوئے ہیں۔ نازی جماعت کے وردی پوش رضاکار اپنے چندے کے ڈبے کھنکاتے پھر رہے ہیں۔ برابر والی سڑکوں پہ پولیس کی لاریاں انتظار میں ہیں، کیونکہ آج کل تو یہ حال ہے کہ ہر ہجوم سیاسی فساد میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ وٹن برگ پلاٹس پر مکتی فوج نے ایک بہت بڑا روشن پیڑ لگایا ہے جس کے اُوپر بجلی کا نیلا ستارہ چمک رہا ہے۔ اس کے گرد طالب علموں کی ایک ٹولی کھڑی فقرے کس رہی تھی۔ ان میں میں نے "کمیونسٹ" قہوہ خانے والے وزنر کو پہچان لیا۔

وزنر کہنے لگا۔" اگلے سال اس زمانے تک اس ستارے کا رنگ بدل گیا ہوگا!"

وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس وقت اسے بڑا جوش آ رہا تھا، بلکہ اُس پر ہلکا سا جنون طاری تھا۔ اُس نے بتایا کہ کل اُس کے ساتھ ایک بڑا زبردست واقعہ پیش آیا تھا۔" تین دوسرے ساتھیوں نے اور میں نے فیصلہ کیا کہ نیو کولن میں لیبر ایکسچینج کے سامنے مظاہرہ کریں گے۔ مجھے تو تقریر کرنی تھی اور دوسروں کو یہ دیکھنا تھا کہ کوئی آدمی تقریر کے دوران میں گڑبڑ نہ کرے۔ ہم کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب وہاں گئے۔ اس وقت

وہاں بہت بھیڑ ہوتی ہے۔ ہم نے سب باتوں پر پہلے ہی سے غور کر لیا تھا۔ یہ طے ہو گیا تھا کہ ہم میں سے ہر آدمی ایک ایک دروازہ گھیرے گا تاکہ دفتر کا کوئی کلرک باہر نہ نکل سکے۔ کلرک لوگ دفتر میں اس طرح بند تھے جیسے دڑبے میں مرغیاں..... ہم جانتے تھے کہ وہ پولیس کو فون کر سکتے ہیں اور اسے روکنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ ہم نے حساب لگایا تھا کہ ہمیں چھ یا سات منٹ ملیں گے..... اچھا تو جیسے ہی کہ میرے ساتھی دروازوں پر پہنچے میں کود کے ایک میز پر چڑھ گیا اور جو کچھ میرے منھ میں آیا بکتا چلا گیا —— پتہ نہیں کہ میں نے کیا کہا کیا نہیں۔ بہرحال لوگوں کو میری باتیں بہت پسند ہیں..... آدھے منٹ میں میں نے انہیں اتنا گرما دیا کہ مجھے خود ڈر لگنے لگا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ اب لوگ دفتر میں گھس جائیں گے اور کسی کو پکڑ کے مار ڈالیں گے۔ غرض کہ بڑا غل غپاڑا مچ رہا تھا۔ لیکن جب ذرا دلگی آنی شروع ہوئی تو نیچے سے ایک ساتھی نے آ کے بتایا کہ پولیس آ گئی ہے اور کار سے اتر رہی ہے۔ چنانچہ ہمیں جان بچا کے بھاگنا پڑا..... شاید پولیس ہمیں پکڑ لیتی لیکن ہجوم ہماری طرف تھا، اور جب تک ہم دوسرے دروازے سے نکل کے سڑک پر پہنچ نہیں گئے لوگوں نے پولیس کو نکلنے نہیں دیا.....» ورنر نے اپنی کہانی ختم کی تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ «میں تم سے ٹھیک کہتا ہوں کرسٹفر، اب سرمایہ دارانہ نظام زیادہ دن نہیں چل سکتا۔ مزدور اب اٹھ کھڑے ہوئے ہیں!»

آج شام میں بیولواسٹراسے میں تھا۔ وہاں نازیوں کا بہت بڑا جلسہ ہوا تھا۔ بادامی یا کالی وردیاں پہنے ہوئے مردوں اور لڑکوں کی ٹولیاں جلسے سے نکل کر آ رہی تھیں۔ ان لوگوں کے آگے تین رضاکار چل رہے تھے۔ سب کے کندھوں پر رائفلوں کی

طرح نازی جھنڈے تھے۔ جھنڈے ڈنڈوں پہ لپٹے ہوئے تھے، جن کے آگے دھات کی نکیلی شام لگی ہوئی تھی اور نوک تیر کی سی شکل کی تھی۔

اتنے میں ان تینوں رضاکاروں کی مڈبھیڑ ایک سترہ اٹھارہ سال کے نوجوان سے ہوئی جو معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھا اور بہت تیزی سے دوسری طرف جا رہا تھا۔ ایک نازی چیخا دیر رہا!" اور تینوں رضاکار اس نوجوان پر ٹوٹ پڑے۔ اُس نے زور سے چیخ ماری اور نکل بھاگنے کی کوشش کی، لیکن ان تینوں نے بڑی تیزی سے کام لیا۔ آنکھ جھپکتے میں وہ اُسے ایک مکان کے پھاٹک کے نیچے لے گئے اور اُسے گرا کے ٹھوکریں مارنے لگے اور اپنے جھنڈوں کی تیز نوک سے کونچنے لگے۔ یہ ساری باتیں ایسی ناقابلِ یقین سرعت سے ہوئیں کہ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا — اتنی دیر میں یہ تینوں رضاکار اپنے شکار کو وہیں چھوڑ کے چل بھی دیئے تھے اور بھیڑ میں لوگوں کو ہٹاتے ہوئے جا رہے تھے۔ وہ سیدھے اُس زینے پر پہنچے جو اُوپر اُوپر چلنے والی ریل کے اسٹیشن کو جاتا تھا۔

میں اور ایک اور راہگیر سب سے پہلے اُس جگہ پہنچے جہاں وہ نوجوان پڑا تھا۔ وہ ایک کونے میں ایسے مڑا تڑا پڑا تھا جیسے کوئی بوری پھینک گیا ہو۔ جب اُسے اٹھایا گیا تو مجھے اُس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آئی جس سے میں کانپ اٹھا — اُس کی بائیں آنکھ باہر نکل آئی تھی اور زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک آدمی نے اُسے کار میں اسپتال پہنچا دینے کا ذمہ لیا۔

اس وقت تک بیسیوں لوگ تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں حیرت تو ہوئی ہے لیکن کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ اس قسم کی باتیں آجکل ہوتی ہی رہتی ہیں! اُنہوں نے بس اتنا کہا، "یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے!" ایک قدم آگے سڑک کے نکڑ پر مسلح

پولیس کی ایک ٹولی کھڑی تھی۔ وہ بڑی شان سے سینہ نکالے پستولوں پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے، اور اس واقعہ سے بالکل بے اعتنائی برت رہے تھے۔

ورنر ہیرو بن گیا ہے۔ دو تین دن ہوئے اُس کی تصویر "سرخ پرچم" میں نکلی تھی جس کے نیچے لکھا تھا، "پولیس کی خونریزی کا ایک اور شکار۔" کل یعنی نئے سال کے دن میں اسپتال میں اُسے دیکھنے گیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ کرسمس کے بعد ہی کہیں سڑک پہ لڑائی ہوئی تھی۔ ورنر ہجوم کے باہر کھڑا تھا، اور اُسے معلوم نہیں تھا کہ لڑائی کس بات پہ ہو رہی ہے۔ اس خیال سے کہ شاید یہ کوئی سیاسی چیز ہو اُس نے چیخنا شروع کر دیا، "سرخ محاذ!" ایک پولیس والے نے اُسے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ ورنر نے پولیس والے کے پیٹ میں لات ماری۔ پولیس والے نے ریوالور نکال لیا اور ورنر کی ٹانگ میں تین گولیاں ماریں۔ اس کے بعد اُس نے ایک اور پولیس والے کو بُلایا اور دونوں نے اُسے اٹھا کے کار میں ڈال دیا۔ تھانے جاتے ہوئے پولیس والے نے اُس کے سر پہ ڈنڈے مارے، یہاں تک کہ وہ بیہوش ہو گیا۔ جب وہ اچھا ہو جائے گا تو غالباً اُس پر مقدمہ چلے گا۔

اُس نے یہ ساری کہانی بڑے اطمینان کے ساتھ سُنائی۔ وہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا اور چاروں طرف اُس کے مدّاح دوست جمع تھے۔ ان میں روڈی اور انگے بھی تھے، جو اپنا ہنری ہشتم والا ہیٹ اوڑھے ہوئے تھے۔ ورنر کے چاروں طرف کمبل پر اخباروں کے تراشے پڑے تھے۔ جہاں جہاں ورنر کا نام آیا تھا اُس کے نیچے کسی نے لال پنسل سے بڑی احتیاط کے ساتھ نشان لگا دیا تھا۔

آج ۲۲ جنوری کو نازیوں نے بیو لو پلاٹس میں ایک مظاہرہ کیا۔ پچھلے ایک ہفتے سے کمیونسٹ لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ اس مظاہرے پہ پابندی لگ جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا مقصد محض اشتعال انگیزی ہے، اور واقعی ہے بھی ایسا ہی۔ میں اخباروں کے نمائندے فرینک کے ساتھ تماشا دیکھنے گیا۔

جیسا کہ بعد میں فرینک نے کہا، یہ نازیوں کا مظاہرہ بالکل نہیں تھا بلکہ پولیس کا مظاہرہ تھا ـــــ ایک نازی کے مقابلے میں دو پولیس والے موجود تھے۔ شاید جنرل شلائخر نے اس مظاہرے کی اجازت صرف یہ دکھانے کے لئے دی تھی کہ برلن کا اصلی مالک کون ہے۔ ہر آدمی کہہ رہا ہے کہ جنرل فوجی حکومت کا اعلان کرنے والا ہے۔

لیکن برلن کے اصلی مالک نہ تو پولیس والے ہیں نہ فوج والے اور نازی تو بالکل ہی نہیں۔ برلن کے مالک مزدور ہیں ـــــ میں نے جتنی پراپیگنڈے کی چیزیں سنی اور پڑھی ہیں، جتنے مظاہروں کا تماشا دیکھا ہے اُن سب کے باوجود میں نے پہلی مرتبہ یہ بات محسوس کر لی۔ بیو پلاٹس کی سڑکوں کے قریب سینکڑوں لوگ جمع تھے۔ ان میں سے بہت ہی کم منظم قسم کے کمیونسٹ ہوں گے۔ لیکن محسوس ہوتا تھا کہ ہر آدمی اس مظاہرے کے خلاف ہے۔ کسی آدمی نے کمیونسٹوں کا گیت گانا شروع کر دیا، ایک لمحے میں ہر آدمی گانے میں شامل ہو گیا، یہاں تک کہ اوپر کی منزلوں کی کھڑکیوں میں جو عورتیں اپنے بچوں کو لئے کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ وہ بھی گانے لگیں۔ نازی لوگ اپنے محافظوں کی دُہری قطاروں کے درمیان چپ چاپ، کان دبائے بڑی تیزی سے گزرتے چلے گئے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کی آنکھیں زمین کی طرف تھیں، یا بالکل

آگے کی طرف تک رہی تھیں جیسے شیشے کی ہوں۔ دو چار آدمیوں نے ڈرتے ڈرتے طنزاً مسکرانے کی کوشش کی۔ جب جلوس گزر گیا تو ایک کافی عمر کا موٹا سا پستہ قد رضا کار جو کسی طرح پیچھے رہ گیا تھا ہانپتا کانپتا بھاگا ہوا آیا، اُسے اپنے آپ کو اکیلا پاکر بڑی گھبراہٹ ہو رہی تھی اور وہ دوسروں کے ساتھ ملنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ہجوم کے قہقہوں سے فضا گونج اٹھی۔

مظاہرے کے دوران میں کسی کو بیولو پلاٹس میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ ہجوم بے چینی سے اُدھر اِدھر پھر رہا تھا۔ معاملہ کچھ خطرناک صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ پولیس رائفلیں دکھا دکھا کر ہمیں پیچھے ہٹنے کا حکم دے رہی تھی۔ کچھ ناتجربہ کار پولیس والوں نے تنگ آکے اس طرح بندوقیں اٹھالیں جیسے گولی چلانے والے ہوں۔ پھر ایک مسلح گاڑی آئی اور اپنی مشین گنیں ہماری طرف آہستہ آہستہ گھمانے لگی۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی، اور لوگ مکانوں کے دروازوں اور قہوہ خانوں میں گھسنے لگے۔ لیکن کار کے جاتے ہی ہر آدمی پھر باہر نکل آیا اور چیخ پکار اور گانا شروع ہو گیا۔ یہ سارا ہنگامہ اسکول کے شریر لڑکوں کا سا کھیل معلوم ہوتا تھا، اور اسے سنجیدگی سے خطرناک چیز سمجھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ فرینک کو بڑا مزا آ رہا تھا، اور وہ کھلکھلائے پڑ رہا تھا۔ اپنے بڑے بڑے دامنوں والا اوور کوٹ پہنے اور اُلّو کی آنکھوں جیسی عینک لگائے وہ کسی بے ہنگم اور مسخری چڑیا کی طرح اِدھر سے اُدھر اچکتا پھر رہا تھا۔

اُوپر جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اسے لکھے ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا ہے نئی لائی خبر نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ فوجی افسروں سے جو کچھ بن پڑا انہوں نے کیا۔ مٹلر نے ہوگن برگ

کے ساتھ مل کر وزارت بنالی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وزارت بہار تک بھی نہیں چل سکتی۔

اخبار کسی اسکول کے رسالے کی طرح ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اُن میں نئے قانونوں، نئی سزاؤں اور اُن لوگوں کی فہرستوں کے علاوہ کچھ ہوتا ہی نہیں جنہیں نظر بند کر دیا گیا ہے: آج صبح گیرنگ نے غداری کی تین نئی قسمیں ایجاد کی ہیں۔

ہر روز صبح کو میں یادگار والے گرجا کے قریب فنکاروں کے آدھے خالی قہوہ خانے میں بیٹھتا ہوں، جہاں یہودی اور بائیں بازو والے سنگِ مرمر کی میزوں پر سر جھکائے ہلکی ہلکی ڈری ہوئی آوازوں میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر جانتے ہیں کہ انہیں ضرور گرفتار کر لیا جائے گا ــــــ آج نہیں تو کل، یا اگلے ہفتے۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے سے بڑی نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ ٹوپی اتار کے سلام کرتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کے خاندانوں کی خیریت پوچھتے ہیں۔ بہت سی مشہور ادبی لڑائیاں جو کئی برس سے چل رہی تھیں بھلا دی جا چکی ہیں۔

تقریباً ہر روز صبح کو نازی رضاکار قہوہ خانے میں آتے ہیں، بعض دفعہ وہ صرف چندہ جمع کرتے ہیں۔ ہر آدمی کو مجبوراً کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔ بعض دفعہ وہ کسی کو گرفتار کرنے آتے ہیں۔ ایک دن ایک یہودی مصنف جو اس موقعے پر موجود تھا پولیس کو بلانے کے لئے ٹیلیفون کی کوٹھڑی میں گھس گیا، نازی لوگ اُسے کھینچ کر باہر لے آئے اور پکڑ لے گئے۔ کسی نے ایک انگلی تک نہیں ہلائی۔ جب تک وہ چلے نہیں گئے مکمل خاموشی چھائی رہی۔

اخباروں کے غیر ملکی نمائندے ہر روز رات کو ایک ہی اطالوی رستوراں میں کھانا کھاتے ہیں۔ وہ سب ایک کونے میں ایک بڑی سی گول میز کے گرد بیٹھتے ہیں۔ رستوراں میں باقی

جتنے لوگ ہوتے ہیں وہ انہیں غور سے دیکھتے رہتے ہیں اور یہ سننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اُن میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ اگر کسی آدمی کو انہیں کوئی خبر پہنچانی ہو ــــ مثلاً کسی گرفتاری کی تفصیلات یا نازیوں کے کسی شکار کا پتہ جس کے رشتہ داروں سے ملنا لازمی ہو ــــ تو ایک اخبار نویس میز پر سے اُٹھ کر اس کے ساتھ باہر سڑک پر چلا جاتا ہے اور ٹہل ٹہل کے باتیں کر لیتا ہے

میں ایک نوجوان کمیونسٹ سے واقف ہوں۔ نازیوں کے رضا کاروں نے اُسے گرفتار کر لیا اور اپنی بارک میں لے گئے اور وہاں اُسے خوب مارا پیٹا۔ تین چار دن بعد اُسے رہائی ملی اور وہ گھر آیا۔ اگلے دن صبح کو کسی نے اُس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ پٹی میں اپنا بازو لٹکائے لڑکھڑاتا ہوا آیا اور دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک نازی چندہ جمع کرنے کا صندوقچہ لئے کھڑا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی کمیونسٹ کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ چیخ کے بولا، "تم نے مجھے اتنا تو پیٹ لیا۔ کیا اب بھی پیٹ نہیں بھرا؟ اور اب تم مجھ سے روپیہ مانگنے آ رہے ہو؟"

لیکن نازی مسکرانے لگا۔ "خیر، خیر، دوست کوئی بات نہیں ہے! اب سیاسی لڑائی جھگڑے نہیں ہونے چاہئیں، یاد رکھو ہم تیسری سلطنت کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں! ہم سب بھائی ہیں! اس احمقانہ سیاسی نفرت کو اپنے دل سے دور کر دو!"

آج شام میں کلائسٹ اسٹرا سے میں ایک روسی چائے خانے میں گیا۔ وہاں مجھے ڈ ملا۔ ایک لمحے کے لئے تو واقعی میں سمجھا کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے حسبِ معمول بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور اُس کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔

"ارے!" میں نے بڑے آہستہ سے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"
ڈ مسکرانے لگا۔ "تمہارا خیال تھا کہ میں باہر چلا گیا ہوں گا؟"

"ہاں، ظاہر ہے......"

"لیکن آج کل حالات بڑے دلچسپ ہیں......"

میں ہنسنے لگا۔ "ہاں، بات کا ایک پہلو یہ بھی ہے..... لیکن تمہارے لئے تو بڑا خطرہ ہے؟"

ڈ صرف مسکرا دیا۔ پھر وہ اُس لڑکی کی طرف مخاطب ہوا جس کے ساتھ وہ بیٹھا تھا، اور بولا، "یہ مسٹر اشروڈ ہیں..... تم ان سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کر سکتی ہو۔ انہیں بھی نازیوں سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی ہمیں۔ مسٹر اشروڈ فسطائیوں کے پکّے دشمن ہیں!"

وہ قہقہہ مار کے ہنسنے لگا اور میری کمر ٹھونکنے لگا۔ ہمارے گرد جو آدمی بیٹھے تھے انہوں نے اُس کی بات سن لی۔ اُن کا ردِّ عمل بھی بڑا عجیب و غریب تھا۔ یا تو انہیں اپنے کانوں پر اعتبار ہی نہیں آیا، یا انہیں اتنا ڈر لگا کہ وہ ایسے بن گئے، جیسے کچھ سُنا ہی نہیں اور ایک عجیب گونگی خوفزدگی کے عالم میں اپنی چائے پینے لگے۔ میں نے عمر بھر میں کبھی اتنی بے چینی محسوس نہیں کی جتنی اس وقت۔

(بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ ڈ کے طریقہ کار میں بھی چند خوبیاں تھیں۔ وہ کبھی گرفتار نہیں ہوا۔ دو مہینے بعد وہ اطمینان سے سرحد پار کر کے ہالینڈ جا پہنچا۔)

آج صبح میں بیولو اسٹراسے پر ٹہل رہا تھا تو دیکھا کہ نازیوں نے ایک آزاد خیال اور صلح پسند چھوٹے سے ناشر کے مکان پر دھاوا بول رکھا ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایک لاری

بچاری فراؤلین شریڈر کو کسی طرح قرار نہیں آ رہا۔ "ہراسی ڈو، مجھے آپ جیسا شریف دمی نہیں ملے گا — ایسا کون ہو گا جو ہمیشہ ٹھیک وقت پہ کرایہ ادا کرے ۔۔۔۔ پتہ نہیں پ اس طرح یکایک برلن کو کیوں چھوڑ رہے ہیں ۔۔۔۔۔"

اُنہیں سمجھانا یا سیاسی معاملات کے متعلق باتیں کرنا بالکل بیکار ہے۔ انہوں نے اپنے آپ نئے حالات کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اسی طرح ہر نئی حکومت کے سانچے میں ڈھل سکتی ہیں۔ آج صبح میں نے یہاں تک سُنا کہ وہ دربان کی بیوی سے بڑے احترام کے ساتھ "ڈر فیورر" کا ذکر کر رہی ہیں۔ اگر کوئی انہیں یاد دلائے کہ نومبر کے انتخاب میں انہوں نے کمیونسٹوں کی طرف سے ووٹ دیا تھا تو شاید وہ بالکل مکر جائیں گی اور بڑے خلوص کے ساتھ — جس طرح سردی میں جانور اپنی کھال بدل دیتے ہیں بالکل اسی فطری قانون کے مطابق وہ اپنے آپ کو نئے حالات سے ہم آہنگ بنا رہی ہیں۔ فراؤلین شریڈر کی طرح ہزاروں آدمی اپنے آپ کو اس طرح ہم آہنگ بنا رہے ہیں۔ جو حکومت بھی برسرِ اقتدار ہو آخر اُن کی قسمت میں تو اسی شہر میں رہنا لکھا ہے۔

آج سورج بڑی شان سے چمک رہا ہے۔ دھوپ بڑی ملائم سی گرم اور پیاری پیاری سی ہے، بس آخری دفعہ صبح کو ٹہلنے جاتا ہوں۔ میں نے نہ تو اوورکوٹ لیا ہے اور نہ ٹوپی۔ سورج چمک رہا ہے۔ اور ہٹلر شہر کا مالک ہے۔ سورج چمک رہا ہے اور میرے درجنوں دوست — مزدوروں کے اسکول میں میرے شاگرد، بہت سے مرد اور عورتیں جن سے میں مختلف جگہ ملا کرتا تھا — قید خانے میں ہیں، یا شاید مر چکے ہیں۔ لیکن مجھے اُن کا خیال نہیں آ رہا ہے — وہ چیزوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے تھے، اُن کے سامنے ایک مقصد تھا اور دلوں میں ہمت۔ اُنہیں معلوم تھا کہ

وہ کیا خطرے مول لے رہے ہیں، اور انہوں نے جان بوجھ کر یہ خطرے قبول کئے تھے۔ مجھے تو بجائے روڈی کا خیال آرہا ہے جو معمول قسم کی روسی قمیص پہنا کرتا تھا۔ روڈی کا کہانیوں کی کتابوں جیسا جھوٹ موٹ کا کھیل واقعی سنجیدہ چیز بن گیا ہے۔ اب نازی لوگ اُس کے ساتھ یہ کھیل کھیلیں گے، نازی اُس کا مذاق نہیں اُڑائیں گے، وہ جو کچھ بنتا تھا نازی واقعی اُسے وہی سمجھیں گے۔ کیا خبر اس وقت روڈی کو تکلیفیں دے دے کے مارا جا رہا ہو۔

ایک دکان کے شیشے میں مجھے اپنا چہرہ نظر آتا ہے اور یہ دیکھ کر میں لرز اُٹھتا ہوں کہ میں مسکرا رہا ہوں۔ ایسے حسین موسم میں مسکراہٹ روکے سے نہیں رُکتی۔ ٹرامیں حسبِ معمول آجا رہی ہیں۔ یہ ٹرامیں، کھڑنجے پر چلنے والے لوگ، اور نولینڈ ورف۔ پالاس اسٹیشن کا ٹیکوزی کی شکل کا گنبد ——— یہ سب چیزیں بڑی مانوس نظر آرہی ہیں، اور کسی ایسی چیز سے مشابہ معلوم ہوتی ہیں جو یاد دِلاتی ہے کہ ایک زمانے میں بہت خوشگوار تھی اور جس میں کوئی بات بھی خلافِ معمول نہ تھی ——— جیسے کوئی عمدہ سا فوٹوگراف۔

نہیں۔ اب بھی مجھے پوری طرح یقین نہیں آتا کہ ایسے ایسے واقعات ہو چکے ہیں...